دو دھاری تلوار

01-400

فکرِ سلطان

سیریز ہشتم: طنز و مزاح

ڈاکٹر سلطان محمود

کتاب کا سٹیٹس

نمبر شمار	عنوان	کمنٹس
1	کور پیجیز	شامل ہے
2	فہرست مضامین	شامل ہے
3	مضامین کی درجہ بندی	ابھی کرنی ہے
4	مواد کی درستگی	فائنل ریویو باقی ہے
5	گرامر اور زبان	غلطیاں ہائی لائٹ کی گئی ہیں
6	گمشدہ مواد	30 فی صد تک مضامین گمشدہ ہیں
7	غلطیوں کی اصلاح	فائنل ریویو باقی ہے
8	سرخیاں (مستقل سطح اور ترتیب)	بہتر کی جاسکتی ہیں
9	خطوط (فونٹس - مستقل مزاجی اور درست استعمال)	تقریباً ٹھیک ہیں
10	حروف کا سائز (عنوانات، سرخیاں، متن)	بہتر کی جاسکتی ہیں
15	رنگ (متن اور ڈیزائن عناصر)	ضرورت نہیں
16	صفحہ نمبر نگ	شامل ہے
17	حاشیے (مستقل اور ترتیب کے مطابق)	ضرورت نہیں
18	سرخی اور پانوشت (ہیڈر اور فوٹر)	شامل ہیں
19	ساخت اور ترتیب	تقریباً ٹھیک ہے
20	حوالہ جات	فائنل ریویو کی ضرورت ہے

کالمز 1 تا 400

(مصنف: ڈاکٹر سلطان محمود)

COLUMNS 1-400

BY: DR. SULTAN MAHMOOD

ڈاکٹر سلطان محمود، مینیجنگ ڈائریکٹر
ایکوکیئر کنسلٹنسی سروسز (ای سی سی ایس) پرائیویٹ لمیٹیڈ

Managing Director

ECOCARE CONSULTANCY SERVICES (ECCS) PVT. LTD.

www.ecocare.pk

سیریز ہشتم: طنز و مزاح

فکرِ سلطان

(مصنف: ڈاکٹر سلطان محمود)

FIKAR-E-SULTAN

BY: DR. SULTAN MAHMOOD

ڈاکٹر سلطان محمود، مینیجنگ ڈائریکٹر
ایکوکیئر کنسلٹنسی سروسز (ای سی سی ایس) پرائیویٹ لمیٹیڈ

Managing Director

ECOCARE CONSULTANCY SERVICES (ECCS) PVT. LTD.

www.ecocare.pk

سیریز ہشتم: طنز و مزاح

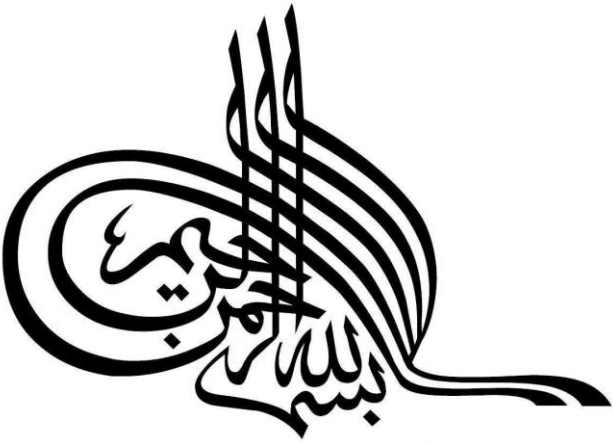

In the name of Allah,
the Most Beneficent,
the Most Merciful

انتساب

Dedicated to the one I love in the Quest of truth.

میری فکر اس کے نام جس سے میں سچ کی تلاش میں آج بھی پیار کرتا ہوں۔

فکرِ سلطان: جملہ حقوق

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

سیریز	فکرِ سلطان (10 سیریز)
مصنف	ڈاکٹر سلطان محمود
ناشر	ایکوکیئر کنسلٹنسی سروسز (ای سی سی ایس) پرائیویٹ لمیٹیڈ
پبلیشر	ماروِل سسٹم
نظرِ ثانی	انعم عروج
اشاعت	2024

فکرِ سلطان : فہرست سیریز

نمبر شمار	عنوان	کل کُتب
1	سیریز اول: ہڈ بیتی	12
2	سیریز دوم: غذا اور صحت	30
3	سیریز سوم: حیوانات برائے انسانی غذا	13
4	سیریز چہارم: ماحول و موسمی تبدیلی	31
5	سیریز پنجم: غذائی تحفظ	06
6	سیریز ششم: دیہی ترقی	01
7	سیریز ہفتم: سماجی رویئے	04
8	سیریز ہشتم: طنز و مزاح	10
9	سیریز نہم: شعر و شاعری	02
10	سیریز دہم: تصویری مسافت	01
--	کل کُتب	110

تعارف: فکرِ سلطان سیریز

ڈاکٹر سلطان محمود نے اپنی نصف صدی کی کاوش کو سائنسی انداز میں تحریکی کارکن بن کر چلایا نیز غذائی تحفظ ایک کی عالمی خود مختار تحریک کو مقامی رہنما کے طور پر پاکستان میں ایک غیر معمولی موڑ دیا ہے جس کے نتیجے میں ان کے افکار اور عملی جدوجہد نے 'فکر سلطان' جیسی ایک طاقتور دستاویزی سیریز جنم دی ہے۔ اس میں وہ اپنی آدھی صدی کی شبانہ روز کی ہمہ جہت کوشش کو شاندار کہانی کے طور پر بیان کرتے ہوئے اہم معلومات سے بھری وہ تاریخ بھی بیان کر رہے ہیں جو ملک عزیز کے غیر مستحکم حالات کے باوجود مقامی اور نچلی سطح کے مسائل کو قومی اور عالمی سطح پر کچھ اس انداز سے اٹھالے جاتے ہیں کہ جہاں وہ حیاتیاتی تنوع یا بائیوڈائیورسٹی کی ہیئت تبدیل کئے بغیر کارپوریٹ تسلط کے ساتھ جنگ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ڈویلپمنٹ مافیا کے خلاف کس طرح نچلی سطح کی لڑائی کو اٹھا کر قومی اور عالمی سطح پر لے جایا جاتا ہے۔ ان کی یہ سوچ بھی قابل داد ہے کہ دنیا بھر میں مقامی سطح کی کمیونٹی ہمیشہ مقدس اور خود مختار ہونی چاہئے تا کہ وہ اپنے علم اور حقوق کو حاصل کر کے مستقبل کی دنیا کی حقیقی کہانی کا نقشہ ترتیب دے سکے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ سفر مندرجہ ذیل دس سیریز پر مشتمل ہے۔

سیریز اول: ہڈ بیتی

ایک شاندار اور سمجھدار دماغ، شفاف کردار، شاعرانہ روح اور نچلی سطح کی تنظیموں میں مہارت حاصل کرنے کی صلاحیت رکھنے والے ڈاکٹر سلطان محمود نے ملکی ترقی کے مسائل اور تحریکوں کے سب سے زیادہ موثر اور محبوب لیڈروں کے جھرمٹ میں اپنا مقام حاصل کیا ہے۔ ان کو ملے غیر معمولی قدرتی تحائف میں ایشیا، یورپ، امریکہ، تین براعظموں کی سات جامعات سے حاصل شدہ اعلیٰ ترین تعلیم و تربیت کی بنیاد پر انسان کی غذائی ضروریات اور قدرتی ماحول کے درمیان گہرے تعلق کا ادراک ہے۔ غذائے انسانی میں استعمال ہونے مویشیوں، ماحولیات اور انسانی صحت کے بارے میں وہ آزادانہ گہری تفہیم بھی شامل ہے جو ملکی رویوں کی زبوں حالی کے باعث ہمیشہ زوال پذیر رہی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مطلق العنان سیاسی اور پدرسری نظام سے کس طرح کی حکمت سے جنگ لڑ کر جیتی جاتی ہے اور کیسے انسانیت اور تخلیق دونوں کو یکجا کیا جا سکتا ہے۔ نیز اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے ایک عام سے متوسط گھرانے سے اُٹھ کر 17 سے زائید ممالک میں اپنی صلاحیتوں کا کیسے لوہا منوایا۔ یہ قاری کو ان کی زندگی کے سفر کو پڑھ کر ہی اندازہ ہو گا کہ محدود مالی وسائل سے کوئی بھی لمحہ فروغ گذاشت نہ کرتے ہوئے کیسے، "تبدیلی کا ڈھانچہ بنایا جا سکتا ہے"۔

سیریز دوم: غذا اور صحت

غذائی علاج جیسی اپنی پچھلی مشہور کتابوں کی طرح، مصنف ماحولیاتی حکمت، پر جوش سرگرمی اور بے عیب پیشہ ورانہ سوچ کے ساتھ پھر سے چمک رہا ہے۔ اس سیریز میں مصنف کی نگارشات اس بات کا ثبوت دیتے دکھائی دیتی ہیں جو انسانی خوراک و غذا پر موسمیاتی تبدیلی کے برے اثرات کو کم کرنے کے لیے مقامی اور بین الاقوامی کارپوریٹ سطح کی کوششوں کے لیے کیے جانے ضروری ہیں۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ مصنف نے کس طرح حیاتیاتی تنوع کے تحفظ اور کسان برادریوں کے حقوق کے لیے اپنی کوششوں کو حوصلے کے ساتھ جاری رکھا۔ مصنف نے 1997 میں غذا و صحت کے میدان میں چھلانگ لگائی اور پھر اسے اس وقت تک اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا جب تک کہ ورلڈ بنک کے راشد القیوم مرحوم کے مشورے کے پیش نظر ڈاکٹریٹ کے بارہ برس بعد پنجاب یونیورسٹی سے ماحولیات کی ڈگری نہیں لے لی۔ اور پھر انسانی غذا کی پیداوار پر ماحول کے اثرات کا تفصیل سے جائزہ لینا نہیں شروع کر دیا۔

سیریز سوم: حیوانات برائے انسانی غذا

غذائی تحفظ کی تخفیفی سائنس تقاضہ کرتی ہے کہ پیچیدہ سائنسی و معاشی معاملات کو ان کی سادہ ترین اشکال میں ڈھال کر انسانی مسائل کو آسان تر بنایا جاسکے۔ تخفیفی سائنس کے تنقیدی اظہاریے جیسا شدید پس منظر رکھنے والا ڈاکٹر سلطان محمود نچلی سطح کی متعدد انجمنوں اور تحریکوں کا ایک سنسنی خیز موجد، شریک موجد اور کٹڑ حمایتی بھی رہا ہے۔ نیز افزائشِ حیوانات، جنگلات، پانی اور کسان تنظیموں کے تحفظ کی ان تمام ضروری تحریکوں کا روحِ رواں بھی ہے جو زندہ زرعی معاشرے کا تانا بانا ہیں۔ اور یقین رکھتا ہے کہ اس تانے بانے سے انسانی دنیا کا اہم ترین مسئلہ یعنی بھوک سے نجات والا کپڑا بنا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کو حصول میں اس کی جس مضمون نے سب سے زیادہ رہنمائی کی وہ ان کے گریجوایشن کے مضامین تھے۔ جنہوں نے انسانی غذا میں شامل چالیس فی صد جزو جو حیوانات سے حاصل ہوتا ہے، اس کا ادراک گہرا کیا۔ گوشت، دودھ اور انڈے کی پیداوار اور پھر متناسب پیداوار انسان کو بھوک کے المیے سے دوچار نہیں ہونے دیتی۔

سیریز چہارم: ماحول و موسمی تبدیلی

ڈاکٹر سلطان محمود کی زندگی کی کہانی ماحولیات، سماجی سیٹ اپ اور گورننگ سنٹی کو بچانے کی جدوجہد کی وہ زندہ مثال ہے جس میں نصابی اور زمینی حقائق دونوں کام آئے۔ وہ اپنے سیارے کے ماحولیاتی نظام کے کام اور ضرر رساں کارٹیل اور اس کے حامیوں کے تباہ کن اثرات کو گہرائی سے سمجھتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنا ان گہرے مسائل کے اسباب کے بارے میں قاری کے ذہن کو کھولے گا جس میں چند لوگ اپنے برے اعمال کی وجہ سے اکثریت کو دھکیل رہے ہیں نیز اس کے مطالعے سے قاری کو حکومت کے طاقتور تکبر سے نکل کر کسان کی طرف پلٹنے کی امید اور حوصلہ ملے گا۔ یہ خوبصورتی سے لکھی گئی یادداشت ایک زبردست داستان ہے جو زمین، زندگی اور ہمارے قیمتی سیارے کی سالمیت کی خواہش رکھنے والے ہر فرد کو پتا ہونی چاہیے۔ مغربی کارپوریٹ سیکٹر کے ESG کی جانب کاروباری جھکاؤ سے مصنف نے جو کچھ امریکہ، یورپ اور خلیجی ممالک سے سمجھا، وہ اس نے اپنے ایکوکیئر بزنس اور سوشل میڈیا آگاہی والے گروپس اور چینل کے ذریعے آنے والی نسل کو پوری طرح سے آگاہ کر دیا ہے۔ اس سیریز کا 30 کُتب کی شکل میں مخطوطہ بڑی تفصیل سے واضع کرتا ہے کہ جونہی ملک کو کارپوریٹ کلچر کے ذریعے ترقی کی جانب غیر متوازن انداز میں دھکیلا جاتا ہے تو وہ کس طرح ہمارے مجموعی سماجی ڈھانچے کو متاثر کرتا ہے۔ اس سے ملک میں ایک غیر متوازن ماحولیات اور سماجی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ جو بالآخر وسائل کی نامنصفانہ تقسیم پر منتج ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے تئیں تمام ماحولیاتی پراجیکٹس میں قابل کاشت زمین، انسانی

روز گار اور گرم ہوتے ہوئے کرہءزمین کے باعث گلیشیر پگھل کر طوفانی انداز اختیار کرنے جیسے مضامین کو کافی گہرائی سے دیکھا ہے۔ نیز اس سیکٹر میں پورا جذب ہونے کے لیے اپنی سرکاری نوکری سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر نیسپاک جیسی قومی و عالمی ایجنسیوں کے ماحولیاتی پروگرام کا جارحانہ حصہ بن کر انسانی غذا کی تخفیفی سائنس سے بھرپور کام لیا ہے اور چار سو سے زائید ماحولیات پر اجیکٹس کو کامیابی سے ہمکنار کر کے ملک کے عوام اور حکومت کے کام کو نہائیت آسان بنادیا ہے۔

سیریز پنجم: غذائی تحفظ

ڈاکٹر سلطان محمود کی ذاتی کاوشوں کا سارا نچوڑ صرف "غذائی تحفظ" کے ارد گرد ہی گھومتا ہے۔ جسے اصولی طور پر اولین سیریز میں جگہ ملنی چاہیے تھی، لیکن تخفیفی سائنس کا خوگر ہونے کے باعث انہوں نے مناسب جانا کہ پہلے ان اوامر کا ذکر کیا جائے جو غذائی تحفظ یا عدم تحفظ کا باعث بنتے ہیں۔ تبھی انہیں نے اپنے فکری سفر کا آغاز اپنے پسندیدہ مضمون (سیریز دوم غذا و صحت) سے شروع کرنا مناسب جانا اور انسانی صحت پر غذا کی ضروریات اور اثرات کا شروع میں جائزہ پیش کر دیا۔ یعنی باالفاظ دیگر اپنی فکر کی بنیاد انسانی جِبلَّت بھوک پر رکھی۔ پھر مناسب انسانی صحت بر قرار رکھنے کے لیے مناسب غذا کی پیداوار، سپلائی چین، قوتِ خرید اور جسمانی ضروریات پر رکھی۔ دھیرے

دھیرے اس تخیل کو راسخ کر لینے کے بعد وہ اپنے بنیادی مضمون یعنی ان حیوانات کی جانب پلٹے جو انسانی خوراک میں دودھ، گوشت اور انڈے کی شکل میں روزانہ کی ضرورت کا چالیس فی صد پر مشتمل ہے۔ اس منطقی تعلق سے ان کی فکری گہرائی کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ اگر بہترین اور مناسب ماحولیاتی انتظامات کر کے پانی کے ذرائع پر بحث مکمل کر لی جائے تو یہ غذائی تحفظ کی ایک ایسی گارنٹی ہے جو افزائشِ حیوانات کے ذریعے انسانی صحت کی ضامن ہے۔ یہاں یہ بھی واضع ہو جاتا ہے کہ شدید سیلاب ہر سال جو حیوانات کی تباہی لاتے ہیں ان پر موثر قابو پا کر انسان کم سے کم چالیس فی صد غذائی ضروریات کو تو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ ان کی یہ منطقی سوچ یورپ اور امریکن جامعات کی فلاحی سائنسیز پر کام کر کے پیدا ہوئی۔ گو کہ ڈاکٹر سلطان محمود کے تیکنیکی کام میں سب سے کم کتب اسی غذائی تحفظ سیریز کا حصہ بنیں لیکن حقیقت بھی یہی ہے کہ عظیم تحقیقات اور کاوشوں کا خلاصہ ہمیشہ مختصر ہوتا ہے۔

سیریز ششم: دیہی ترقی

ویسے تو حیوانات کی افزائش ایک دیہی موضوع ہے جہاں ہمارا 70 فی صد کسان اپنا خون جلا کر صبح شام انسانی غذائیں پیدا کرتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کے غیر متوازن دیہی ترقی کے میدان کی بجائے ہمیشہ شہری ترقی و سہولیات کو اولیت حاصل رہتی ہے۔ جس نے ایک جانب اگر غذائی عدم تحفظ کا

خطرہ مول لے لیا ہے تو دوسری جانب شہر کی طرف نقل مقانی کی عفریت کو بھی جنم دیا ہے۔ ایسے غیر دانشمندانہ حکومتی اقدامات کا نتیجہ ایک ایسی بے ہنگم معاشرتی زندگی کی شکل میں رونما ہوا ہے کہ جس میں حکومت گاؤں چھوڑ کر شہر میں بسنے والوں کے مسائل کو شہری ترقی کی ناکامی کی شکل میں سہہ رہی ہے اور نہ وہ ان کو خدا ہی مل پا رہا ہے اور نہ وصالِ صنم ہو رہا ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کو تو خیر چھوڑیں اگر کل کے غریب چین اور بھارت ہی کی مثال لے لیں تو ان کے ہاں غذائی تحفظ شہر و دیہاتی زندگی میں توازن لانے سے ممکن ہوا ہے۔ اور محض بیس برس میں ان دو ممالک کے دو ارب لوگ دن میں ایک کھانے سے دو کھانوں کے قابل ہو گئے ہیں۔ ان دونوں ممالک نے اپنے آبی ذخائر پر ہزاروں ڈیم بنا دیئے ہیں جن سے وہ نہ صرف غذائی تحفظ یقنی بنا رہے ہیں بلکہ اپنی توانائی کی ضروریات بھی پوری کر رہے ہیں۔ حالانکہ عالمی موسمی تبدیلیاں ان پر بھی ویسے ہی اثر انداز ہو رہی ہیں جیسے باقی کرہء ارض پر رونما ہوتی ہیں۔

سیریز ہفتم: سماجی رویئے

ڈاکٹر سلطان محمود اپنے عالمی ایکسپوژر کے باعث خلیجی ممالک میں رواج پا جانے والے حالیہ شعبہ جات میں ماحولیات سے متصلہ کارپوریٹ سیکٹر کی نئی جہت ای ایس جی سے کافی متاثر ہوئے لہذا انہوں نے ملک عزیز کی اس شعبہ میں لاعلمی کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنی کل نگارشات

میں سے سوشل اور گورننس کے شعبہ جات کو ماحولیات کی کتب کے علاوہ خود مختار کتابی درجہ دے دیا اور اس کے لئے انہوں نے سیاست، مذہب، تعلیم، آبادی، تکنیکی تربیت، شہری و دیہی ترقی وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر جو کچھ تجربات حاصل کئے تھے اسے اکٹھا کر کے اس سیریز کا حصہ بنا دیا ہے۔ سابقہ اعتبار سے وہ اپنی نگارشات کو حاصل مطالعہ بھی کہتے ہیں، اس مطالعے کا حاصل جو انہوں نے مغرب سے حاصل کیا اور سنجیدہ عملی و علمی سفر کو اپنے وطن میں بھی لاگو کر سکتے ہیں۔ گو کہ وہ اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ "کامن سینس" اتنی بھی کامن نہیں ہوتی "لیکن امیدؔ واثق رکھنے ہیں کہ جونہی عوام خصوصاً کسان میں تعلمی کمی دور ہو گی، سماج میں لازمی بہتری آئے گی۔

سیریز ہشتم: طنز و مزاح

اس جہت پر ڈاکٹر صاحب ایک اتھارٹی ہیں اور خود اپنے اوپر تنقید کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ میں نے اگر طنز و مزاح کے گڑھ لائلپور یا فیصل آباد میں چوتھائی صدی نہ گزاری ہوتی تو میرے اندر کا اصلاحی جذبہ طنز اور شگفتگی کی شکل میں باہر نہ آتا۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو اس سیریز میں نہ صرف سب سے زیادہ کتب ہیں جو ایک منفرد انداز میں مقامی و عالمی سیاست، مذاہب، نیز دیگر سماجی موضوعات پر طنزیہ و فکاہیہ انداز میں تخلیق شدہ تاریخ کا شاندار اور متاثر کن عالمی منظر نامہ پیش کرتی ہیں جسے ڈاکٹر صاحب نے اپنی طنزیہ و فکاہیہ ندرت اظہار کے باعث اسے میٹھا سچ سیریز کا

نام دے دیا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ مصنف مقامی طور پر قلیل مدتی طاقتوں کی سماجی خرابیوں کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست کی خود غرضی کا بھی سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ یہ سیریز ایک شان اور روشنی کے ساتھ بیشمار سیاسی، سماجی اور منطقی حل بھی فکاہیہ انداز ہی میں پیش کرتی ہے۔ مصنف نے ملک کے نمایاں مزاح نگار کرنل محمد خان اور ظفر اقبال کی طرز سے متاثر ہو کر مزاح لکھنے کا آغاز گو کہ کالج لائف سے شروع کر دیا تھا مگر اس انداز کو مہمیز تب ملی جب وہ نیویارک میں ممتاز صحافی محسن ظہیر کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ "صدائے پاکستان" سے بحیثیت سب ایڈیٹر منسلک ہوئے۔ نیز انہوں نے لاہور کے چند اخبارات میں اپنے فکاہیہ کالم میٹھا سچ کے نام سے ہی لکھنے شروع کر دیے۔ بقول ڈاکٹر صاحب جگت بازی اور فکاہیہ اندازِ بیان میراثی کو حکومت سے جدا کرتا ہے۔ اور طنزیہ ادب کو سنجیدہ کرتا ہے۔

سیریز نہم: شعر و شاعری

ڈاکٹر سلطان محمود کا بچپن ہی سے شاعرانہ مزاج ہے جسے اظہار کا موقعہ کالج لائف میں کسی ناکام محبت کے جھٹکے سے ملا۔ وہ اپنی جبلت کی افتادِ طبع سے خود ہی نالاں بھی تھے جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہوں نے نہ صرف کبھی کل وقتی شاعر بننا گوارا نہیں کیا بلکہ شاعر کہلوانے سے بھی صاف انکار کرتے ہوئے یہ دلیل اختیار کی کہ میں نے کاغذی شیر بننا کبھی بھی پسند نہیں کیا اور دوسری رکاوٹ

ان کی سائنس میں اعلی تعلیم بن گئی جو پاکستان کے علاوہ یورپ اور امریکہ سے حاصل شدہ تھی جہاں شاعروں کو کارآمد اور قابل استعمال وقت کا دشمن سمجھ کر تنقیدی چھلنیوں سے گزارا جاتا تھا۔ اس کے باوجود تین چار برس میں عروض سمجھے بغیر سینکڑوں غزلیات کہہ دینا شاید ساحر لدھیانوی کی کتاب "تلخیاں" بنی جو عین ناکام عشق کے دوران ان کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ اپنی ہر نگارش کو بچوں کا سا پیار دیتے ہیں اس لئے انہیں بعض دوستوں نے کلام شائع کرنے پر قائل کر لیا جن میں عروض کی استاد محترمہ کنیز بتول کھوکھر کا بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کی لگ بھگ ایک کتاب کے مواد کو عروض پر بھی ڈھال دیا اور جہلم کے ایک استاد شاعر کاشف بٹ نے بھی ناقابل تردید مدد کی۔ ڈاکٹر سلطان محمود جب اپنی فکر کو تحریری شکل دینے لگے تو انہیں معاصرین نے بے حد مشکل سے راضی کیا کہ وہ اپنے چالیس برس پرانے کلام کو بھی اپنی تحریر میں شامل کریں۔ یہ شاید ڈاکٹر صاحب کی غلطی یا صرف نظر ہی سمجھا جائے گا کہ وہ بہترین کلام غیر ممالک میں تو اردو کمیونیٹی کو تو سناتے رہے لیکن ملک عزیز کے اندرونی حلقوں میں قدم تک نہ رکھا۔ البتہ وہ ہمیشہ اپنے برادر بزرگ ڈاکٹر حسن اختر مرحوم، استاد پروفیسر عظمت اللہ خان مرحوم اور دیگر ادبی مقربین کا ذکر بہت شوق اور محبت سے کرتے ہیں۔

سیریز دہم: تصویری مسافت

بھلا ہو ورلڈ بنک کا جس نے ڈاکٹر سلطان محمود کو تصویری بنک بنانے کی عادت ڈال دی۔ حالانکہ انہوں نے محض دس برس کی عمر میں جیب خرچ بچا کر کوڈک کا دس روپے کا کیمرہ 1967 میں ہی خرید لیا تھا اور اپنے بھائی ہمایوں شوکت کے واحد جس تحفے کی وہ قدر کرتے تھے وہ اس کا امریکہ سے لایا ہوا کیمرہ یاشیکا 124 تھا۔ ایسے ہی ان کے استعمال میں وارسا پولینڈ میں روسی کیمرے "زینتھ"، جرمن "ییٹنس" اور جاپانی "نیکن" کیمرے بھی رہے لیکن پھر ڈیجٹل کیمروں اور موبائل کیمروں نے تو انہیں نہال ہی کر دیا۔ ان کے پاس بزرگوں کے علاوہ مشاہیر زمانہ کی بیشمار تصاویر بھی موجود ہیں جو ہر وقت ان کے لیپ ٹاپ اور سیل فونز کی سپیس کھاتی نظر آتی ہیں۔ اس مشکل کے ہاتھوں انہوں نے مجبور ہو کر اور میاں وقار الاسلام کی صلاح لے کر فیصلہ کیا ہے کہ اپنی زندگی کی کہانی کی تصویری دسویں سیریز کیس شکل میں بنائیں گے۔

فہرست

نمبر شمار	مضمون	کالم نمبر	کیٹاگری	سٹیٹس
1.	قبر بارے اعتقادات	301		
2.	ففتھ جنریشن وار (پانچویں جنم کی جنگ) کیا	302		
3.	میری نیسپاک	303		
4.	کبڑے کو ٹھوکر	304		
5.	اگر انسان ناراض تو کیا اللہ راضی؟	305		
6.	قیام پاکستان کی مخالفت	306		
7.	ہمارا سکول سسٹم	307		
8.	افغانستان میں امریکی شکست	308		
9.	کچھ پوچھنے کی جسارت	310		
10.	عورتوں کے حقوق یا مرد کی چال	311		
11.	وقت کم اور مقابلہ سخت	312		
12.	ڈیجیٹل کرنسی	313		
13.	وکیل گردی			
14.	مقدس صحافت کے زرد بلونگڑے	314		
15.	دین اور مذہب میں فرق	315		
16.	شب برات اور دعا	316		
17.	مغرب میں کورونا سے اموات بے قابو	317		نامکمل
18.	روزے یا فاقے			
19.	کیا تحریک نظام مصطفی بھٹو کے خلاف تھی؟	تاریخ		
20.	معصوم آنکھیں	319		

21.	سماجی گراوٹ اور ہماری نوکر شاہی			
22.	!!!جانے کہاں گئے وہ دن			
23.	جس کی لاٹھی اس کی بھینس			
24.	قومی تاریخ کا چہرہ مسخ نہ کریں			
25.	کشمیر پر سلامتی کونسل کا مشاورتی اجلاس			
26.	مرد مومن مرد حق ضیاالحق			
27.	جانوروں کی پرورش			
28.	اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے			
29.	کیا طاہر القادری سیاست سے آؤٹ ہو			
30.	بغض عمرانی			
31.	جماعت اسلامی کے زوال کے اسباب			
32.	جماعت اسلامی کے زوال کے اسباب			
33.	طاہر القادری کے متبادل مولانا			
34.	سموگ پر میڈیا کو بریفنگ			
35.	سموگی لاہور			
36.	نواز شریف کا ملکی سیاست سے دائمی اور طبی			
37.	Divide and تقسیم کرو اور حکومت کرو			
38.	پولیس گردی			
39.	ایک خاندان ایک بچہ			
40.	بارہ وفات سے عید تک کا سفر			
41.	آزادی کے وقت کی جغرافیائی مجبوری			
42.	نام نہاد شہید ماں ے اور نانا			
43.	خواتین کے مساوی حقوق			

44.	انسانی جینوم پروجیکٹ			
45.	ڈاکٹر عشرت حسین کی کتاب پر تبصرہ			
46.	کرپٹ رہنماؤں سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا			
47.	عمران سے پاکستان کو راتوں رات ریاست			
48.	عہد حاضر کے مسلمان			
49.	اسلامی شعائر			
50.	پھر ایک دن کیا ہوا؟			
51.	بھٹو کے یوم وفات پر تبصرے			
52.	عمران کے خلاف طبقہ بد معاشیہ کا خطرناک			
53.	ننگ وطن			
54.	امریکی ایجنٹوں کے ذریعے پاکستان کی ترقی			
55.	اے مسلمان عقل سے کام لے			
56.	رشوت خور اور نالائق مسیحا			
57.	مارکسزم اور سرمائے کی جنگ			
58.	محترمہ فاطمہ جناح کی کتاب، میرا بھائی، سے			
59.	انسان کی لاش پر اناء کا رقص			
60.	جماعت اسلامی کے مسائل			
61.	احمق مسلمان			
62.	فوڈ مافیا اور غذائی اشتہارات			
63.	مشرف کا کردار بحیثیت نیم فوجی نیم جمہوری			
64.	مسلمان ممالک کی لوٹ کھسوٹ			
65.	شخصیت پرستی کی بجائے ترقی پسندی			
66.	پاکستان میں افراتفری کے اسباب			

67.	کورونا کہانی کا حصہ بن گئے جو ایک بک لیٹ	318		
68.	سسرالی شلوار سوٹ	322		
69.	کیا ہم ایک حقیقی جمہوریت بن سکتے ہیں؟	323		
70.	دیسی نظام تعلیم اور درسی کتب سے بغاوت	324		نامکمل
71.	یونہی چراغ لالہ روشن نہیں ہوا۔۔۔	325		
72.	تھوک لگانے کے فائدے	326 انعم		
73.	ہمارا غیر جانبدارانہ مزاج	327		
74.	پاکستان میں نفاذ شریعت اک دھوکا ہے	328		
75.	ہمارا مردہ سکولنگ سسٹم			
76.	فنا و بقا	333		
77.	حکمران کی قابلیت کو کشمیر سے جوڑ کر للکارنا	334		
78.	او کون لوگ او تسی	335		
79.	فرقہ پرستی کی جاہلانہ آگ	XXX		
80.	سیاسی ایجادات			
81.	اعزازی ڈگریاں اور اعزازی سرٹیفکیٹس	نیا کالم بنا		
82.	ماحولیاتی آلودگی			
83.	ور سرمایہ کاری	336		
84.	دھوکے باز قوتوں کا رونا دھونا	337		
85.	سندھ طاس معاہدہ	338		
86.	سندھ طاس: انتہائی اہم معلومات	نیا کالم		
87.	ازدواجی زندگی میں لاتعلقی کا خوف	339		
88.	درختو درختی	341		
89.	ہم بھی کتنے بے وقوف تھے	347		

90.	مالک کون وزیر اعظم یا جنرل؟	نیا		
91.	جعلی اور اصلی دودھ میں فرق	357		
92.	گریجویٹ جامعہ زرعیہ			
93.	مدارس کے اخراجات اور امداد	نیا		
94.	ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات	362		
95.	اللہ رسول سے پھسل کر بپا جانی تک	363		
96.	عورت کی نفسیات	366		
97.	کورونا کے لئے بھاپ لینے کے مشورے	390		
98.	غذائی عدم تحفظ	391		
99.	لاعلمی بھی اک نعمت	392		
100.	بھٹو زندہ ہے	394		
101.	عالم اور کباڑیا	395		
102.	ادبی لائبریری فیصل آباد	396		
103.	آہ ڈاکٹر محمد حنیف چوہدری مرحوم			
104.	طاق نسیاں			
105.	ڈگری کی بندش			
106.	انسانی مزاج کا ایک ذاتی سروے			
107.	علامہ اقبالؒ کا فلسفہ قدرتی ماحول	نیا		
108.	چار بیویاں	نیا		
109.	تھے تو وہ آباء تمہارے ہی مگر؟	نیا		
110.	گوشت کھانے کے طبی مسائل	نیا		نا
111.	قدرتی دولت کا ظالمانہ استعمال	نیا		ن
112.	بھٹو اور جمہوریت	نیا		

113	عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جا	نیا		
114	کیا آپ کو پتا ہے؟	نیا		
115	کچھ دیسی مغالطے			
116	ملک معراج خالد			
117	کیا مندرجہ ذیل نکات درست ہیں؟			
118	فوج نہیں تھی اور پاکستان بن گیا	نیا		
119	مرتد کو دیا گیا جواب	نیا		
120	اسموگ: ایک ماحولیاتی آلودگی	نیا		
121	مقابلہ خیرات	000		
122	برج قوس کا ضدی مشیر	000		نامکمل
123	نینا نامہ	000		
124	منافق اعظم ضیاء الحق			ن
125	چلیں اب اگلی سیلابی تباہی کا انتظار کریں	ویڈیو		ناٹ ریٹن
126	غیر سنجیدہ جامعات			
127	نئی ای کیپ	000		ناٹ رٹن
128	میری زندگی کے کچھ اہم نمبر			
129	دن کا سونا تجھے برباد کریگا			نآٹ
130	دبئی چلو دبئی چلو			ن
131	وی سی سے ڈبلیو سی تک			ن
132	غلام بنانے کے دو طریقے			ن
133	میاں بیوی میں بے رغبتی			
134	نکھٹو کے کمالات	000		
135	بمقابلہ جینیاتی طور پر تبدیل شدہ حیاتیات			

136.	اعشاریہ میں الجھے لوگ	نیا		
137.	سیاست کے کاٹھے وحشی	نیا		
138.	دیس پردیس	نیا		
139.	بے خواب مچھندر	نیا		
140.	عمران کی گرفتاری			
141.	گوشت خور	نیا		
142.	"امریکہ کی لنگوٹی"	594		
143.	کتب بینی؛ناپید؟	نیا		
144.	کارل مارکس اور غلامی کا خاتمہ	نیا		
145.	وقت کے پر	000		
146.	جاسوسی ناول فکشن	نیا		
147.	من تشاء			
148.	سلطانے ڈاکو والا انصاف	000		
149.	جہنم کو بھر دینگے شاعر ہمارے	654		
150.	بیکار عبادت	657		ن
151	ایرانی تیل	661		ن
152.	آج کی عورت	662		
153.	چھ ضیائی علتیں			ناٹ رٹن
154.	ہم تیس فیصد	685		ناٹ رٹن
155.	دودھاری تلوار			
156.	گھنٹہ گھر لائلپور کی سیریں			مسنگ
157.	مسلمانوں کیلئے اکیسویں صدی کیسی رہے			مسنگ

کالم 301۔ مورخہ 19 فروری 20

قبر بارے اعتقادات

کالم از ڈاکٹر سلطان محمود

18 فروری 2020

ہمارے ہاں قبر کا تصور کافی ادھورا سا ہے یعنی ہم سمجھتے ہیں کہ مرتے ہی فرشتے قبر میں لاش کو زندہ کر کے حساب کتاب کریں گے، عذاب یا انعام وغیرہ سب کچھ طبعی طور پر زمین کے نیچے قبر میں قیامت اٹھا دینے تک ہوتا رہے گا۔ ہمارا خیال ذرا مختلف ہے یعنی موت کے بعد خاکی جسم روح سے الگ ہو کر مٹی کے اندر گل سڑ کر مٹی کا حصہ بن جاتا ہے، یا جو ڈوب کے مرا یا جلایا گیا اس کا خاکی جسم بھی یہیں پر گل سڑ کے ختم ہو جائے گا مگر روح پرواز کر کے وہیں چلی جائے گی جہاں سے آئی تھی۔ یہ جو قبریں نظر آتی ہیں صرف علامتی ہیں اور ان کے اندر کوئی بھی ایسی کاروائی نہیں ہوتی جیسا کہ ہمارے ادھورے علم والے علماء قرآن و حدیث کے حوالوں سے اپنی سمجھ کے مطابق ہمیں سناتے چلے جاتے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے ہم کہتے ہیں کہ کعبہ اللہ کا گھر ہے مگر در حقیقت وہ اللہ کا علامتی گھر ہے۔ اللہ وہاں نہیں رہتے وہ تو عرش معلی ' پر ہی رہتے ہیں مگر اپنی لامحدود طاقت کے باعث ہر چیز سے باخبر ہیں۔ خیر قبر میں جسم دبانا در حقیقت ایک طرح سے مردہ انسانی جسم کا احترام اور پردہ پوشی ہے۔ اور اس سے آگے قطعاً کچھ نہیں۔

اگر روح کی ماہیت، تصور یا اہمیت پر بحیثیت مومن غور کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کو دنیا میں ایک جسم کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ وہ لذت، تکلیف و شعور کے جذبے محسوس کر سکے۔ اور اگر اس کا

تعلق کسی اور جہان سے ہے تو وہ مردہ جسم چھوڑ کر وہیں واپس چلی جاتی ہے اور ایک بار پھر شعوری تکلیف و لذت سے آزاد ہو جاتی ہے۔ وہ ایک سوفٹ وئیر کی مانند ہو سکتی ہے جسے ہارڈ وئیر میں ڈالے بغیر بات چیت نہیں ہو سکتی سوائے یہ کہ اللہ کے پاس کوئی الگ سے ایسی طاقت ہو گی جس سے وہ روح سے فرشتوں کے ذریعے رابطہ کرتا ہو گا۔ اور تمام پچھلے وقت کا حساب کتاب کرتا ہو گا۔ رہا قیامت کا تصور تو جس طرح اللہ نے روح کو پہلے جسم عطا کیا تھا اسی طرح بعد میں بھی لذت یا تکلیف کے لئے جسم عطا کر سکتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ کہیں اور ہوتا ہو گا زمین پر بننے والی قبر میں البتہ ہر گز نہیں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔

اگر نبی آخر الزماں صلعم نے قبرستان وغیرہ میں جانے کا کہا تو وہ بھی صرف علامتی طور پر کہا تا کہ انسان نفسیاتی طور پر اپنے انجام سے ڈر کر اللہ کی زمین پر شیطانیوں سے باز رہے۔ یا اگر آپ صلعم نے قبرستان جا کر دعا کی تو وہ بھی علامتی تھی صرف روح کے لئے، گلے سڑے جسم کیلئے نہیں، جس روح کا بہر حال زمینی قبر کے اندر موجود رہنے کا کوئی جواز بھی نہیں ہے۔ جب ہمارا ایمان ہے کی اللہ ہر چیز پر قادر ہے تو اللہ کے لئے یہ بات سرے سے ہی بے معنی ہے کہ وہ زمین کے نیچے سڑے ہوئے جسم سے مخاطب ہوتا پھرے۔ نہ اللہ کو اس کی حاجت ہے اور نہ پرواہ۔ کیونکہ وہ ایسے ہزاروں جسم جب چاہے دوبارہ بنالے۔

اب آتے ہیں ان اعتقادات کی جانب جن کے تعلق قبر، عذاب قبر، بزرگوں کا قبر کے اندر زندہ ہونا، باغ بن جانا، آگ بن جانا، گر پڑنا وغیرہ سے ہے۔ مگر ان اعتقادات پر یقین کرنے یا نہ کرنے سے قبل ایک عام فہم سی دنیاوی بات کا تذکرہ کرتے چلیں۔

کسی بھی کاروبار میں ہمیشہ زیادہ جاننے والا یا زیادہ طاقت والا زیادہ کماتا ہے اور ہمیشہ پیسہ سادہ لوح کی جیب سے چالاک کی جیب کی جانب سفر کرتا ہے۔ دنیا میں کسی بھی مذہب کا کوئی ماننے والا انسان ہو وہ دولت اور طاقت کی خاطر مذہب کو بھی بدل کر رکھ سکتا ہے۔ مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ ظاہراً مذہبی ہو اندر سے چاہے وہ سرے سے ہی خدا کو نہ مانتا ہو۔ پھر وہ چالاک اس سادہ لوح کو اللہ سے اتنا ڈرا دیتا ہے کہ بآسانی اسے ذہنی ٹرانس میں لے کر استحصال کرتا رہتا ہے۔ اسی امر نے مذاہب کی اصل کو اس حد تک تبدیل کر دیا ہے کہ ہمہ گیر دین اسلام سمیت کوئی بھی مذہب تجارت کی دست برد سے بچ کر نہیں رہا۔

اب آتے ہیں کتاب الحکمت قرآن کریم میں لائی گئی انسانی تخریفات اور تبدیلیوں کی طرف۔ اس کے الفاظ بدلنے کی جرأت تو عیار لوگوں نے بھی نہیں کی کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ یہ ایک انتہائی جاندار پیغام ہے جو کسی لافانی طاقت کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ لہٰذا انہوں نے کمال ہوشیاری سے اس کے معانی کو اس حد تک بدل دیا کہ اصل دین مسلمان کے ہاتھ سے چھن گیا۔ یعنی انسانی اعتقادات میں عقل کا استعمال محدود سے محدود تر کر دیا گیا۔ انسان کی عقل تو پہلے دن سے بے حد محدود ہے جو اللہ کے بارے پورا احاطہ کر ہی نہیں سکتی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اتنی عیار ہے کہ ہمہ وقت دوسرے انسان پر قبضہ و غلبہ پانے کے حیلے کرتی رہتی ہے۔ چالاک لوگ چونکہ سادہ لوح لوگوں کا استحصال کرتے چلے آئے اس لئے طاقت الغیب یعنی اللہ تعالی کے تصور کو انہوں نے غنیمت جانا اور اپنے روزگار کا ناطہ جوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور غیب کے تصور کو اصلیت کے علاوہ اتنا پھیلا دیا کہ طبقہ جہلاء کی جیبوں پر بآسانی ڈاکہ ڈال لیا گیا۔ ایسی ایسی کہانیاں پھیلا دی گئیں کہ عام سمجھدار اور منطقی انسان بالآخر مذہب ہی سے دور بھاگنے میں اپنی عافیت سمجھنے لگ گیا۔

یہ سبھی خیالات ہم نے ایک اعتقادی مسلمان کے طور پر بیان کئے ہیں۔ لیکن اگر کوئی منکر خدا ہو تو اللہ کی پناہ اس کو تو سنبھالنا ہی بس میں نہ رہے۔ تبھی عیار مسلم معاشروں نے کفر کا علاج قتل رکھ چھوڑا ہے تاکہ کاروبار میں مندی نہ آنے پائے۔ ایک شخص نے گورے کافر سے پوچھا کہ کیا اللہ کا وجود ہے؟ اس نے انتہائی گہرا جواب دیا کہ بھئی اگر نہیں بھی ہے تو اس کو ایجاد کر لو کیونکہ اللہ کا تصور ایک نفسیاتی سہارا ہے وگرنہ حضرت انسان تو خودکشی پر مجبور ہو جائے۔ بس اسی مجبوری نے روز اول سے اللہ کے تصور کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ اور چالاک وعیار لوگوں نے اسے کاروبار کا حصہ بنا لیا ہوا ہے۔

اب ایک انتہائی سادہ سا سوال۔ اگر اوپر بیان کردہ قبر کے تصور کو درست مان لیا جائے تو ایران سمیت برصغیر کے ساٹھ فیصد قبر پرستوں کا نان نفقہ کیسے قائم رہے گا؟ پورا سوچئے۔

تبصرہ: از ثناء اللہ محمد

Sanaullah Muhammad

Dr sb leave aside the roozi rooti of clever people.its better if you interpret the concept of grave and punishment or reward in it with references from Quran and hadith. Like me many wants to move close reality but unfortunately I did not well studied islam.

DR SULTAN MAHMOOD

My brother we researched detailed aspects of everything but unfortunately away from our own holy book. I'm also in search of good visionary Quranic scholar like late Dr Ahmad Sukkar of California in Pakistan.

ڈاکٹر صاحب ہوشیار لوگوں کی روزی روٹی کو ایک طرف چھوڑ دیں، اگر آپ اس میں قبر اور عذاب یا جزا کے تصور کی تشریح قرآن و حدیث کے حوالہ جات سے کریں تو بہتر ہے۔ میری طرح بہت سے لوگ حقیقت کے قریب جانا چاہتے ہیں لیکن بد قسمتی سے میں نے اسلام کا اچھی طرح سے مطالعہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر سلطان محمود

میرے بھائی ہم نے ہر چیز کے تفصیلی پہلوؤں پر تحقیق کی لیکن بد قسمتی سے اپنی ہی مقدس کتاب سے دور۔ میں بھی پاکستان میں کیلیفورنیا کے ڈاکٹر احمد سکھر جیسے اچھے بصیرت والے قرآنی سکالر کی تلاش میں ہوں۔

کالم302۔ مورخہ 20 فروری20

ففتھ جنریشن وار(پانچویں جنم کی جنگ) کیا ہے؟

کالم از ڈاکٹر سلطان محمود

23 جنوری2020 کو لکھا گیا

جدید ہتھیاروں کے ساتھ لڑی جانیوالی فوجی جنگیں متروک ہوتی جارہی ہیں۔ اب دل و دماغ میں لڑی جانیوالی ففتھ جنریشن وار فیئر میں فوج و عوام کو زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

فرسٹ جنریشن وار(19 ویں صدی تک) میں فوجیں آمنے سامنے کھڑے ہو کر ایک دوسرے پر حملہ کرتی تھیں۔ اس ماڈل میں انسان کی جسمانی طاقت اور عددی برتری کا زیادہ دخل ہوتا تھا۔

سیکنڈ جنریشن وار فیئر (مثلاً جنگ آزادیٔ ہند) میں ٹیکنالوجی در آئی اور طاقتور بندوق، مشین گن، توپ، جنگی کشتی اور جہاز آ گئے۔ اس ماڈل میں بہتر اسلحہ کامیابی کی علامت ہوتا تھا۔ جو اب بھی کہیں کہیں مستعمل ہے۔

تھرڈ جنریشن کی جنگیں (دوسری عالمی جنگ تک) جنگی آئیڈیاز پر منحصر ہو گئیں۔ یعنی اچانک حکمت عملی اور جنگی چالیں عام ہو گئیں۔ تیز رفتار جنگی جہاز کامیابی کی علامت ٹھہرے۔

فورتھ جنریشن کی جنگ کا ماڈل یہ تھا کہ بے پناہ طاقت کا نہایت سرعت سے استعمال کر کے دشمن کو مفلوج یا مغلوب کر لینا۔ کارپٹ بمبنگ اور ڈیزی کٹر بم اسی کا حصہ ہیں۔ اس میں ایٹم بم اور زہریلی گیس وغیرہ اہم ہتھیار ہوتے ہیں۔

اب آتے ہیں ففتھ جنریشن وار فیئر کی طرف جو آج کل مروج ہے۔ اس میں فوج کے ساتھ ساتھ دشمن کی عوام سے بھی پروپیگنڈے کی جنگ لڑی جاتی ہے۔ یہ مکمل طور پر غیر اعلانیہ جنگی ماڈل ہے۔ کم خرچ بالا نشین پر اکسی وارز والا ماڈل۔ اس میں حتمی فتح کی بجائے دشمن کو سازش اور جھوٹے پروپیگنڈے کے تحت مسلسل مصروف رکھا جاتا ہے اور جونہی دشمن کسی نکتے پر کمزوری دکھائے دے وہیں اسے ڈھیر کر دینا۔ اس میں دشمن کو جھوٹے پروپیگنڈے کے ذریعے عالمی تنہائی میں بھی دھکیلا جاتا ہے نیز عوام میں ذہنی خلفشار، احساس عدم تحفظ، احساس کمتری، لسانی و مذہبی عصبیت بنیادی ہتھیار ہوتے ہیں۔ اس ماڈل میں ایٹم بم بھی بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ سوویت یونین کی مثال سامنے ہے جو 22 ہزار ایٹم بم رکھنے کے باوجود محض جعلی پروپیگنڈے اور فورتھ ففتھ جنریشنز ہتھیاروں کے ذریعے توڑ دیا گیا۔

3۔کالم 303 مورخہ 22 فروری 20

میری نیسپاک

کالم از ڈاکٹر سلطان محمود

30 جنوری 2020

آج نیسپاک کے میرے ایک ریٹائرڈ دوست نے تحریر لگائی کہ کہ اس عظیم ادارے میں کئی کئی ماہ سے تنخواہیں موخر ہو رہی ہیں جس نے مجھے وہ چند سطریں لکھنے پہ مجبور کیا جو میں پچھلے 9 برس سے کہنا چاہ رہا تھا۔ ویسے تو آج کل ہر طرف حالات سخت ہیں لیکن بیشمار سیاسی بھرتیوں نے بھی اس ادارے کا کچومر نکال رکھا ہے۔ سیاست بہت منفی ہے۔ اہم عہدوں پر سیاست باز قابض ہیں اور میرا مشاہدہ تھا کہ ہر ڈویژن میں گروپنگ کی وجہ سے ساٹھ فیصد پروفیشنلز سیاست کے علاوہ کچھ نہیں کرتے اور سارا بوجھ جونیئرز پر ڈال کر آسودہ حال بیوروکریٹ بنے بیٹھے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک خیر خواہ محمود احمد سلہری صاحب نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے گرہ لگائی تھی کہ اسی فیصد صرف باتیں کرتے ہیں۔ ان حالات کو زیادہ خراب جی ایم، وائس پریزیڈنٹ اور ایم ڈی بننے کی جنگ نے کر دیا تھا۔ بلکہ گریڈ 11 اور 12 میں بھی آنے کے لئے سیاسی نسخہ استعمال کرنا پڑتا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ میں نے نیسپاک میں ایک مضبوط قسم کی انڈین لابی بھی دیکھی جن کی نظر انڈس واٹر کمیشن پر لگی رہتی تھیں۔

میں جب نیسپاک میں تھا تو میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ تین تجاویز کا تذکرہ کیا تھا اور وہ فوراً بڑے بڑے کانوں تک پہنچ گئیں اور پھر محض اسی سیاست کی وجہ سے بہت مخالفت ہوئی اور بالآخر

مجھے نیسپاک چھوڑنی پڑی تھی۔ اولاً جنرل مینیجر صرف اسے بر قرار رکھیں جو اپنے سیکشن کے بقایا جات کی وصولی ایک خاص سطح تک بر قرار رکھے۔ دوم ریٹائرمنٹ کے بعد صرف اسے دوبارہ ملازمت دیں جس نے دوران سروس کم سے کم دس کروڑ روپیہ ادارے کو کما کر دیا ہو۔ اور سوم سیاست کرنے والوں کی سالانہ رپورٹ میں ان کے اس عمل کا اندراج کریں اور پروموشن میں اس شخص کو نظر انداز کر دیں۔ اب اندازہ کریں مگر مچھ میرے پیچھے نہ پڑتے تو پھر ان کو پیشہ ورانہ کام کرنا پڑتا۔

چونکہ میں نے اس ادارے سے پانچ برس رزق کمایا ہے نیز بہت کچھ سیکھا بھی ہے اس لئے اللہ اس ادارے کو مذکورہ تمام گندگیوں کے باوجود اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

4۔کالم 304 مورخہ 25 فروری 2020

کبڑے کو ٹھوکر

کالم از ڈاکٹر سلطان محمود

25 فروری 2020

علامہ غلام احمد پرویز نے یہ بات سو فیصد درست کی ہے کہ بر صغیر کے تقریباً سبھی علماء قیام پاکستان کے مخالف تھے۔ شاید اسی لئے جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے آج بھی پرویز کو کافر کہا جاتا ہے۔ اور ان کے خلاف خصوصی پروپیگنڈہ کیا ہی اس لئے جاتا ہے کیونکہ یہ ان گنے چنے علماء میں سے تھے جو قائد اعظم کے قریب تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دین اسلام کو تمام مذہبی و سیاسی جماعتوں نے دوکانداری کے لئے زیادہ استعمال کیا اور دین کی ترویج کے لئے کم کم۔ اب جونہی قائد اعظم امریکی و برطانوی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور واقعی پاکستان بن گیا تو پھر امریکہ ہی کی ہدایت پر قائد اعظم کے مذہبی مخالفین جوق در جوق پاکستان داخل ہونا شروع ہو گئے (یدخلون فی دین الباکستان)۔ اب آزادی کے بعد کے واقعات جوڑ کر دیکھیں تو سمجھ آجائے گی کہ امریکہ پاکستان کیوں قائم کرانا چاہتا تھا یعنی صرف اور صرف سوویت یونین توڑنے کے لئے۔ "کبڑے کو ٹھوکر" کے مصداق بر صغیر کے اس وقت کے دس کروڑ اور آج کے 50 کروڑ مسلمان، پاکستان اور بنگلہ دیش ملا کر، فائدے میں رہے۔ قائد اعظم کی نیت میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا کہ مستقبل کی مسلم سٹیٹ امریکہ کے اشاروں پر ناچے گی۔ مگر امریکہ نے قائد کے پیچھے جن طاقتوں کو منظم کر رکھا تھا وہ فوراً قائد کو ہٹا کر سامنے آگئیں۔ اور آج کے دم تک ہیں۔ مزید ایک ثبوت اسی دعوے کے ضمن میں پیش کرتا ہوں کہ

تقسیم کے وقت پاکستان کے حصے میں متحدہ ہندوستان کے 17 فیصد معاشی وسائل آئے لیکن برطانوی ہند کی 33 فیصد عسکری قوت ورثے میں ملی اس تفاوت کی کیا ضرورت تھی؟ اس بات کو فلمی طور پر سمجھنا ہو تو ہالی وڈ کی فلم (غالباً) چیلنجر دیکھیں۔ پھر فلک نے دیکھا کہ سوویت یونین بھی ہم نے توڑا "مردِ حق ضیاء الحق" کی قیادت میں۔ سینٹو سیٹو میں بھی ہم رہے بلکہ اب نیٹو میں بھی چلے گئے ہیں۔ فلسطینیوں کو بھی ہم نے مارا اور اسرائیل کے قیام کی راہ ہموار کرنے میں بھی ہم نے کردار ادا کیا۔ دنیا میں امریکہ جہاں کہیں "امن" قائم کرنا چاہتا ہے تو وہاں بھی ہم آگے آگے۔ اب محنت اور پیسہ امریکہ کا ہو اور ہم چین کی گود میں بیٹھنا چاہیں تو کون کافر بیٹھنے دے گا؟ ہمارا بس ایک کمال ایسا ہے جس کی مثال دنیا بھر میں کہیں نہیں ملتی۔ اور وہ ہے امریکی چھتری میں رہ کر ایٹمی طاقت بن جانا۔ اور اس نیک کام کے لئے میں 'منافق ضیاء الحق' اور 'غدار بھٹو' کے تمام گناہ معاف کرانے کے لئے دعا کرتا رہتا ہوں۔ صرف یہ کام وہ دونوں ایسا کر گئے کہ امریکہ 2015 میں اپنی سو سالہ پلاننگ کے باوجود پاکستان کو ختم نہیں کر سکا۔ اور اس کا 1915 میں بنایا گیا پاکستان پر اجیکٹ جزوی طور پر ناکام رہا۔ اب ہم عالمی طاقتوں کے ہاتھ سے پھسلتے جائیں گے انشاء اللہ اور اپنی طاقت خود ہونگے۔

5۔کالم 305 مورخہ 26 فروری 2020

اگر انسان ناراض تو کیا اللہ راضی؟

کالم از ڈاکٹر سلطان محمود

26 فروری 2020

کورونا وائرس کا ایران سے آنے والے ایک پاکستانی مسافر کے ذریعے پاکستان پہنچنے پر میری ایک فیس بک فرینڈ نے اسے شیعہ ازم سے جوڑنے کا ذرا نامناسب سا اظہار خیال کیا جس پر ایک دوسرے فیس بک فرینڈ شیعہ بھائی بھڑک اٹھے۔ اور دونوں نے میری ہی وال کو استعمال کرتے ہوئے ایک دوسرے کو بے نقط سنائیں۔ میں فرقہ بازی کا شدید ناقد ہوں جس پر میں نے دونوں کو مخاطب کیا اور محترم کاظمی صاحب اور محترمہ ہاشمی صاحبہ کے گوش گزار کیا کہ خاتون و حضرت مجھے ایک بات آج تک سمجھ نہیں آئی بلکہ جتنی بھی میں نے فرقوں میں لتھڑے لوگوں اور قوموں کی تاریخ اور جغرافیہ پڑھا ہے یہ سوال میرے ایمان کا حصہ بنتا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ "ہم انسان کو ناراض کر کے اللہ کو کیسے راضی کر سکتے ہیں؟" فرض کریں ایک انسان سرے سے ہی اللہ کا انکاری ہے، یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکاری ہے یا حضرت امام عالی مقام رح کے تقدس کا انکاری ہے تو کیا پھر بھی اللہ، رسول یا آل رسول نے دو انسانوں کے درمیان نفرت کی حوصلہ افزائی فرمائی؟ اگر جواب ہاں ہے تو پھر افسوس کیساتھ کہوں گا کہ پھر آپ یا مجھے مسلمان کہلانے کا حق ہی نہیں۔ اور اگر جواب نہیں ہے تو ہمارے درمیان شدت پھر کون خبیث لے کر آیا؟ میرے نزدیک یہ فرقہ وارانہ نفرتیں مذہبی دوکانداریاں ہیں اور ہر کاروبار میں لگانے کے لئے سرمائے کی طرح ان فرقوں کو بھی مخالف انسان کا خون چاہیے۔ شیعہ کو سنی کا، وہابی کو بریلوی کا اور اسی الٹ ترتیب سے انہی

سب کو مخالف کا خون چاہیئے تا کہ ایران، سعودیہ اور بریلی کے ماننے والوں کے مشترکہ خون کی کال ٹیل یہودی کے چرنوں میں ڈال کر انسانیت کے ماتم کا ناچ سجایا جاسکے۔ میں ہر فرقہ پرست کا اس قدر ناقد ہوں کہ اکثر تجویز پیش کرتا رہتا ہوں کہ جو جس دوکان کی پوجا کرتا ہے اس کو وہیں پہنچا دیا جائے اور ارض پاک کو انکے نجس جسموں سے پاک کر کے پاکستان میں امن سے رہا جائے۔

میں ان دونوں سے اس تحریر کا جواب نہیں چاہتا بلکہ چاہتا یہ ہوں کہ ہم اپنے اندر کے فرقوں کا امام تو جگا لیتے ہیں کبھی اندر کا انسان بھی جگا پائیں گے کہ نہیں؟

6۔کالم306مورخہ 29فروری2020

قیام پاکستان کی مخالفت

کالم از ڈاکٹر سلطان محمود

28فروری2020

کسی بیرسٹر صاحب نے لندن سے ٹویٹ کی ہے کہ قیام پاکستان کی مخالفت ہندوستان کے سبھی مسلم علماء نے کی تھی۔ میں نے جونہی اسے شئیر کیا تو ایک فیس بک فرینڈ نے بتاتے ہوئے فرمایا کہ نبی اکرم نے سنی سنائی باتوں پر بغیر تحقیق اعتبار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ نبی اکرم کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ تیرے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ تو سنی سنائی باتوں پر بغیر تحقیق اعتبار کرلے۔

ہم نے عرض کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ کا تجربہ ابھی مجھ سے کم ہو اور آپ محض مطالعہ پاکستان کی بنیاد پر مندرجہ بالا حقیقت سے چشم پوشی چاہ رہے ہوں۔ یہ آپ کا حق ہے مگر مجھے جھوٹا قرار دینے سے قبل میری سوچ اور تحقیق کا پس منظر ذرا ملاحظہ کریں تو بہتر رہے گا۔

میری ابتدائی تربیت نانا مرحوم کی صحبت میں ہوئی۔ وہ 1912 میں پیدا ہوئے، جوانی میں مجلس احرار کے کارکن رہے۔ تقسیم کے وقت 35 سال کے مضبوط جوان تھے اور تب تک جماعت اسلامی سے متاثر بھی ہو چکے تھے۔ مگر عملی سیاست سے بالاتر ہی رہے۔ لاہور دلی دروازے میں رہائش کے سبب احراری انداز سے لٹے پٹے مہاجرین کو کیمپوں تک لے جانے، ان کی عصمتوں کی حفاظت نیز انکے کھانے پینے کی نگرانی اپنے دستے کے ساتھ کرتے رہے۔ وہ مشہور مسلم اخبار

'وطن' میں ملازم بھی رہے۔ پھر 42 برس ریڈیو پاکستان لاہور کے پنجابی پروگرام میں نظام دین کے ساتھ سماجی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ میں انکا سب سے بڑا نواسہ ہونے کے ناطے ان سے بہت قریب رہا اور ان سے ہی دین اور پاکستان کی تربیت پائی۔ میں 30 برس کا تھا جب انکی وفات ہوئی۔ میں نے جو کچھ ان سے اور انکے دیگر ساتھیوں سے ان مسلم علماء کے بارے میں سنا اس کی تحقیق کے لئے ماضی میں تو جا نہ سکتا تھا مگر ان کی ساری لائبریری کھنگال ڈالی اور ان کو سچا پایا۔ وہ علامہ مشرقی، حضرت عطااللہ شاہ بخاری اور مولانا مودودی سے انسیت کے سبب ان علماء کے خلاف ہمارے سامنے کچھ نہ بولتے تھے مگر میں نے ان کی بحث پطرس بخاری کے بھائی ذولفقار شاہ بخاری ڈی جی ریڈیو پاکستان، مرزا سلطان بیگ المعروف نظام دین، علامہ غلام احمد پرویز اور مولانا امین احسن اصلاحی کے علاوہ اپنے خاندان کے دیگر بزرگوں کے ساتھ سن رکھی ہے۔

یہ پس منظر بتانے کا مطلب یہ ہے کہ سوائے مولانا شبیر احمد عثمانی کے سبھی علمائے ہند قائد اعظم کے سخت مخالف تھے اور ان کو کافر کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور کبھی اس عظیم شخصیت کو معمولی سا شیعہ ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔ وہ تو جب ان علماء نے پاکستان کو حقیقت میں ڈھلتے دیکھا تو بھاگم بھاگ اپنی مذہبی دوکانیں بڑھانے کے لئے پاکستان کو تسلیم کر کے یہاں آن بسے۔ نانا کے پاس مولانا مودودی کی تحریریں موجود تھیں جن میں قائد اعظم کو خاکم بدہن کافر لکھا میں نے خود پڑھا۔ اب آپ دوبارہ میرے اوپر لگائی گئی حدیث کا اگر دوبارہ سہارا لیں گے تو پھر ثبوت پیش کرنے سے قبل میں آپکو اس حدیث پر پورا اترتا بھی دکھائی دوں گا۔

7۔کالم 307 مورخہ یکم مارچ 2020

ہمارا سکول سسٹم

کالم از ڈاکٹر سلطان محمود

یکم مارچ 2020

ڈاکٹریٹ کے دوران میرے دو بچے پولینڈ کے سکول میں گریڈ ایک سے تین تک پڑھتے رہے۔ صبح خالی ہاتھ سکول جانا اور خالی ہاتھ واپس آنا اور باقی دن کھیل کود۔ وہاں نہ فیس، نہ کتاب، نہ کاپی، نہ ہوم ورک اور نہ ہمیں معلوم کہ ٹیچر کون کون ہے۔ کب امتحان اور کب اگلے گریڈ میں پروموشن۔ ہماری ذمہ داری محض سکول چھوڑنا اور واپس لانا۔ ویگن گاڑی کا دلدر ہی نہیں کیونکہ ہر وارڈ کا اپنا سرکاری سکول تھا۔ پرائیویٹ سکول سسٹم کی اجازت ہی نہ تھی تاکہ تعلیم کو کاروبار نہ بنایا جاسکے۔ مزید برآں ہر سکول وارڈ کونسل کو منتخب والدین اور حکومت کا نوارا کین کا بورڈ چلاتا تھا۔ حکومت عوام کے دیئے گئے ٹیکس سے خرچے اٹھاتی تھی۔ ٹیچر کبھی بچوں کو مارکیٹ لے جاکر سودا سلف خریدنے کی تربیت دے رہی ہوتی اور کبھی بس میں اترنے چڑھنے کا سلیقہ دکھاتی۔ کبھی سڑک پار کرنے کے طریقے، کبھی پارک صاف کرنے کی تربیت، کبھی ہسپتال میں مریضوں کے لئے پھول لے جانے کا طریقہ اور کبھی بزرگوں کے احترام کا انداز۔ سلام کرنے سے لے کر، کھانسی، چھینک، تھوکنے سے ہوا خارج کرنے تک کی تربیت۔ میں ایمانداری سے بتا رہا ہوں کہ ایک متمول پڑھے لکھے خاندان میں 30 برس گزارنے کے باوجود وہاں کی سوسائٹی میں جاکر اپنے آپ کو ہم سب پاکستانی کوئی کمی کمین ہی سمجھتے تھے۔ وہ الگ بات کہ ہم بھارتیوں کو کمی کمین سمجھتے تھے۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایک روز ان کے تعلیمی نظام کو سمجھنے کے لئے مگر دراصل بچوں پر بے پناہ توجہ

پر شکریئے کی خاطر ہم میاں بیوی نے سکول وزٹ کی درخواست کی۔ ہمیں فوراً اجازت مل گئی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ماسٹر ڈگری ہولڈر ٹیچر کچھ ڈری ڈری سی تھی۔ اس کے گمان میں تھا کہ مجھ سے یا سکول انتظامیہ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ غیر ملکی بچوں کے والدین واپس جا رہے ہیں اور محض شکریہ ادا کرنے آئے ہیں تو بیچاری کی جان میں جان آئی۔ ہم چونکہ اپنی عادت کے مطابق فرصت ملنے پر مگر ان کے حساب سے اچانک سکول پہنچے تو ہمیں نہ تو کوئی پروٹوکول ملا، نہ پرنسپل سے ملاقات اور نہ چائے پانی۔ صرف بچوں کے کلاس روم میں بیٹھنے کی اجازت دی گئی وہ بھی اس لئے کہ ہم انکا کلاس روم سیشن دیکھنا چاہ رہے تھے۔ ٹیچر نے ہمارا انتہائی مختصر تعارف کرا کے اپنی ٹیچنگ جاری رکھی۔ ہیڈ ٹیچر نے اپنی مصروفیات رو کے بنا ہمیں دو گھنٹے بعد ملنے کا وقت دیا جس پر ہم اسے نہ مل سکے۔ کلاس روم میں ایک دیوار کے ساتھ الماری میں ڈبے بنے تھے جہاں بچوں کی محض چند ایک کتابیں کاپیاں تھیں اور مارکر وغیرہ۔ ایک کونے میں لکڑی کا ایک زرافہ کھڑا تھا جس کے منہ کو کھولا جا سکتا تھا۔ ہم اسے بچوں کا دل لبھانے کا کوئی تردد سمجھتے رہے جس کا مقصد تب پتہ چلا جب ٹیچر نے ایک بڑا سا برش بیٹے کو تھما کر اس کے دانتوں پر برش کرنے کا کہا۔ اس پیریڈ کے بعد بچوں کا فٹ بال کے کھیل کا وقت تھا وہاں میں نے اجازت لے کر وڈیو بنائی جو آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ جہاں اس قدر روزمرہ معاملات کی تربیت پر زور ہوتا ہو گا وہاں پہلی دوسری کلاس کے بچوں کو دس دس مضامین کیسے پڑھائے جا سکیں گے؟ اگر میں صرف پولینڈ کے تعلیمی نظام کا احاطہ کرنا چاہوں تو کم از کم ایک کتاب لکھنا پڑے گی۔ پاکستان کے نظام تعلیم خصوصاً بھٹو کے تعلیم کو 1974 میں قومیا لینے کے بعد سے اب تک کی تباہ کن صورتحال تو آپ سب بخوبی جانتے ہی ہونگے۔ اس لئے اسکی تفصیل میں جائے بغیر آپ بآسانی یورپ کی ترقی اور اپنی نااہلی کا موازنہ کر سکتے ہیں۔ بقول ایک دوست "جو لوگ ہمارا سکول سسٹم چلا رہے ہیں زیادہ تر وہ لوگ ہیں

جو ذہنی مریض، زندگی میں ناکام، پڑھنے کے معاملے میں انتہائی نکمے، بیوی سے نہیں بنتی یا ماں باپ کے گستاخ ہیں" گو کہ یہ تبصرہ مکمل درست نہیں مگر ہمارے ناکام نظام تعلیم کی غمازی ضرور کرتا ہے۔

8۔کالم308مورخہ یکم مارچ2020

افغانستان میں امریکی شکست

کالم از ڈاکٹر سلطان محمود

یکم مارچ2020

ایک سمجھدار دوست افغانستان میں امریکی شکست پر فرماتے ہیں "اللہ تہاڈا بھلا کرے یہ امریکہ کی شکست ہوئی ہے ہزاروں کی تعداد میں آپ نے اپنے ملک کے بندے مروالیے ہیں اکانومی الگ تباہ ہوگئی افغانستان میں لاکھوں لوگ مر گئے اور وہ کھنڈر بن گیا ہے اور شکست امریکہ کو ہوگئی ہے ماں صدقے جاوے"۔

ہماری عرض ہے کہ اگر ہم جذباتی ہوئے بغیر حقائق کا تجزیہ کریں کوئی 25 برس پیچھے جا کر تو معلوم ہو گا کہ مشرف کے پاس 1999 میں امریکہ کو ناں کہنے کا آپشن ہی نہ تھا بلکہ اس کو امریکہ نے صدر ہی اس لئے بنوایا تھا کہ ناں اور چوں چراں کی گنجائش ہی نہ رہے۔ وگرنہ بصورت دیگر پہلا رگڑا پاکستان کو لگتا۔ پاکستان کیوں کرائے کا ملک بنا اور امریکیوں سے زیادہ اپنے فوجی مروائے؟ دوم مشرف کے بعد ہمارے سیاسی ہیروز زرداری اور نواز بھی آئے۔ کیوں چپ رہے؟ جنرل اشفاق کیانی کیوں چپ رہے؟ در حقیقت سبھی نے امداد کی رقم بانٹی اپنی استطاعت کے مطابق ملکی خزانے کی بھی لوٹ مار کی۔ مگر نیب یا عدالت کیوں آج تک چپ ہے؟ قوم کو زرداری نواز کے یورپی اثاثے تو نظر آتے ہیں آسٹریلیا کے جزیرے دیکھنے کے لئے خوردبین چاہئیے کیا؟ امریکہ نے ضیاء کی طرح مشرف بھی خریدا، نواز و زرداری خریدے، بیوروکریٹس اور قدآور فوجی بھی خرید لئے۔ اس

لئے اگر ہم نے ستر ہزار فوجی مروائے تو باقاعدہ رقم بھی تو وصول کی۔ آپکے خیال میں یہ جنگیں اور بین الاقوامی معاہدے کوئی فلمی سٹوری کی طرح ہونے چاہئیں کہ امریکہ اور پاکستان کو خراش تک نہ آتی اور افغانستان پر امریکہ قبضہ بھی کر لیتا؟ میں نے پہلے بھی کہیں تجزیہ پیش کیا تھا کہ 1979 والی افغان جنگ میں امریکہ کو ایک امریکی فوجی دس ہزار ڈالر میں جبکہ پاکستانی فوجی ایک ہزار ڈالر میں پڑا۔ پھر امریکی ہلاکتیں بھی کم۔ سر دردی بھی پاکستان کی اور جنگوں کے مابعد اثرات بھی پاکستان کے حصے میں بلکہ اس کے علاوہ دہشت گرد پاکستان کا ٹائٹل بونس کے طور پر۔ امریکہ جہاں گیا وہاں کا بیڑہ غرق کر کے نکلا۔ دونوں ہاتھوں سے سلیوٹ ٹرمپ کو کہ جس سے ہم نے منوالیا کہ یار نکلو افغانی کھائی سے اور ہمیں بھی اپنی زندگی جینے دو۔ بھرپور سلیوٹ قمر باجوہ کو کہ جس نے نا صرف امریکہ کو افغانستان میں طالبان سے خوب رگڑے لگوائے بلکہ بھارت کو افغانستان سے مکھن میں سے بال کی طرح نکال باہر پھینکا۔ اور بار بار سلیوٹ پاکستان کے حامی طالبان کو جو ہماری بات مانتے رہے۔ اب آگے کیا ہو وہ بعد میں دیکھیں گے مگر ایک سال میں اگر امریکہ نکل گیا اس خطے سے تو یہی ہماری کامیابی ہے۔ میں ان گزارشات کے بعد پھر سے جنرل حمید گل کے الفاظ دہراؤں گا کہ پاکستان نے افغانستان میں امریکی مدد سے امریکہ ہی کو ہرا دیا۔

کچھ پوچھنے کی جسارت

کالم 310 از ڈاکٹر سلطان محمود

17 مارچ 2020

اس مضمون کو کئی بار پہلے بھی پڑھ چکا ہوں جس میں قائد اعظم کی سوانح حیات لکھنے والے ڈیوڈ پکتھال نے فوجی صدر ایوب خان اور دو بیوروکریٹس غلام اسحاق خان اور فاروق خان کی جی بھر کر تعریف کی ہے لیکن درحقیقت امریکہ کے پاکستان پر احسانات زیادہ تفصیل سے گنوائے ہیں۔ اور سندھ طاس کے معاہدے سے لیکر منگلا و تربیلا ڈیمز کی تعمیر میں مالی و تکنیکی مدد کی تفصیل بیان کی ہے۔ میں چونکہ ایک ماحولیاتی فرم چلاتا ہوں اور نیسپاک اور دیگر اہم کنسلٹنٹ فرمز کے ساتھ کافی سارے ڈیمز اور بیراجز پر کام بھی کر چکا ہوں نیز ملک و قوم کی فکر مندی میں سیاسی آنکھ بھی ہمیشہ کھلی رکھی ہے اس لئے میرا مختصر سا تبصرہ اور چند ایک سوالات حاضر ہیں جن کا جواب صرف ان دانشوروں سے درکار ہے جو سیاسی یا فوجی رہنماوں سے زیادہ ریاست پاکستان کے وفادار ہوں نیز انکا کم از کم 40 سال کا علاقائی و جنوبی ایشیا میں ترقیاتی کام کرنے کا سیاسی و تکنیکی تجربہ بھی ہو۔

پہلے تبصرہ:

مضمون میں بیان کردہ خصوصی امریکی عنایات کی پیچھے خفیہ ایجنڈا اس نوزائیدہ مسلم سٹیٹ سے سوویت یونین تڑوانا تھا جو 1989 تک پے در پے جنرلز کو حکومتیں دے کر تڑوالیا گیا۔ اس مقصد کے لئے فوج کو شروع دن سے ہی مضبوط کیا گیا۔ اس کا ثبوت آزادی کے وقت اثاثوں کی تقسیم سے

بھی ملتا ہے جب حیرت انگیز طور پر پاکستان کو بھارت کیساتھ اثاثے تقسیم کرتے وقت آبادی اور رقبے کی بنیاد پر مال و متاع میں تیسرا مگر فوجی اثاثے آدھے آدھے ملے۔

اب سوالات:

1۔ ملک سیاستدانوں نے حاصل کیا مگر ازاں بعد بیوروکریٹس اور جنرلز کے ذریعے کیوں حکومت کی گئی؟

2۔ بھٹو کا سی آئی اے کیساتھ کیا تعلق تھا اور وہ سیاستدان ہوتے ہوئے بھی مشرقی بازو کٹوانے پہ کیوں راضی ہوا؟

3۔ لندن قیام کے دوران قائداعظم نے جنیوا میں امریکی سفیر کیساتھ جو طویل خط و کتابت کی اس کے مندرجات کیا تھے؟ اور ان پہ پاکستان میں کیوں پابندی ہے؟

4۔ کالا باغ ڈیم کا معاملہ سب سے پہلے کس نے اختلاف میں ڈالا اور ایسے لوگوں کا بھارت سے کیا تعلق تھا؟ نیز ایسے عناصر کو کیوں پھلنے پھولنے دیا گیا؟

5۔ اگر تلہ سازش میں مجیب کو پھانسی کیوں نہ دی جا سکی؟

6۔ حمود الرحمان کمیشن رپورٹ کس نے اور کیوں دبائی ہوئی ہے؟

7۔ جب امریکی چھتری تلے ایوبی آمریت بہترین انداز میں ملک کو ترقی دے رہی تھی تو بھٹو کے ذریعے معاشی و تعلیمی غبارے سے ہوا کس نے نکلوائی؟ اور اس طاقت کے کیا ارادے تھے؟

8۔ کیا ایوب، یحیٰ، ضیاء اور مشرف سیاستدانوں کی نالائقی کی وجہ سے آئے یا ہر ایک کسی نہ کسی امریکی ایجنڈے کو پورا کرنے آیا؟

9۔ بلاشبہ ہماری فوج قابل فخر انتظامی صلاحیتوں سے مالا مال تھی اور ہے مگر ان سے دو انتہائی بدنما غلطیاں کیوں سرزد ہوئیں مثلاً مشرقی پاکستان کا آپریشن اور فوج کا ہتھیار ڈالنا نیز نااہل سیاستدانوں کا ٹیسٹ ٹیوب جنم؟

10۔ فوج اور بیوروکریسی نے تمام طاقت رکھنے کے باوجود مندرجہ ذیل اہم اور ملکی مفاد کے کام کیوں نہ کئے؟ مثلاً جاگیرداری نظام کا خاتمہ، کالا باغ ڈیم کی تعمیر اور حقیقی بلدیاتی نظام کا نفاذ۔

عورتوں کے حقوق یا مرد کی چال

کالم 311 از ڈاکٹر سلطان محمود

16 مارچ 2020

مجتہد العصر مولانا مودودی نے قرانی دلیل کی ساتھ عورت مرد کے حقوق کی جو وضاحت کی ہے اس کے بعد تو اکثر دانشوروں کے قلم سے لے کر عورتوں کے حقوق کے علمبرداروں کے نعروں تک سبھی کی زبانوں کو تالے لگ جانے چاہئیں۔ ہمارے اس تبصرے پر محترم ضمیر خان رقمطراز ہیں کہ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ عورت کو کیسی آزادی چاہئیے۔ پلیز ذرا بتادیں آپ کی مہربانی ہو گی۔ میری بات کو مذاق یا طنز نہ سمجھئیے گا بلکہ میں اس نعرے کو لے کر بہت کنفیوز ہوں کہ ہمیں آزادی چاہئیے۔ رہنمائی فرمادیں اس آزادی کے حوالے سے۔

پھر ایک اور دوست محترم مدثر نذر صاحب لکھتے ہیں کہ "میرا جسم میری مرضی" وہ نعرہ تھا جو امریکی عورتوں نے اس وقت لگایا جب ٹرمپ حکومت نے آکر اسقاط حمل سرکاری خرچے پر کروانے پر پابندی لگادی۔ ٹرمپ نے کہا آپ بچے بھی کاٹ کاٹ کر پھینکیں اور گورنمنٹ اس کے پیسے بھی دے ایسا نہیں ہو سکتا (ابارشن کی اس تکنیک میں بچے کو حاملہ ماں کے رحم سے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر نکالا جاتا ہے)۔ اسقاط حمل کی حامی عورتوں کی ریلیاں نکلیں اور انہوں نے ابارشن کروانے پر پابندی اٹھانے کا مطالبہ کیا۔ جو ابھی تک منظور نہیں ہوا۔ مزید لکھتے ہیں کہ ماروی سرمد جیسی عورتیں یہ اسقاط حمل کی حامی مغربی عورتوں کا نعرہ لگا کر ہماری عورتوں کے ساتھ ظلم کر رہی ہیں۔

اس سے انکی تحریک متنازع ہو کر سبوتاژ ہو جائے گی، لیکن ماروی سرمد کو نیشل انڈومنمنٹ آف ڈیموکریسی (National Endowment for Democracy) سے ڈالرز مل جائیں گے۔

ان سوالات و آراء پر ہم نے عرض کیا کہ 95 فیصد عورتیں بلا سوچے سمجھے عورت کی آزادی کو ہوا بنا کر پیش کر رہی ہیں تا کہ سوشل میڈیا میں ان کا حصہ ڈلتا رہے۔ ہم نے یورپ کی آزاد عورت کا رونا دیکھا ہے جو تمام زندگی اپنی کوکھ سے جنم دیئے نامعلوم پلے پالتے پالتے اور عدالتوں کے ذریعے خرچے لیتے لیتے بوڑھی ہو جاتی ہیں اور پھر انکے پالے گئے بچے بھی حرام کی اولاد کی طرح محض 18 برس کی عمر میں چلتے بنتے ہیں۔ وہاں کی لڑکیاں اپنی آزادی کے نام پر، مگر جنسی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پہلے شادی نہیں کرتیں مگر بعد میں بڑھاپا اولڈ ہاوسز میں گزارتی ہیں۔ مرد عورت کی آزادی کے معاملے میں بے حد چالاک واقع ہوا ہے۔ وہ عورت کو زیادہ سے زیادہ شہہ دیتا ہے اور پھر رنگ برنگ کے جسموں کو اپنی گرفت میں لے کر خوب مستی کرتا ہے۔ مگر چونکہ بچہ بہر حال عورت ہی کی کوکھ نے جنم دینا ہوتا ہے لہٰذا آخر کار عورت ہی خسارے میں رہتی ہے۔ شادی کی عمر میں لڑکی خاوند کی غلامی کا بہانہ بنا کر خود بھی عیاشی میں لتھڑی رہتی ہے مگر روزی روٹی کے چکر اور غیر خاندانی بچے پال پال کر جب نڈھال ہو جاتی ہے تو مرد بلکہ بہت سارے مرد تو ہاتھ سے نکل ہی چکے ہوتے ہیں اور اوپر سے معاشرے کی سختیاں اسے آدھ موا کر دیتی ہیں مگر وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ اگر وہاں کی حکومتیں ایسی ماؤں اور ان کے بے سہارا بچوں کی کفالت نہ کر رہی ہوں تو پھر ہم نے بھی انکے زار و قطار رونے ریکارڈ کر رکھے ہیں۔ ہنگری کی خاتون دوست نے میری بیگم کو بتایا تھا کہ ہم بھی ایشیا کی طرح لڑکی کی پیدائش پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ 18 سال کی عمر سے قبل ہی اپنے باپ بھائیوں کے سامنے گند گھولنے لگ جاتی ہیں۔ بلکہ باپ سے زنا کا شکار تک ہو جاتی ہیں کیونکہ زیادہ تر کے باپ اصلی نہیں ہوتے۔ ہمارے تو ملک بھی ویلفیئر والے نہیں یہاں ناجائز پلوں کا

بوجھ کون اٹھائے گا؟ بہر حال ہم جیسے نیم پڑھے لکھے اور غریب معاشروں میں نئی نسل کی لڑکیوں کی سوشل میڈیا کے بے قابو دور میں بے حد غلط تربیت ہو رہی ہے جس کے ذمہ دار بہر حال ماں باپ ہی ہیں۔

عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔ عورت کے ہر روپ یعنی ماں، بہن، بیوی، بیٹی وغیرہ سے مرد پیار کرتا ہے۔ اگر عورت کو آزادی چاہئیے تو اسے اپنے جیسی عورت ہی سے آزادی حاصل کرنا ہو گی۔

وقت کم اور مقابلہ سخت

کالم 312 از ڈاکٹر سلطان محمود

20 مارچ 2020

محکمہ ماحولیات پنجاب میں بد عنوانی سے پیسہ کمانے کے لئے رسہ کشی آج کل زوروں پر ہے۔ سیاسی گروپنگ اور سنیاسی ٹروپنگ کی بہر حال سمجھ تو آتی ہے مگر یوں کھل کر ہر شاخ پر الو بٹھایا جائے گا اس کی توقع نہ تھی۔ لگتا یوں ہے کہ اس بے ضرر، مظلوم اور عضو معطل محکمے کے کرتاؤں دھرتاؤں کو یا تو زندگی جلد ختم ہو جانے کا ڈر ہے یا قریب آتی ریٹائرمنٹ سے انکے ہاتھ پاوں پھولے پڑے ہیں اور جلد از جیب بھرنے کی کوششوں میں بے چارے اوپر نیچے سے مزید ننگے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بھلا عمران ایسے محکموں کو کرپشن فری کر سکتا ہے جس کے افسران نما کلرک اور کلرک نما افسران نا صرف اپنی "جماندرو" تکنیکی دیوالیہ پن کے کرب کو رشوت کی چاشنی سے میٹھا کرتے چلے آ رہے ہوں بلکہ بار بار رشوت کے الزامات سے گزرنے اور پیڈا لگنے والے افسران اور معطلی کے کئی کئی ہار پہننے والوں کو مال بنانے کا کوئی آفاقی جادو گر سمجھ کر چار شادیوں والا دولہا بنانے پر تلے رہتے ہیں۔

لگتا ہے کپتان کو بھی اتحادی ہی مروائیں گے کیوں کہ یہ تو مانا جا سکتا ہے کہ کہ خود اس نے ذاتی مال لگائے بغیر حکومت حاصل کر لی ہو مگر "میں نئیں منداں" کہ اس کے ایم پیز جن بد عنوان بیساکھیوں کے سہارے پارلیمنٹ میں گھس کر وزارتیں بھی حاصل کر چکے ہیں وہ اپنی بیساکھیوں کو دس دس گنا

مالدار بنانے میں رکاوٹ ڈال سکیں گے۔ وزیروں مشیروں کا فشار خون اس وقت مزید بلندیوں کو چھو جاتا ہے کہ جب سوچتے ہیں کہ پلک جھپکتے دو برس گزر بھی گئے اور داڑھ تک تو گیلی نہیں کر سکے بلکہ بہتوں کی تو شاید "بوہنی" تک نہیں ہوئی لہٰذا چھٹی چھٹی بار من پسند بیوروکریٹس کو آزماتے چلے جارہے ہیں کہ شاید ٹرانسفر پوسٹنگ کے انڈے سے کوئی نر کا بچہ نکل آئے اور ہماری غربت دور کر دے مگر قسم ہے جو اس افسر شاہی میں سے کوئی بھی ٹس سے مس ہوا ہو اور کسی نے ایک تنکہ ہی توڑ کر کسی وزیر کی داڑھ کے "کھوڑ" میں گھسا کے دکھا دیا ہو۔ بذبان فلاسفر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ گلہری پہاڑ کو طعنے دے دے تھک گئی ہے کہ ذرا چھالیہ تو توڑ کے دکھا دے ببوا!! مگر وزیر کی گلہری سیکرٹری اور ڈی جی کے پہاڑوں سے کچھ حاصل نہیں کر پائی اور محض پھدکنے پر ہی تکیہ کئے بیٹھی ہے۔

صاحبان قدر دان ہمیں تو اس سیاسی حکومت پر بڑا ترس آتا ہے کہ جس کے ایک ایک وزیر نے پانچ برس میں کروڑ کروڑ روپیہ ماہانہ بنانا تھا اس سے افسران شاہی اور کلرکان شاکی ہی ابھی تک قابو نہیں آسکے۔ یعنی بندوق لے کر شیر کا شکار کرنے جو گھر سے نکلے تھے ان کی پینٹ گلی کا کتا دیکھ کر گیلی ہوئی جارہی ہے۔ کوئی بے بسی سی بے بسی ہے۔ اب تو حکومت کے بقایا کے تین برس میں انکے ہدف کا اوسط ایک کروڑ ماہانہ سے بڑھ کر دو کروڑ روپے ماہانہ ہونے جارہا ہے۔ وقت کم ہے اور مقابلہ بے حد سخت۔ رہ گئی بات صوبے میں صنعتیں لگنے کی یا ہزاروں نوکریوں کے امکانات کی یا معیشت کا پہیہ چلنے کی، تو اسے تو فی الحال شجر ممنوعہ ہی سمجھیں یا پھر خوابوں کے یہ انڈے سینچنے کے لئے انہیں مرغی کی بجائے 21 روز کے لئے کسی مشین میں رکھوا چھوڑیں جہاں سے انڈے نہ بھی نکلے تو کم از کم ہم سب امید سے تو رہیں گے۔

ڈیجیٹل کرنسی

کالم 313 از ڈاکٹر سلطان محمود

26 مارچ 2020

کسی دوست نے کورونا کے تناظر میں پوچھا ہے کہ ڈیجیٹل کرنسی سسٹم کیسا ہو گا اور تجزیہ نگار کہہ رہے ہیں کہ بینکنگ سسٹم بھی ختم ہو جائیگا تو جن لوگوں کے اکاؤنٹس بھرے ہوے ہیں پیسوں سے یا جیسے چھوٹے طبقے میں بھی لوگوں نے جمع پونجی رکھی ہوئی ہے اسکا کیا ہو گا؟

عرض ہے کہ بنک میں پڑی رقم در حقیقت ہمارا دھوکا ہوتا ہے کیونکہ ہمارے ہاتھ میں بنک کی ایک رسید ہوتی ہے جو ہماری تسلی کا باعث ہوتی ہے کہ ہم جب بھی چاہیں گے یہ رقم ہمیں مل جائیگی۔ کبھی آپ نے سوچا کہ اصل نوٹ کہاں ہیں اور ان کی اہمیت کیا ہے؟ کرنسی کی اہمیت وہی ہوتی ہے جس کی حکومت گارنٹی دے ورنہ کاغذ کا ٹکڑا۔ اب آتے ہیں ڈیجیٹل کرنسی کی طرف۔ کریڈٹ یا اے ٹی ایم کارڈ بھی دراصل چیک بک ہی کی ایک قسم ہے مگر ہے پلاسٹک کی شکل میں۔

جس طرح قدیم انسان گندم کے بدلے ضرورت کی دوسری اشیا لیتا تھا، پھر سونے کے بدلے لینا شروع ہوا، پھر نوٹ (جو کہ حکومتی رسید ہی ہوتی ہے) کے بدلے، اسی طرح اب کارڈ کے بدلے۔ یہ تو زیادہ آسان کام ہے۔ المیہ بس اتنا ہے کہ ڈیجیٹل ہیڈ کوارٹرز اسرائیل میں ہونگے یا کہیں اور بھی ہوئے تو یہودی کے قابو میں ہونگے۔

1۔وکیل گردی

نومبر 2019

مودبانہ عرض ہے کہ تحمل اور تدبر سے حالات کو قابو کریں۔ موصوف ڈاکٹر کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا ہے کہ ڈاکٹروں کے لئے تمام ترقی یافتہ دنیا کے

دروازے کھلے ہیں جہاں ریاستی امتحان کے بعد ان کو شہریت تک مل جاتی ہے جبکہ یہاں کی ایل ایل بی کی پذیرائی دنیا بھر میں کہیں نہیں بلکہ اپنے دیس میں بھی نہیں۔

ہمارے ملک میں ڈاکٹروں کی شدید کمی مگر وکلاء کی شدید اکثریت ہے۔ شاید وکلاء کی ڈگری کے پیچھے کمترین میرٹ اور ڈاکٹروں کی تعلیم کے پس منظر میں انتہائی اونچا میرٹ اور ازاں بعد بے حد سخت پڑھائی ہے۔ اس میں قصور نہ ڈاکٹر کا اور نہ وکیل کا ہے بلکہ سراسر حکومت ذمہ دار ہے کہ ایک طرف سختیاں ہی سختیاں اور دوسری جانب آسانیاں ہی آسانیاں۔

وکالت کی آسان ڈگری کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بیشمار تعداد ہونے کے سبب مانگ کم ہے اور اکثریت پیٹ بھرنے کے لئے دو نمبری کرنے پر مجبور ہیں۔ اور ان کی اسی مجبوری نے انکو پولیس کے نچلے طبقے کو ساتھ ملا کر عوام پر ظلم ڈھانے کی جانب راغب کیا ہے۔ گو کہ یہ فارمولا سبھی نے اختیار نہیں کیا مگر پولیس وکیل کے گٹھ جوڑ نے تو بڑی حد تک اپر مڈل کلاس تک کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔

یہ گٹھ جوڑ آسان ترین اس لئے بھی ہے کہ قانونی موشگافیاں اور ڈنڈے نے مل کر ایک ایسا استحصالی، ناجائز اور حرام کمائی کا نظام تشکیل دیدیا ہے کہ جو بے حد آسانی سے دونوں طبقات کے چولہے جلائے رکھنے کا ضامن بن گیا ہوا ہے۔

اب چلتے ہیں ڈاکٹر مافیا کی جانب۔ ایف ایس سی کے بعد کوئی کروڑ روپیہ اور آٹھ دس برس لگانے کے بعد لامحالہ ان کا دماغ ساتویں آسمان کی سیر کو نکل

جاتا ہے۔ اور یہ اپنی سرمایہ کاری واپس سوگنا منافع میں بدلنے کے لئے سیاستدانوں کی طرح، بے صبری سے فارما کمپنیوں کے ایجنٹ کا کردار ادا کرنے

لگ جاتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے محنت بھی خوب کرنی پڑتی ہے مگر بے صبری ان کو مجبور کرتی ہے کہ نارمل ڈلیوری کو سیزیرین میں بدل دیں، لیبارٹری سے جعلی رزلٹ جاری کر کے انسان مار دیں، غریب کو دھکے دیں یا گردے بیچ دیں مگر اپنے بھائی وکیلوں کی طرح سبھی سفید کوٹ کو کالے کرتوتوں میں نہیں بدلتے جیسے سبھی کالے کوٹوں والے کالے کرتوت نہیں رکھتے۔

اب ہونا کیا چاہئیے؟ ڈاکٹر بڑھانے یا وکیل کم کرنے والا یہ معاملہ ہے ہی نہیں۔ معاملہ کچھ ایسا ہے کہ جس کا نصاب ہی نہیں بنا ہمارے ہاں۔ اور وہ ہے

انسانیت سکھانے والا نصاب۔ وہ والا دونوں کے کورسز ایک طرف ملک عزیز کے کسی بھی نصاب میں نہیں۔ میرے سمیت سبھی 'بالغ نظر' مولوی سے تو نفرت کرتے ہیں اور دین سے دور بھاگتے ہیں۔ مگر انسانیت کا نوحہ بھی پڑھتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر و وکیل تو بیچارے آج کل کڑکی میں آئے ہوئے ہیں مگر انسانیت سے انحراف سبھی کر رہے ہیں کیونکہ مغرب کی چکاچوند، پیسے کی چمک اور کمزور دینی علم نے ہمیں اندر سے خالی کر دیا ہے۔ اب اللہ کا نام ہم ہر دم جپتے ہیں مگر اس کی پرسش کو قیامت تک کے لیے موخر کرتے رہتے ہیں۔ "مکہ نزدیک کہ پیر؟" کے مصداق مکے سے ڈرنے لگ گئے ہیں۔ اور دن بدن اپنے ضمیر کو سلاتے

سلاتے اب اگر دل کے ہسپتال سے جاں بلب مریضوں کے منہ سے آکسیجن ماسک بھی نہ کھینچیں یا جعلی دوائی بیچ کر کسی کی حیاتی بھی مختصر نہ کریں تو کیا کروڑ روپیہ اور دس سال لگا کر سفید پوشی کی سادہ زندگی گزار کر سفید کوٹ پر دھبہ نہ لگواتے پھریں؟ یا پھر کہیں بھی داخلہ نہ ملے تو چند ٹکوں اور شکم مادر میں گزارے گئے وقت سے بھی کم وقت میں کالا کوٹ مل جائے تو بدمعاشی بھی نہ کریں؟ اگر دونوں کے پاس قتل کرنے کا لائسنس موجود ہے تو پھر دیر کس بات کی؟

2۔ مقدس صحافت کے زرد بلونگڑے

کالم 314 از ڈاکٹر سلطان محمود

29 مارچ 2020

آج وزیر اعظم ہاوس کی جانب سے بار بار بلانے پر صحافیوں نے پریس بریفنگ میں آنے سے انکار کر دیا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ عمران کی بونگیاں سننے کون جاتا ہے۔ نیز پاکستان کی 72 سالہ تاریخ میں ایسا نہیں ہوا کہ اینکرز، صحافیوں اور تجزیہ نگاروں نے وزیر اعظم ہاوس کے بلانے پر معذرت کی ہو۔ دوسرا نکتہ نظر یہ ہے کہ اس سے پہلے کسی وزیر اعظم نے ان زرد صحافیوں کو آئینہ بھی تو نہیں دکھایا۔ پہلے دونوں طرف خوشامدی چمچے ہوا کرتے تھے۔ اب صحافی ہو کر کیوں ڈر رہے ہیں یہ بے شرم نان پروفیشنل۔ کل تک یہی روف کلاسرہ، مبشر لقمان، عارف بھٹی، دانش اور بہت سارے ان جیسے عمران کی نظر میں اچھے تھے لیکن شہباز شریف سے لفافے لیتے ہی انکی باڈی لینگویج ہی بدل گئی۔ لیکن بہر حال عمران کے ہاتھوں ان کی چھترول دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ مزید آراء یہ ہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں جو میاں نواز شریف کو غدار کہتے تھے اور الزام لگاتے تھے کہ میاں کا انڈیا میں کاروبار ہے، میاں کی ملوں سے سینکڑوں بھارتی برامد ہوئے، ڈان لیکس اور 5 ارب ڈالر میاں کے بھارت منتقل کرنے جیسے الزامات۔ نیز میاں کلبوشھن کو بھارت دوستی پر پھانسی نہیں دے رہا اور ان جیسے پتا نہیں اور کیا کچھ الزامات۔

ہماری رائے ہے کہ خان لفافے نہیں دیتا اور اوپر سے بے عزت بھی کرتا ہے۔ صحافی چاہے گھٹیا سا ہی ہو وہ حکومتی رشوت کا طلبگار ہی رہتا ہے نیز المیہ

یہ ہے کہ وہ اپنی ذہنیت کو کبھی بھی گھٹیا نہیں سمجھتا اور اللہ کی ودیعت کردہ زبان اور قلم کو اللہ کی امانت کی طرح سنبھال کر رکھنے کی بجائے اپنے خاص پوشیدہ مقاصد کے لئے چلاتا چلا جاتا ہے اور پھر اوپر سے چاہتا ہے کہ اس کی عزت بھی کی جائے۔

ہمارے بے لگام میڈیا کے پچانوے فیصد صحافی بلیک میلر بھی ہیں اور ان کو چھتر چھایا حکومتیں ہی مہیا کرتی چلی آ رہی ہیں یہ تو ہم دور ایوبی سے

دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ بھٹو اور ضیاء نے اس حرام خوری کو مزید مہمیز لگائی مگر نواز، زرداری اور مشرف نے تو حد کر دی۔ ذرا آپ خود سوچیں کہ ایسے طبقے کے منہ سے حرام کا لقمہ یکدم چھن جائے تو یہ لوگ ہلکان جانور کی طرح دوسروں کو بھنبھوڑنے سے گریز کرینگے کیا؟ اور اوپر سے ان کو جاہل وزیر اعظم اور پڑھے لکھے وزیر اعظم کا فرق بھی پتہ چل جائے۔ یہی پتہ لگنے کے بعد بیچارے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں یہ پرچی صحافی۔

میرا طویل مشاہدہ ہے اس زرد صحافت کا جس میں سے ایک مثال جنگ گروپ کی بھی ہے۔ اس نے کیسے اخبار اور پھر چینلز پر انہی ناجائز حکومتوں سے رشوتیں لے کر ایک ایسے مافیا کی شکل اختیار کر لی کہ بالآخر بھارتی راء نے امن کی آشا جیسے شوشے میں اس گروہ کو ہندوستان ٹائمز کے ذریعے فنڈنگ دے دی۔ حامد میر کو گولیاں تک مار کر اس گروپ کو سمجھانے کی کوشش بھی ہوئی مگر یہ اپنے آپ کو بین الاقوامی انڈر ورلڈ کے اتنا قریب لے گئے تھے کہ بالآخر میر شکیل پر ہی ہاتھ ڈالنا پڑا۔

میں نے بارہ برس یورپ اور امریکہ کی صحافت بھی دیکھی ہے بلکہ نیویارک کے اردو روزنامہ صدائے پاکستان کا سب ایڈیٹر بھی رہا جہاں محترم محسن ظہیر بیورو چیف تھے، ہم نے وہاں کبھی اتنی لغویات نہیں دیکھیں جتنی یہاں کی زرد صحافت میں دیکھی ہیں۔ خیر اللہ ریاست اور عمران کا حامی و

ناصر ہو جنہوں نے زرد صحافت سے پنگا لے لیا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ چند صحافی چھوڑ کر یہ مافیا عمران، ریاست اور عوام کو کبھی معاف نہیں کریگا۔ ورنہ بھارتی سرمایہ کاری ان کا خون چوس جائے گی۔ لہٰذا یہ جو کل تک پالتو کتوں والا اسٹیٹس رکھتے تھے، اتنا تو ان صحافیوں کا کرنا بنتا ہے کیونکہ ابھی تک چوروں کا کھلایا ہوا ناجائز مال انکی انتڑیوں میں ہے۔

3۔ دین اور مذہب میں فرق

کالم 315 از ڈاکٹر سلطان محمود

30 مارچ 20

ایک صاحب علم فرماتے ہیں کہ کسی نے کہا دین ہماری جانوں سے زیادہ مقدم ہے، کسی نے کہا اسلام چھوت چھات کو نہیں مانتا بلکہ توکل اور خُدا کی مشیت کو مانتا ہے، کسی نے کہا میدان جنگ میں بھی جماعت جاری رکھنے کا حکم ہے لہٰذا مسلمانوں کی اجتماعی عبادات پر پابندی غلط ہے۔

دوسری جانب سے دلیل آئی کہ مدینہ میں بارش بھی ہو تو حضور نماز گھر میں پڑھنے کا حکم فرماتے ہیں، قرآن جانوں کی حفاظت کی تلقین کرتا ہے، اسلام

مشقت پر تحمل کو ترجیح دیتا ہے اسی لیے سفر میں کسر اور بیماری میں روزہ ترک کرنے تک کا حکم ہے لہٰذا دین زندگی پر تب مقدم ہے جب دین کو زندگیاں چاہیے ہوں، نا کہ قدرتی آفات کے تناظر میں۔

یہ ہے لُبِ لباب اُن سب تعبیرات کا جو کورونا کے معاملے پر اسلامی دنیا بالعموم پاکستان میں پیش کی جارہی ہیں۔ اِن میں سے کون سی تعبیر کتنی

جاندار ہے یہ موضوع بیکار ہے، جو بات غور کرنے کی ہے وہ ہے کہ مذہب جب تعبیرات کا محتاج ہو جائے تو وہ اجتماعی نظم چلانے کی حیثیت کھو بیٹھتا ہے، اِسی لیے ہم سمجھتے ہیں کہ ریاست کے معاملات میں اب مذہب کارآمد نہیں ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ریاست مذہبی ہو کر بہترین اجتماعی نظم کا نمونہ بن سکے۔ مندرجہ بالا تعبیرات و پاکستان میں کورونا پر مذہبی طبقے کا عمومی رویہ دیکھ کر یہ کہنے میں

کوئی عار اور دقت نہیں ہونی چاہیے کہ اگر مذہبی عناصر حکمران ہوتے تو کورونا سب سے زیادہ مسلم ریاستوں کو متاثر کرتا۔

مذہب و ریاست کے ملاپ کے پیچیدہ موضوع پر ایک سال کے مطالعے میں اب تک جس تعبیر کو درست پایا جسکو کورونا نے مزید درست ثابت کیا وہ یہ ہے کہ مذہب اجتماعی نظم کے لیے نہیں بلکہ فرد کا خدا سے تعلق قائم کرنے کے لیے ہوتا ہے، مسلمانوں کے معاشرے میں اجتماعی نظم مذہب کے تابع نہیں بلکہ مذہب کی روح اگر برقرار رکھنی ہے تو یہ اجتماعی نظم کے ذریعے قائم رکھی جائے گی، اُس کا طریقہ کار کوئی بھی ہو سکتا ہے جسے معاشرہ جمہور کے اصول پر طے کرے یا مساوات کے کسی اور اصول پر، اسکا فیصلہ بہر حال مسلمانوں کا اجتماعی نظم ہی کرے گا بصورتِ دیگر حق و باطل اور جائز و ناجائز کے کئی الہامی احکامات پر بھی اتفاق ممکن نہیں۔ انکے ان خیالات پر ہم نے یہ عرض کیا ہے کہ محترم پہلے تو مذہب اور دین کو ہم معنی نہ بنائیں۔ مذاہب ہوتے ہی انفرادی ہیں اور وہ بھی صرف اس حد تک ضروری ہیں تا کہ انسان اپنے ناقابل برداشت مصائب اور معاملات کسی ان دیکھی طاقت پر ڈال کر نفسیاتی طور پر مطمئن ہو جائے ورنہ نفسیاتی طور پر برباد، شکستہ اور منتشر ہو کر کہیں خودکشی نہ کر لے۔

جب مذاہب کو اجتماعی طور پر لاگو کرنا مقصود ہوتا ہے تو اسے دین کا نام دیا جاتا ہے جہاں عبادات مذہب تک محدود رہتی ہیں اور معاملات دین کا حصہ بن جاتے ہیں۔ چونکہ غیبی طاقت ایک ہی ہے اس لئے قرآن کا مخاطب انسان ہے اور اس کے اجتماعی معاملات دین کہلائے گئے ہیں جن کی بجاآوری عبادات کی نسبت بہت مشکل ہے۔ مذاہب کی پیروی نہایت آسان ہے جیسا کہ سبھی مذاہب میں ہے کہ اتنی نمازیں یا اتنے روزے رکھ لیں۔ لہٰذا وقت کے ساتھ ساتھ چالاک انسان

دین اور مذہب کو الگ رکھتا آیا ہے اور کامیابی سے دونوں جوانب اپنی مرضی داخل کرتا رہا ہے۔ تبھی یہودیت، نصرانیت اور موجودہ اسلام مذاہب بن گئے ہیں اور منافقت عروج پر چلی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہی شخص ذخیرہ اندوز، ملاوٹ کرنے اور کم تولنے والا بھی ہے مگر ساتھ ہی نمازی اور حاجی بھی ہے۔ ایک ہی مبلغ مسجد، کلیسا اور مندر میں جنسی زیادتی بھی کرتا ہے مگر کہلاتا پاک باز ہی ہے۔

رہا دین تو یہ شروع دن سے ایک ہی رہا ہے جو کہ اب انسانوں کی موجودہ دنیا میں مکمل حالت میں کہیں بھی میسر نہیں مگر دنیا کی مختلف اقوام میں ٹکڑوں کی شکل میں ضرور موجود ہے۔ مغرب کی مثال لے لیں۔ وہاں معاملات کافی حد تک دین والے ہیں مثلاً سچ بولنا، پورا تولنا وغیرہ مگر ہمارے ہاں عبادات پر زور ہے چاہے ہم دوسرے انسان کے لئے جتنے بھی ضرر رساں کیوں نہ ہوں۔ مندرجہ بالا مذہب اور دین کی تعریف کے بعد اب ہم آتے ہیں کورونا والی صورتحال کی طرف۔ بعد از کورونا دنیا ایک دین کی طرف پلٹے گی اور مذاہب بے حد کمزور ہو جائیں گے۔ بعد از کورونا مذاہب آپس میں مزید ٹکرائیں گے جس سے اور کمزور ہو جائیں گے۔ لہٰذا بالآخر سبھی کا ایک دین پر اتفاق ہو گا لہٰذا دین ہی غالب آکر رہے گا۔ میری دلیل سے شاید اس اعتقاد کو بھی مضبوط سہارا مل جائے کہ جس میں سبھی مذاہب اپنے اپنے مسیحا کے انتظار میں بیٹھے ہیں مگر ایک بات پر سبھی متفق ہیں کہ بالآخر ایک ہی دین کو فتح حاصل ہو گی۔ ذہن میں رہے کہ حضرت آدم سے اس دم تک دین صرف ایک ہی ہے آپ چاہے اسے اللہ کا دیا ہوا نام اسلام دے لیں یا کوئی اور۔ حضرت انسان اپنی دوکانداری چلانے کے لئے مذاہب میں تبدیلیاں تو کرتا چلا آیا ہے جیسا کہ ہر مذہب کے کئی کئی فرقے ہیں مگر دینی معاملات میں اس کے لئے تخریف کرنا ذرا مشکل ہے کیونکہ سبھی کو ایک ہی فارمولے پر متفق ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا دین کے ذریعے انسانی اجارہ داری تبھی ممکن ہے کہ معاملات،

جس کا ایک حقیر سا نمونہ سائنس ہے، اس کے ہاتھ میں ہو مثلاً امریکہ، یورپ اور اسرائیل وغیرہ کو دیکھ لیں۔

قرآن کریم نے شروع سے آخر تک عبادات اور معاملات کو مخلوط کر کے پیش کیا ہے اور دونوں کو لازم وملزوم قرار دیا ہے۔ مثلاً صفائی ستھرائی یا وضو دین ہے مگر اللہ کے آگے جھک جانا مذہب ہے۔ حالانکہ یہ ایک ادھوری مثال ہے کیونکہ نماز کا انحصار تو وضو پر ہے مگر وضو کا نماز پر نہیں۔

آخر میں ان گذارشات کے بعد ہم نے ان سے التماس کی ہے کہ مذہب اور دین دونوں کو ایک ہی پیرائے میں نہ لے کر چلیں۔ ورنہ مذہبی طاقتیں پورے زور سے معاملات سے ٹکرا جائیں گی جس میں سائنس بھی شامل ہو گی۔ اور پھر یہی سائنس تمام مخلوقات کو برباد بھی کر کے رکھ سکتی ہے۔

اے کے چوہدری 30 مارچ 2030

سب سے پہلے تو حضور یہ عرض کرتا چلوں کہ الحمد اللہ دین اور مذہب کی بحث سے بخوبی واقف ہوں اس پر کافی تحقیق بھی کر چکا ہوں۔ دین اور مذہب کوئی دو الگ تصورات نہیں ہیں یہ محض زبان کا مسئلہ ہے یعنی کہ linguistic مسئلہ ہے۔

عیسائی پادری اور کلیسا کے مظالم اور اجارہ داری پر جب مغرب میں حملہ ہوا اور یہ کہا گیا کہ مذہب انفرادی عمل ہے تو کلیسا اور پادری نے اسے اجتماعی

عمل یعنی دین کہا اور اسے بنیاد بنا کر وہاں بے انتہا مظالم ڈھائے گئے۔ لہٰذا دراصل مذہب اور دین کا لغوی و فکری جھگڑا تاریخ میں پہلی دفعہ وہاں سے

سامنے آیا اور اسکی بنیاد سیاست و حکومت کے منصب کا جھگڑا تھا۔

سیریز ہشتم: طنز و مزاح

اب آیئے اسکے عربی مادہ اور دیسی استعمال پر۔ عربی میں دین کا مطلب ہے طابع ہونا، فرمانبرداری، اطاعت جبکہ مذہب کا مطلب ہے طریقہ راستہ۔ اس لحاظ سے دین کی جو تعریف و تشریح آپ نے کی ہے وہ مذہب کی لغت میں آتا ہے دین میں نہیں۔

ہمارے ہاں دین اور مذہب کو پہلی دفعہ مولانا مودودی نے اس تفریق کے ساتھ موضوع بنایا جو آپ نے اوپر بیان کیا، لہٰذا دین کا جو تصور آپ نے اوپر پیش کیا یہ دین کا اپنا تصور نہیں بلکہ مولانا مودودی کا اپنا تصور ہے، قرآن و حدیث میں دین کی اسطرح کی کہیں کوئی تعریف و تقسیم موجود نہیں، دین کے اس تصور کا پس منظر بالکل وہی ہے جو مغرب کا تھا یعنی یہاں بھی مذہبی عناصر نے اپنی چوہدراہٹ برقرار رکھنے کے لیے اسکو اس طرح تعبیر کیا۔

قرآن میں لفظ دین تقریباً 15 دفعہ استعمال ہوا ہے اور ہر دفعہ مختلف معانی میں آیا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ تمہارے لیے ہم نے دین اسلام کو چُنا، تو

اسکا کیا مطلب ہے؟ اسکا مطلب ہے کہ دین اور بھی ہیں مگر ہم نے تمہارے لیے جسکو چُنا وہ اسلام ہے، یعنی مذاہب کو ہی دراصل دین کہا جارہا ہے. اسی طرح کہا تمہارے لیے تمہارا دین ہمارے لیے ہمارا دین، تو ایک عام اور بالکل سادہ سا سوال ہے کہ اگر آپ اسلام کو دین کہتے ہیں تو پھر اُنکے لیے اُنکا دین کس کو کہا گیا ہے؟ اسی طرح آخرت کو یوم الدین کہا گیا یعنی حساب کا دن، تو اِس لحاظ سے تو دین نہ طریقہ ہوا نہ اطاعت؟ اِس لیے اصول و مبادیات کا یہ تقاضا ہے کہ قرآنی اصطلاحات کو اُس وقت کے عربی زبان و تہذیب کے تناظر میں سمجھا جائے، جسکا کہ مولانا مودودی نے خیال نہیں رکھا، مولانا صاحب نے دین کی جو تعبیر کی جو آپ نے بھی اپنے تبصرہ میں بیان کی یہ کس طرح غلط

ہے اور اسکے نقصانات کیا ہیں اسکے لیے مولانا وحید الدین جان، مولانا ابو الحسن ندوی اور جاوید احمد غامدی صاحب کو پڑھیں، اِن شخصیات نے تفصیل سے لکھا ہے اس پر۔

دین کی انہی منکسر و متضاد تعبیرات کو سامنے رکھ کر یہ تحریر لکھی گئی ہے اور اسی لیے آخری پیرا میں یہ بھی لکھا ہے کہ دین کا منہج ریاست کو اسلامی

بنانا نہیں بلکہ فرد کو اسلامی بنانا ہے۔ دین کی درست تعبیر نہ ہونا ہی اُن عملی تضادات کا باعث ہے جنکا آپ نے ذکر کیا، جب ایک شخص ماپ تول میں کمی کر کہ بھی نعرہ اسلامی نظام اور ریاست کا لگائے تو اسکا کیا مطلب ہے؟ اسکا مطلب ہے کہ اُسے یہ سکھایا گیا ہے کہ اللہ نہیں دیکھ رہا، تم نے ماپ تول میں

کمی کا حساب یوم حساب (یوم الدین) پر نہیں دینا لہٰذا اسکی فکر نہ کرو بلکہ تم سے جس چیز کا پوچھا جائے گا وہ ہے کہ تم نے ریاست کو اسلامی کپڑے پہنانے میں اپنا کردار ادا کیا کہ نہیں، جب وہ دین کو اس تناظر میں دیکھتا ہے تو وہ اپنی ذات میں حساب کتاب (دین) یعنی اطاعت سے عاری ہو جاتا ہے اور یوں دین عملی میدان سے خارج ہو جاتا ہے۔

یاد رہے کہ یوم الدین پر مارکنگ relative نہیں بلکہ absolute ہونی ہے، اس لیے دین کی درست تعبیر کی جائے تا کہ فرد کا خالق سے ربط قائم ہو سکے۔ دین کی جو تعبیر آپ نے یا مولانا مودودی نے فرمائی اسکا مرکزی نچوڑ یہ ہے کہ جب تک ریاست اسلامی کپڑے نہ پہن لے تب تک ماپ تول میں ایمانداری تمہارا مسئلہ ہی نہیں۔ دین کی یہ تعبیر خود مسلم ریاست میں رہنے والوں کے لیے تو خطرناک ہے یہ مگر اس سے بھی زیادہ اُن مسلمانوں کے لیے خطرناک ہے جو مسلم ریاست میں نہیں رہتے۔

آخر میں دوبارہ عرض ہے کہ دین اور مذہب کوئی الگ نہیں ہیں دونوں ایک ہی ہیں فرق صرف لنگویسٹک کا ہے جو اوپر تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا دین کہیں یا مذہب اسکا اجتماعی نظم میں، میں اُسی فلسفہ، تعبیر و تشریح کا قائل ہوں جو تحریر میں بیان کیا۔

دین اور مذہب میں فرق کی کسی تعبیر کا میں قائل نہیں نہ ہی قرآن و حدیث میں کہیں یہ فرق درج ہے۔

از ڈاکٹر سلطان محمود

اے کے چوہدری

آپکے تحمل سے جواب دینے کا شکریہ جس سے یہ بھی عیاں ہے کہ آپ ایک محقق ہیں وگرنہ میرے اسی طرح کے جواب پر کچھ احباب ناراض ہو کر ذاتیات پر بھی اتر آئے تھے اسی فورم پر۔

محترم یہاں تفصیلاً لکھنے میں خاصہ وقت لگتا ہے اس لئے کسی وقت بالمشافہ ملاقات ہو جائے گی تو شاید میرا فائدہ زیادہ ہو جائے گا۔ آپ نے درست پہچانا

کہ میری تحریر ہر مولانا مودودی کی چھاپ تھی۔ مگر میں جتنا انکی محفلوں میں بیٹھا اتنا ہی شاید غامدی صاحب، اسرار صاحب، واصف صاحب کے علاوہ چند ایک بار غلام احمد پرویز، علامہ احسان الٰہی ظہیر اور کیلیفورنیا کے دو سکالرز جناب جاوید صاحب اور ڈاکٹر احمد سکر کی محفلوں سے بھی علم حاصل کر چکا ہوں مگر دینی علم کی پیاس وہیں رہی۔ چونکہ لٹریچر زیادہ مودودی صاحب اور پرویز صاحب کا پڑھا ہے اس لئے میری دین اور مذہب کی تعریف ان کے مطابق ہے۔

4۔شب برات اور دعا

کالم316 از ڈاکٹر سلطان محمود

09اپریل2020

ہم نے کل لکھا کہ شب برات پر شور شرابہ کرنے کی بجائے دعا کرنے کا حکم ہے۔ نیز دعا کے بارے میں حدیث ہے کہ اسکی قبول نہ ہو گی جس کے پیٹ میں لقمہ اور تن پر کپڑا حرام کا ہو گا۔ اس پر ہمارے ایک پڑھے لکھے دوست راجہ عرفان، داسو گلگت بلتستان سے لکھتے ہیں کہ محترم اس طرح تو پورے پاکستان کے لوگوں کے پیٹ میں حرام ہے کیونکہ سودی قرضوں پر ملک چل رہا ہے جو کہ اللہ سے براہ راست جنگ ہے۔ چونکہ ہمارے دوست ڈاکٹریٹ کی سطح کے ماہر عمرانیات ہیں اس لئے ہم نے ان کو عرض کی کہ اللہ آپ کا بھلا کرے کیونکہ آپ نے وہ جڑ پکڑلی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

دعا کے بارے میں ہمارے معاشرے میں ایک سطحی سا نظریہ پایا جاتا ہے کہ ہر دعا اللہ تعالی قبول فرماتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں کچھ احادیث کے حوالے بھی دیئے جاتے ہیں۔ مگر جب ہم اندر سے محسوس کرتے ہیں کہ ایسا ہر گز نہیں تو پھر ہم اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہماری دعاؤں میں سے بعض کو اللہ تعالی اپنے پاس مناسب موقع آنے تک روکے رکھتے ہیں اور اس پر بھی مساجد و منبر سے بہت زور شور کے ساتھ تقاریر کی جاتی ہیں۔

ہمارے ذہن میں اکثر یہ سوال ابھرتا ہے اور اسکو ہم جب بھی اہل علم کے سامنے اٹھاتے ہیں کہ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں پورا سال لگ بھگ ایک ارب سے زائد مسلمان گڑگڑا کر اپنے گناہوں

کی معافی طلب کرتے ہیں اور پھر اپنی ذاتی حاجات کے ساتھ ساتھ اجتماعی دعائیں بھی کرتے ہیں اور یہ سلسلہ سینکڑوں سالوں پر محیط ہے۔ نیز ذاتی سطح پر ایک یتیم، بیوہ یا مظلوم کے دل سے آہ وفغاں کے بعد بے شمار دعائیں بھی نکلتی ہیں جن کے بارے میں اللہ رسول کے وعدے ہیں کہ قبول ہوتی ہیں، تو پھر ہمیں یہ دعائیں لگتی کیوں نہیں؟ اس سوال پر سطحی ایمان والے فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ حضور یہ دعائیں وقت آنے پر قبول ہوتی رہتی ہیں۔ جب پوچھا جائے کہ وہ وقت کونسا ہے جس کے آنے پر قبول ہوتی ہیں تو وہ بے بسی سے کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ ہی کو پتہ ہے۔ پھر جب دلیل دی جائے کہ اگر ہماری خواہشات کسی خاص وقت پر ہی قبول ہونی ہیں تو پھر دعا نہ بھی کریں تو اس وقت ہماری خواہشیں پوری ہو ہی جائینگی تو اس کا جواب نہ ہونے ہر وہ سطحی ایمان والے لوگ ہمیں دعا کا انکاری یا پھر غلط العام میں لبرل کہہ کر اپنا رانجھا راضی کر لیتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے سوال کا دل پر ذرا اثر نہیں لیتے تاکہ کہیں اسلام کی قرانی و دینی تحقیق کی گہرائی میں دماغ کا استعمال نہ کرنا پڑ جائے۔

قارئین کرام جب سے کورونا کے سلسلے میں کعبہ، مسجد نبوی، دیگر مساجد اور دربار وغیرہ بند ہوئے ہیں تو ہمارے ذہن میں دوبارہ سے یہی سوال اٹھا ہے اور ایک خاص جواب کے ساتھ کہ اللہ ہماری دعائیں سن ضرور رہا ہے مگر قبول ہر گز نہیں کر رہا کچھ خاص وجوہات کی بنیاد پر۔ اور آج سے نہیں سینکڑوں سالوں سے قبول و منظور نہیں کر رہا۔ ذرا وجوہات ملاحظہ کریں:

1۔ اللہ نے سود کھانے سے منع کیا بلکہ اسے براہ راست اپنے ساتھ جنگ سے تعبیر کیا۔ مگر آج پوری انسانیت سود سے جڑی ہوئی ہے۔ اور اللہ کے اس صریح حکم میں تمام اسلامی ممالک بھی جکڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک اہم نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم اپنے آپ کو ہمیشہ اچھا مسلمان

سمجھتے ہوئے علماء تک سے یہ کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ اگر حکومت سود لیتی دیتی ہے تو ہم بے بس ہیں۔ چونکہ ہم ایسا کرنا گناہ سمجھتے ہیں اس لئے بنک میں "غیر سودی یا اسلامی" کھاتے کھولتے ہیں۔ ہم ان کی دلیل پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے اور اکثر سوال کرتے ہیں کہ اگر ایک انتہائی مصداق تھیلی میں ائیر ٹائٹ کر کے کچھ کھانا بند کر دیں اور اس تھیلی کو گٹر میں ڈال دیں۔ اور کہیں کہ آپ کا کھانا پلیز نہیں ہوا تو کیا آپ اسے کھالیں گے ؟ اس سوال پر احباب سوچ میں تو پڑ جاتے ہیں مگر پھر سطحی علوم والے مفتیوں کے فتووں کے سہارے زندگی بسر کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق ایسے حالات میں ہم ایمان کے کمزور ترین درجے پر گر جاتے ہیں مگر پھر بھی ہمارا نکتہ نظر یہ ہے کہ کسی بھی مسلمان کی کمائی بہر حال حلال نہیں اور یہی رزق اس اولین حدیث کے مطابق ہمارا تن کا کپڑا اور پیٹ کا لقمہ حرام کر دیتا ہے جس کی وجہ سے ہماری دعائیں قبولیت کے درجے تک نہیں پہنچتیں۔

2۔ قرآن پاک ہیں اللہ نے صرف تین طرح کے لوگوں پر لعنت بھیجی ہے جن میں سے ایک جھوٹے پر ہے۔ بقول ایک انتہائی پاکباز عالم کے ہمارا وہ رزق بھی حرام ہو جاتا ہے جسے ہم جھوٹ بول کر کماتے ہیں۔ اب ہم اپنے اپنے گریباں میں منہ ڈالیں تو جان جائیں گے کہ ہمارا رزق کتنا حلال اور مصفا ہے۔ ہم کسی پیشے کی تحقیر نہیں چاہتے مگر خود سے سوال کریں کہ ہماری تجارت، ملازمت، وکالت، سیاست وغیرہ کیا بغیر جھوٹ کے چل سکتی ہے ؟ اب ہماری دعا کیسے قبول ہو ؟

3۔ الراشي والمرتشي كلاهما في النار۔ یہ حضور کا وہ فرمان ہے جو عبادات میں نہیں آتا۔ عام مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو ہمیشہ مذہب سے جوڑے رکھتا ہے مگر ہمارا خیال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیت معاملات انسانی کو دی اور عبادات کو محض قلبی طہارت کا ذریعہ قرار دیا۔

ہمارے رزق کے حرام ہونے میں اب کونسی ایسی دلیل باقی رہ گئی ہے کہ جس کے بل پر قیاس کیا جائے کہ پھر بھی ہماری دعائیں قبول ہوتی رہیں گی۔

ہم اپنی گزارشات کو مختصر رکھتے ہوئی کہنا چاہتے ہیں کہ ہم حج و عمرہ کرلیں، پوری نمازیں اور روزے رکھ لیں، ایمانداری سے زکوۃ دے لیں یا سال کے

مقدس ایام میں سجدے میں گر کر گریہ ذاتی کرلیں، جب تک سود، جھوٹ اور رشوت کو چھوڑ کر اللہ کے حضور نہیں پلٹتے، اپنی دعاوں پر بھروسہ مت رکھیں۔ ہو سکتا ہے کچھ کوتاہ عقل ہم پر الزام دھر دیں کہ ہم دعا کی اہمیت کے انکاری ہیں مگر ہم کہیں گے کہ جیسے نماز کے لئے درست وضو ضروری ہے اسی طرح دعا کی قبولیت کے لئے درست قلبی

سر یہ کالم پہلے سے موجود ہے مکسڈ کالمز میں میں اسے الگ بک لیٹ کا حصہ بنا دیا تھا۔ کورونا کہانی " کے نام سے۔ ادھر اس کالم کا نمبر 318 ہے۔۔

320 بھی کرونا کہانی میں گیا۔

نوٹ میں نے نمبر تبدیل نہ کی تھا یہ ایسے ہی ملا تھا۔ انعم

2024/09/26

مغرب میں کورونا سے اموات بے قابو کیوں؟

کالم 317 از ڈاکٹر سلطان محمود

19 اپریل 2020

ممتاز دانشور قیوم نظامی صاحب کے سوال کہ امریکہ و برطا
رہی ہیں کے جواب میں ہم نے عرض کیا ہے کہ ہمارے خبـ

اول۔ مغرب نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کو بہترین انداز میں
معاملے میں بھی بہترین sease reporting system

اور حکومت کو ملتی ہیں۔ لہٰذا جتنے مرتے ہیں درست تعداد حکومت کو بتائی جاتی ہے، اب یہ آگے حکومت کی مرضی ہے کہ کیسے حقائق کو توڑ مروڑ کے پیش کرے۔ ہمارے ہاں پورے ملک کے کسی بھی شعبے میں انفارمیشن کا نظام ادھورا اور مشکوک ہے۔ لہٰذا اس بات پر جھومنا بے معنی ہے کہ ہمارے ہے اں کورونا سے اموات کم ہیں۔ ہمارے پاس تو جانچ پڑتال کا موثر اور مربوط سسٹم ہی موجود نہیں۔

دوم۔ زیادہ صفائی ستھرائی کے باعث امیر مغربی اقوام کی عوام میں herd immunity یا اجتماعی قوت مدافعت ہم جیسی گندی قوموں کی نسبت بہت کم ہے۔ اور اگر موجودہ وبائی مرض کورونا سے وہاں ہلاکتیں زیادہ ہو رہی ہیں تو اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔

سوم۔ اگر کورونا کے پیچھے کل کو کوئی سازش نکل آئی نائین الیون کی طرح تو یقیناً امریکہ برطانیہ اور اسرائیل اس کے موجد ہونگے۔ لہٰذا اس کے حصے دار ہونے کے سبب انہوں نے جو اگلے قدم اٹھانے ہیں، زیادہ اموات کا پروپیگنڈہ کرنا اسی پلان کا حصہ ہو گا۔ جس طرح ساری دنیا جانتی ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر گرانا امریکہ کی اپنی حکمت عملی تھی جس کی آڑ میں اس نے ایک طرف فالتو تارکین وطن کا بوجھ ہٹایا دوسری جانب اسرائیل کے لئے کسی بھی لحاظ سے خطرہ بننے والے ممالک کو برباد کر کے نہایت کمزور کر دیا۔ تیسری جانب عربوں کا تمام تیل اور نقدی لوٹ لی اور چوتھی جانب القاعدہ کا شور مچا کے افغانستان میں چین و دیگر ہمسایہ ممالک پر اپنا واچ اینڈ وارڈ سسٹم مضبوط کیا اور ساتھ ساتھ لیتھیم جیسی قیمتی دھات کے ذخائر چوری کئے۔ لیکن امریکہ سرکاری سطح پر آج بھی نائن الیون کو مختلف انداز میں پیش کرتا ہے مگر دھونس دھاندلی کی امریکن پالیسی کے تحت ساری دنیا اس کا

سرکاری موقف ماننے پر مجبور ہے۔ بالکل اسی طرح کل کی دنیا اس کا کورونا کا موقف بھی ماننے پر مجبور رہے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ چین کیا گل کھلاتا ہے یہ سب کچھ ابھی پردے کے پیچھے ہے۔

5۔روزے یا فاقے

از ڈاکٹر سلطان محمود

5 مئی 2019

ہم سب پورے روزے رکھنے، تہجد سمیت نمازیں پوری کرنے، نیز اللہ کے ساتھ معاملات میں کمی کوتاہی کی معافی کے لئے رمضان کے استقبال کے لئے تیار بیٹھے ہیں لیکن اگر ہم میں ہی وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ملاوٹ کرتے ہیں، رشوت دیتے لیتے ہیں، زنا کرتے ہیں، شراب پیتے ہیں، حرام مال کماتے ہیں (یعنی جھوٹ بول کر کمائی کرتے ہیں)، چوری کرتے ہیں (کسی کی اجازت کے بغیر پنسل بھی اٹھالینا چوری ہی ہے)، چغلی کھاتے ہیں، عام زندگی میں جھوٹ بولتے ہیں، فلمیں دیکھتے ہیں، گانے سنتے ہیں، پرائی عورت کو تنگ کرتے ہیں، اپنی بیوی اور بچوں سے حسن سلوک نہیں کرتے، کسی کا حق مار جاتے ہیں، دفتر میں یا نوکری میں دیانت کا معیار قائم نہیں رکھتے وغیرہ وغیرہ، تو اس رمضان کی برکات ان کے لئے ہرگز نہیں۔ ہاں ان کو اس رمضان کا صرف ایک فائدہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس ماہ میں تزکیہ نفس کر کے آئندہ کے لئے درست ہو جائیں ورنہ ان کے روزے محض فاقے ہی گنے جاسکتے ہیں۔

کیا تحریک نظام مصطفی بھٹو کے خلاف تھی؟

سریہ نمبر 2 مئی 2020 کو لکھے جانے والے کالم کا بھی 319 نمبر ہے،، چونکہ یہ پہلے لکھا گیا اس لئے اس کالم کو یہ نمبر دیدیتے۔
انعم 2024/09/26

کالم 319 از ڈاکٹر سلطان محمود

مورخہ 30 اپریل 2020

1977 کی "تحریک نظام مصطفی" چلانے والی 9 سیاسی جماعتوں کے نام سے۔ جس میں اس وقت کی حزب اختلاف کی تمام بڑی کھڑی ہوئی تھیں۔ یہ ایک ہمہ جہت قومی تحریک تھی جسے جماعت کو نامعلوم ذرائع سے بھاری رقوم ملیں بلکہ بھتیجے ضیاء سے وزارتیں بھی ملیں کیونکہ میاں طفیل ضیاء کے ماموں کہلائے جانے لگے تھے بعد میں۔ اس تحریک کو بیک وقت سی آئی اے، مسلح افواج، امریکہ نواز ایران اور سعودیہ کے علاوہ سدا کی ان پڑھ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ یعنی پاکستان کے نام نہاد اسلام پسند عوام کی حمایت بھی حاصل تھی (میرے سمیت) مگر روس، بھارت اور افغانستان نے اس تحریک کی مخالفت کی تھی۔ وجہ امریکہ اور روس کی سرد جنگ تھی اور روس سمجھتا تھا کہ اس تحریک کی آڑ میں امریکہ پاکستان میں فوجی حکومت قائم کر کے سوویت یونین توڑنا چاہتا ہے اور ایسا ہی ہوا بھی۔ انہی وقتوں میں پاکستان کے قیام کی تحریک کو بھی روس کے خلاف امریکی پلان مشہور کر دیا گیا جس میں نیپ (موجودہ اے این پی) کے خان عبدالولی خان روس اور بھارت کی آشیر باد سے پیش پیش تھے اور انہوں نے لندن آفس لائبریری میں بیٹھ کر "جناح کے خطوط جنیوا میں امریکی سفیر کے نام" جیسی ایک کتاب بھی لکھ ماری یا ایسا ہی کچھ کیا جو مجھے درست یاد نہیں۔ اس کتاب پر پاکستان میں پابندی لگی۔ اس جرم پر بھارت اور روس سے لاکھوں روپوں کی تھیلیاں لینے

والے باچہ خان کی نیپ کالعدم کر دی گئی اور ولی خان کو گرفتار کر لیا گیا اور پھر وہی نیپ اے این پی بن گئی۔ اور آج تک سوویت یونین ٹوٹ جانے کے صدمے سے باہر نہیں آ سکی۔

یہ پس منظر بیان کرنے کا مقصد اس سوال کا جواب بھی ہے کہ 1977 کی تحریک صرف بھٹو کو پھانسی دلانے کے لئے نہیں رچائی گئی تھی بلکہ اس کے بے شمار دیگر مقاصد بھی تھے۔ چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ سب سے بڑی اور اصل وجہ پس منظر میں بیان کر دی گئی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بھٹو کو ہٹانا شاید اتنا اہم نہ تھا جتنا ضیاء کو لانا۔

2۔ امریکہ اور فوج کی نظر میں بھٹو ایک خطرناک شخص تھا کیونکہ وہ سی آئی اے اور فوج کا بندہ ہونے کے باوجود ناقابل بھروسہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ تحریک پاکستان، 1954 سے پاکستانی سیاست میں امریکی آشیر باد سے فوجی عمل دخل، مشرقی پاکستان کی علیحدگی، اور ایوب کے تمام آمرانہ اقدامات کا قریبی گواہ بھی تھا نیز اصلی صدارتی نظام کو توڑ موڑ کر ایوب کو آمریت سکھانے والا "واحد سیاستدان" بھی تھا۔ اس لئے اس کا صفحہ ہستی سے صاف ہو جانا نوشتہ تقدیر تھا۔

3۔ بھٹو کو ایوب ہی کے وقت میں قتل کر دیا جانا تھا۔ مگر امریکہ نے اس کی زندگی کے چند سال صرف دو مزید کام لینے کے لئے بڑھائے۔ اضافی فائدہ یہ تھا کہ دنیا اور پاکستانی ریوڑ کو دکھانے کے لئے فوجی تسلسل توڑنا بھی ایک مقصد تھا۔ حالانکہ بھٹو جاگیر دار ہونے کے ناطے قطعاً جمہوری مزاج نہ تھا۔ بھٹو کے اگلے دو کام اس کے اس سابقہ کام یعنی پاکستان کو توڑے جانے کے علاوہ تھے، تاکہ امریکہ نواز ایوب نے امریکہ کی خواہش کے برعکس چپکے سے ملک کو جو اقتصادی ترقی دیدی تھی اس کے غبارے سے ہوا نکالی جائے اور دوم پاکستان کو ہمیشہ کے لئے اپاہج رکھنے اور اپنا ایجنڈا اس کی

احمق عوام سے پورا کراتے رہنے کے لئے حقیقی تعلیم سے دور کر دیا جائے۔ بد قسمتی سے بھٹو نے یہ دونوں امریکی ایجنڈے صنعت اور تعلیم کو نام نہاد جمہوریت کے پردے میں قومیا کر پورے کر دیئے۔ دیکھ لیں آج بھی پاکستان معیشت اور تعلیم میں گراونڈ زیرو پہ کھڑا ہے۔

پھر 1977 کی تحریک چلی اور اس کی آڑ میں اگلا امریکی ایجنٹ ضیاء آ گیا۔ جس پر اس وقت صرف اتنا لکھا جا سکتا ہے کہ اس نے دونوں سابقہ امریکی ایجنڈے بہ احسن و خوبی پورے کر دیئے یعنی بھٹو کو پھانسی دیکر تاکہ سارے راز ہی دفن ہو جائیں نیز قوم کو جگانے کی ہمت کرنے والا بھی کوئی نہ رہے۔ اور سوویت یونین توڑ کر تاکہ امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور بن جائے۔ مگر جاتے جاتے وہ امریکہ کے اگلے ایجنڈے کو بھی پورا کرنے کی بنیاد رکھتا گیا۔ یعنی اسلام کو بدنام کر کے، ملک کو ہیروئین، کلاشنکوف، مہاجرین، نواز شریف، الطاف، وغیرہ دیکر۔ مگر یہ اس وقت موضوع نہیں اور ویسے بھی میں اس پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔

موضوع سے ہٹ کر ایک بات طے شدہ ہے۔ امریکہ کی عادت ہے کہ دنیا کی چلتی ہوئی تحریکوں کی گاڑی میں اپنا مالی اور ذہنی پٹرول ڈال دینا تاکہ بعد میں اپنے فوائد کشید کئے جا سکیں۔ یہی اس نے برصغیر کی تحریک خلافت، تحریک بریلی، تحریک احمدیہ، تحریک پاکستان نیز ایسی بیشمار تحاریک میں بھی ڈالا جو ابھی مستقبل قریب میں ظاہر ہونگی۔ نیز وہ آج تک پٹرول ڈالے چلا جا رہا ہے اور فائدے اٹھاتا جا رہا ہے۔ رہی ریوڑ جیسی عوام تو وہ اسے گالیاں بھی دیتی رہتی ہے مگر امریکن ویزے کے عشق میں مرتی بھی رہتی ہے۔

6۔ معصوم آنکھیں

کالم / افسانہ 319۔ اشاعت دی رائیٹرز کیفے مورخہ 02 مئی 2020 23:51 بجے

از ایس ایم فائق

ہسپتال کی کینٹین میں کافی کے ہلکے ہلکے گھونٹ لیتے رامین خیالوں میں گم سوچ رہی تھی کہ بستر پر پڑے اس کے باپ نے ہمیشہ اسکی ماں کا خیال رکھا۔

دونوں ایک دوسرے کے لئے جو کچھ کر سکتے تھے کیا۔ ابا نے ہمارے لیے کئی خواب دیکھ رکھے تھے مگر جونہی ریٹائر ہوئے اور ان کاموں کے کرنے کا وقت ملا تو ہمیں اچانک جھٹکا لگا کہ وہ جو کام نہ کر سکے تھے وہ اپنی صحت کا خیال تھا۔ ورنہ آج ریٹائرمنٹ سے صرف ایک سال بعد کینسر سے یوں نہ تڑپ رہے ہوتے۔ ابا کی بیماری سب کے لیے پریشان کن جھٹکا تھا مگر رامین نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ مجھے جھٹکوں اور حیرتوں والی زندگی نہیں گزارنی۔ ابھی تئیس سال کی عمر ہی میں مجھے ایک جیون ساتھی مل جانا چاہئیے اور اس سے مجھے بھلا کیا چاہیے؟ بھرپور توجہ اور باعزت گھریلو زندگی یا کسی دن اچانک حیران کن موت کا جھٹکا؟ لہٰذا وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ میں ایسی زندگی گزارنا چاہوں گی کہ جس میں تحیرات نہ ہوں۔ بہرحال رامین ملازم کی اس بری خبر سنانے پر تخیل سے باہر آئی جو وہ ہکلاتے ہوئے مالک کی موت کے بارے میں دے رہا تھا۔ چکرا کے گرتے وقت اسے بس اتنا یاد تھا کہ کسی نے اسے تھام لیا تھا تاکہ سر پر چوٹ نہ آجائے۔

پھر ایک روز اسے فون پر کسی کاشر کا پیغام ملا کہ مادام میں آپ کا پورٹریٹ بنانا چاہتا ہوں۔ نام پڑھ کر وہ چونک پڑی۔ کاشر ایشیا کا ایک بے حد مہنگا نام تھا جو صرف سیلیبرٹیز کے پورٹریٹ بنانے میں

شہرت رکھتا تھا اور جس کے شہ پارے دنیا کی سب سے زیادہ مشینی قوم یعنی چینیوں کے بھی گھروں اور دفاتر

کی زینت بنتے تھے نیز اس کے یورپ کے ان گنت دوروں کا بھی اخبارات میں چرچا رہتا تھا۔

کاشر کی کامیابیوں کے تصور نے رامین کے ذہن میں ایک بوڑھے سنکی سے مصور کا ہیولہ بنا دیا تھا۔ آج ابا کی پہلی برسی پر اس نے کامیاب زندگی گزارنے کا عزم کرتے ہوئے شاید پہلا فیصلہ یہ ہی کیا تھا کہ کیوں نہ کاشر سے پورٹریٹ بنوا کر سوسائٹی میں اپنی قیمت لگوائے اور کسی ایسے گھر میں بس جائے جہاں

دولت، عزت اور چین ہی چین ہو۔

بیل کی اواز پر ایک توانا سی آواز نے اندر بیٹھنے کا کہا۔ سٹوڈیو کیا تھا ایک کشادہ سا گھر تھا۔ چاروں طرف لان، ایک انتظار گاہ جو کہ سٹوڈیو ہی کا

منظر پیش کر رہی تھی۔ سامنے دو کمرے مگر ایک میں ڈائننگ ٹیبل اور دوسرا پینٹنگز کا کباڑ خانہ۔ رامین سمجھ گئی کہ اوپری کمروں میں کاشر کی فیملی

رہائش پذیر ہو گی۔ اتنے میں بھاری عینک سجائے ایک تیس برس کا جوان اندر داخل ہوا۔ رامین کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے اپنا نام کاشر بتایا۔ وہ تو فون پہ اسے منیجر سمجھ رہی تھی۔ رامین پریشان تھی کہ اگر کاشر نے یہ پوچھ لیا کہ کیا صرف میری دعوت پر پورٹریٹ بنواؤ گی یا پھر دلچسپی بھی ہے تو کیوں ہے تو کیا وہ بتا پائے گی کہ اسے اپنے حسن کی قیمت لگانے والا کوئی کروڑ پتی چاہیے جو اس کے بچے جوان ہونے تک اسکا خیال رکھے۔ کم از کم دنیا

کے سامنے عزت کرتا رہے اور تمام سہولتیں بہم پہنچانے سے پہلے نہ مرے۔

مگر وہ کاشر کی بات سن کر حیران رہ گئی کہ کینٹین میں تمہیں سہارا میں نے ہی دیا تھا اور میں سمجھ گیا تھا کہ تم خواہشات کی ماری، بے راہ رو قسم کی

لڑکی ہو اور کئی مردوں کے ساتھ راتیں گزار کر بھی ابھی تک اپنے دل اور آنکھوں کی معصومیت زائل نہیں کر پائی ہو کیونکہ کاشر اسے کئی مردوں کے

ساتھ دیکھ چکا تھا۔

مگر یہ سب باتیں کاشر نے ایک حساس مصور کی طرح تعارف کے نام پر رامین کے منہ سے اگلوائیں۔ رامین کے تئیں اسے یہ تمام باتیں بتا بھی دینی چاہئیں تھیں تاکہ کاشر کو پتا چلے کہ میں روپیہ کمانے والی ہوں پورٹریٹ کے لاکھوں دینے والی نہیں۔ ہاں البتہ پورٹریٹ کی قیمت کے بدلے میں چند راتیں مانگو گے تو دے دوں گی۔

رامین سوچ رہی تھی کہ اگر یہ سنکی بوڑھا ہوتا تو مفت میں پورٹریٹ بھی بن جاتا اور ساتھ میں کئی تحفے بھی بغیر کسی اضافی تردد کے مل جاتے۔ مگر کاشر

رامین کی آنکھ کی معصوم چمک سے یہ راز پا رہا تھا کہ یہ مجھے نچوڑ دے کر مفت پورٹریٹ بنوا کر جلد از جلد کسی امیر کی زندگی میں داخل ہونے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ نیز اس نے زندگی کی دیگر خوشیاں پانے کے لئے اپنے جسم کا سرمایہ واحد جنس کے طور پر خرچ کرنے کا فیصلہ ایک طویل ذہنی جنگ کے بعد کیا ہے کیونکہ اسے زندگی کی جنگ بہر حال خود لڑنی تھی۔ کاشر حقیقت پسندی سے سوچ

رہا تھا کہ ہم میں سے ہر کوئی اپنی سمجھ کے مطابق سوچوں میں آزاد ہے سوائے اس شخص کے جو غیر مشروط محبت کرنے والا ہو اور اسے دوسرے کی کمزوری سے فائدہ بھی نہ اٹھاتا ہو۔

رامین نے اس اکیلے گھر میں اس دن تین گھنٹے گزارے مگر ایک شدید الجھن اپنے ساتھ لے آئی۔ غصے سے سوچنے لگی کہ اگر یہ نارمل لڑکا ہوتا تو دو دفعہ ہاتھ ملانے کی بجائے دو چار دفعہ ٹھرک جھاڑ سکتا تھا۔ مگر یہ سوچ کر رامین ذرا پر امید ہوئی کہ ابھی کئی دفعہ مزید کاشر کے ساتھ وقت گزارنا ہے پتہ چل جائے گا کہ اسکی سوچ میرے جسم کے بارے میں کیا ہے۔ مگر رامین حیران تھی کہ آج کے سیشن میں اس نے مجھے ہاتھ تک نہ لگایا اور نہ ہی اپنے رنگوں، برش اور کینوس کو۔ البتہ دونوں زیادہ تر آتشدان میں سلگتی چنگاریوں ہی کو گھورتے ہوئے اپنی زندگی کے واقعات سناتے رہے اور کافی پیتے رہے۔ چند ایک بار رامین نے کاشر کو بھاری عینک کے پیچھے اپنی ان آنکھوں کو گہری نظر سے ضرور جھانکتے اور جانچتے پایا جن کے بارے میں وہ کہتا تھا کہ یہ بے حد سچ بولنے والی ہیں۔ رامین کا غصہ یہ سوچ کر بھی دھیما پڑتا گیا کہ لڑکا امیر ہے برصغیر کی سلیبریٹی ہے۔ عمر میں چھ سات بڑا ہونا کوئی معیوب بات بھی نہیں۔ مگر اس خیال کے آتے ہی رامین کی رگیں کھنچ کر رہ جاتیں کہ ان تمام اوصاف کے باوجود اس نے ابھی تک کسی کو اپنایا کیوں نہیں؟ اور نہ ہی اس نے اتنے دنوں سے کسی جوان سفلی جذبے کا اظہار ہی کیا ہے۔ کہیں یہ ابنارمل تو نہیں؟ مگر پھر اسے میڈیا میں گردش کرتے کاشر کے کم از کم دو عشقیہ قصے یاد آ گئے اور اس نے یہ خدشہ رد کر دیا۔

آج شہر کے بڑے ہال میں کاشر کی پینٹنگز کی نمائش تھی دور دور تک پولیس کے پہروں سے وہ سمجھ گئی کہ صدر مملکت آئے ہوں گے۔ وہ کالے ریشمی گاؤن میں قیامت بننے کے باوجود واپسی کا سوچنے لگ گئی لیکن وہ ایسا چاہ بالکل نہیں رہی تھی۔ آج اس کا پورٹریٹ بھی نمائش کی زینت بننا تھا اور پھر

اگلے برس وہ ایک سال اور بڑی ہو جائے گی اسے اپنی ڈھلتی قیمت میں ہر گزرتے سال میں آتی کمی سے خواہ مخواہ ڈرتے ہوئے الجھن سے گاڑی پارک کرنے کی بھی جگہ نہیں مل رہی تھی کہ کاشر کی کال موصول ہوئی کہ جہاں ہو وہیں اتر جاؤ اور گارڈ کو چابی پکڑا کے اندر آ جاؤ۔ اپنے متکبرانہ حسن اور دنیاوی سفلی ملے جلے جذبات سے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ دو لڑکے اس کی ہال تک رہنمائی کے لئے آگے آگے چل رہے تھے جہاں کاشر نے صدر مملکت سے اس کا تعارف کرایا اور شائقین میں سے بیسیوں نے اس کے وزٹنگ کارڈز مانگ لئے۔ ایسا لگتا تھا کہ شہر کا ہر جوان بوڑھا صرف اسی کی خاطر تقریب میں آیا ہوا تھا۔

مگر یہ کیا اس کا پورٹریٹ تو نمائش میں موجود ہی نہ تھا۔ استفسار کرنے پر کاشر نے صرف یہ کہا کہ اس لڑکی کی تصویر اس ہجوم میں کیسے لٹکائی جا سکتی

ہے کہ جس کے سارے جسم میں صرف اس کی آنکھیں ہی اپنی ہوں؟ اس نے بڑی شدت سے اپنے کردار پر ضرب لگتی محسوس کی۔

وہ آج زندگی میں دوسری بار چکرائی تھی مگر دبیز صوفے کے سہارے بے ہوش ہونے سے قبل وہ اسٹیج سے صرف اتنا اعلان سن سکی۔ جناب صدر آپکی آمد کا شکریہ اور خصوصی طور پر اس لئے بھی کہ مجھے میری کھوئی ہوئی آنکھیں مل گئی ہیں۔

مستقبل میں دیکھنے والی۔۔۔۔

تنہائی کاٹنے والی۔۔۔

اور رامین نے نہایت اطمینان سے یوں اپنا جسم صوفے پر گرا دیا تھا جیسے اس نے کینٹین میں بے خیالی میں اپنا وجود کاشر کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔

Article Published in the Writers Cafe. On 10May20 at 22:46

سماجی گراوٹ اور ہماری نوکر شاہی

از ڈاکٹر سلطان محمود

17 جون 2019

کسی بیوروکریٹ نے سوال اٹھایا ہے کہ ہم اسقدر سماجی انحطاط کا شکار ہو چکے ہیں کہ ایک سول سرونٹ اپنے غریب باپ یا بھائی تک کو ملنا گوارا نہیں کرتا۔ ہم نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا ہے اور مانتے ہیں کہ یہ ایک اخلاقی انحطاط والا بہت بڑا سماجی مسئلہ ہے۔

قریباً تیس برس قبل ہم فیملی کے ہمراہ انکل وفاقی سیکریٹری (معذرت کیساتھ غیر انسانی سول سروس کے رشتہ داروں کو میں ناموں سے نہیں عہدے سے پکارتا ہوں) کو ملنے ان کے گھر اسلام آباد گئے تو ان کے والد ڈرائنگ روم نہ آئے۔ تاہم بڑے انکل سے ان کے ایک نہایت خوبصورت مگر الگ تھلگ کمرے میں ملاقات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ تہمد باندھنے کے عادی تھے اس لئے ڈرائنگ روم میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ نانا مرحوم بتایا کرتے تھے کہ 1958 میں ان کے انہی والد گرامی نے نہایت لجاجت سے انکل وفاقی سیکریٹری کو نانا کے گھر سی ایس ایس کی تیاری کے لئے رہنے پر راضی کیا تھا۔ کیونکہ پتوکی میں تب ان کے گھر بجلی تک نہ تھی۔

سول سروس میں انگریز نے جان بوجھ کر جاگیر دار، سرمایہ دار اور طبقہ امراء شامل کیا تھا تاکہ اس کا اپنا عروج طالع آزما خونخوار منحوس بھیڑیوں کے ذریعے قائم رہ سکے۔ ہمارے خیال میں بزرگوں اور

کمزور رشتہ داروں سے لاتعلقی والی بداخلاقی صرف ان دس بیس فیصد افسران میں پائی جاتی ہے جو کمزور اور نسبتاً غریب خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں وگرنہ منحوس امیر خاندانوں میں تو بزرگوں کو خصوصاً آگے رکھتے ہیں اور تعارف ہی یہ کراتے ہیں کہ یہ ہیں ہمارے فلاں ابن فلاں جن پر انگریز بہت اعتماد کرتے تھے۔ بالفاظ دیگر یہ ہیں وہ غداران زمانہ جنہوں نے اپنوں کا خون کر کے بلکہ اپنی بہو بیٹیاں بھی انگریز کو پیش کر دی تھیں اور انعام میں فلاں فلاں جاگیر پائی۔

اب ذرا انگریز کے کتے نہلانے والے، اپنی غریب رعایا کو دوسری جنگ عظیم میں کرائے پر قتل کرنے والے اور ننگ وطن غدار خاندانوں سے ہٹ کر ان چودھریوں یا وڈیروں کی طرف چلتے ہیں جن کے اکابرین بھی عام غریب لوگ تھے مگر اپنی محنت میں بدمعاشی کا چورن ملا کر زمیندار بن بیٹھے۔ انہوں نے بھی اپنے بچوں کو سی ایس ایس کرایا۔ پھر ان کی شادیاں دیگر بیوروکریٹس، فوجیوں، سرمایہ داروں وجاگیرداروں میں کر کے ملکی وسائل پر قابو پالیا۔ ایسے سول سرونٹس کی اکثریت کے والدین ان پڑھ اور بچوں کے پسندیدہ معیار سے خاصے کم درجے پر ہوتے ہیں اس لئے وہ جب گورے انگریز کے نافذ کردہ استحصالی نظام میں کالے انگریز کا کردار نبھانے کی کوشش کرتے ہیں تو تب بھی وہ اپنے والدین و دیگر غریب رشتہ داروں کو سول سروس کی چکاچوند سے چھپا کر رکھتے ہیں جس سے ان کا خالی پن، شدید احساس کمتری اور ذہنی گراوٹ واضح ہو جاتی ہے۔

جانے کہاں گئے وہ دن!!!

از ڈاکٹر سلطان محمود, ڈاکٹر میاں محمد لطیف اور دیگر

4جولائی2019

دس روپے کی برف۔ پانی سے بھرا واٹر کولر۔ وی سی آر۔ وی سی پی۔ گھوڑے کی ٹاپ۔ فجر کے وقت گلی میں سے گزرتے کسی بابے کے درود شریف پڑھنے کی آواز۔ 😔 😔

روشن دان۔ ہینڈ پمپ۔ قلم دوات۔ ہولڈر۔ جی کی نب۔۔ تختی۔ گاچی۔ بستہ۔ چھٹیوں کا کام۔ لکیروں والا دستہ۔ دستے پر اخبار چڑھانا۔ مارکر۔ حاشیہ۔ خوشخطی۔ رف کاپی۔ رف عمل۔ سلیٹ۔ سلیٹی۔ کریم کی خالی شیشیاں بھرنے والا۔

گلیوں میں چارپائیاں۔ لکن میٹی۔ چور سپاہی۔ اڈا کھڈا۔

شٹاپو۔ باندر کلا۔ کوکلا چھپاکی۔ یسو پنجو، چڑی اُڑی کاں اُڑا۔ صراحی۔ چائے کی پیالیاں۔ سیڑھیوں کے نیچے باورچی خانہ۔ بتیوں والا چولہا۔ ٹارزن۔ عمرو عیار۔ زنبیل۔ افراسیاب۔ چھڑی اور سائیکل کا ٹائر۔ دکان دار سے چونگا۔ نیاز بٹنا اور آواز آنا، میرے بھائی کا بھی حصہ دے دیں۔،، 😹

مرونڈا۔ گچک۔ سوکھا دودھ۔ ڈیکو مکھن ٹافی۔ لچھے۔ ون ٹین کا کیمرہ۔ مائی کا تنور۔ کوئلوں والی استری۔ ہمسائے کے ٹیلی فون کا پی پی نمبر۔ گولی والی بوتل۔ جمعرات کی آدھی چھٹی۔ ٹٹوریل گروپ۔ بزمِ ادب۔ ششماہی امتحانات۔

پراگریس رپورٹ۔ عرس کے میلے میں دھمال ڈالتا سائیں۔ ٹیڈی پیسہ۔ چونّی۔ بارہ آنے۔ پُتلی تماشا۔ گراری والا چاقو۔ سیمنٹ کی ٹینکی۔ شام کے وقت گلی میں پائپ سے پانی کا چھڑکاؤ۔ دروازے کی کنڈی۔ دیسی تالا۔ ہاون دستہ۔

دادی کی کہانیاں۔ اُڑن کھٹولے کے خواب۔ ڈھیلی جرابوں کے اوپر ربڑ چڑھانا۔ لوہے کی بالٹی۔ جست کے برتن۔ بھانڈے قلعی کرالو۔ بندر کا تماشا۔ بچے کی پیدائش پر خواجہ سرائوں کا رقص۔ گلی میں پکتی دیگ۔ چھت کی نیند۔ تاروں بھرا آسمان۔ دوپٹے کے پلو میں بندھے پیسے۔ انٹینا۔ چھت پر مٹی کا لیپ۔ شہتیر۔ بالے۔ پھونکنی۔ تندوری۔ چڑیوں کا آلنا۔ مسہری۔ شوخ رنگوں کے پائے والا پلنگ۔ بان کی چارپائی۔ کھرا۔ نالی۔

پلاسٹک کی ٹونٹی۔ کپڑے دھونے والا ڈنڈا۔ مسی روٹی۔ پنجیری۔ پِنّیاں۔ بالو شاہی۔ دو ٹیوٹر والا ڈیک۔ دستر خوان۔ صبح کا مشترکہ ناشتہ۔ رات کا مشترکہ کھانا۔ دانتوں پر ملنے والا منجن۔ سٹیل کے گلاس۔ سٹیل کی پلیٹیں۔ سٹیل کے جگ۔ موڑھے۔

سائیکل کی قینچی۔ سیلاب کا خوف۔ ماں کی آغوش۔ باپ کا ڈر۔ دھوتی۔ سلوکا۔ مشترکہ بیڈ روم۔ اینٹوں والا فرش۔ بیٹھک۔ اُستادوں کی مار۔ مولا بخش۔ کاربن پیپر۔ سوجی کی مٹھائی۔ ڈیمو کے لڑنے پر تالا رگڑنا۔ ڈیمو کے ساتھ دھاگا باندھ کر اڑانا۔

دو غباروں کے درمیان ڈوری باندھ کر، واکی ٹاکی، بنانا۔ پانی سے بھری بالٹی میں اُلٹا گلاس ڈال کر بلبلے نکالنا۔ صابن سے سر دھونا۔ سر درد کے لیے مولوی صاحب سے دم کروانا۔

بوتل کے سٹرا کو پائپ کہنا۔ آدھی رات کو ڈراؤنے قصے سننا۔ بچی کھچی روٹیوں کے ٹکڑے کباڑیے کو بیچ دینا۔

مقدس عبارت والے اوراق چوم کر کسی دیوار کی درز میں پھنسا دینا 👥 ۔ بیلٹ کے بغیر پینٹ پہننا اور محلے داروں سے شرماتے پھرنا۔ کُنڈلوں والے بال۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑے بڑے قہقہے۔ سکول جاتے ہوئے بس کی چھت پر پڑے ٹائر میں بیٹھ کر سفر کرنا۔ گلابی رنگ کا سٹوڈنٹ کارڈ جیب میں رکھنا۔ کڑھائی والا رومال۔

خوش آمدید والے تکیے۔ ہاتھوں سے گھولی ہوئی مہندی۔ رنگین آنچلوں کی خوشبو۔ بالوں میں تیل لگا کر کنگھی کرنے کا فیشن۔ سُرمے کی لکیر خوبصورتی کی علامت۔

👴 پسینے بھری قمیص اتار کر چلتے ہوئے پیڈسٹل فین پر ڈال دینا۔ فیوز بلب کو ہلا کر اُس کی تار پھر سے جوڑ دینا۔ بجلی کے میٹر گھروں کے اندر۔ بجلی کا سانپ کی طرح لمبا بل آنا۔ سنیماؤں کے پوسٹر پر نظریں جم جانا۔

سائیکل روک کر مجمع باز کی گفتگو سننا۔ صاف کپڑوں کے ساتھ جیب میں صاف رومال بھی رکھنا۔ قمیص کی جیب میں پین لٹکانا۔ بٹوے میں چھوٹی سی ٹیلی فون ڈائری رکھنا جس میں A سے Z تک سے شروع ہونے والے ناموں کے الگ خانے ہوتے تھے۔

کسی پرانے سال کی ڈائری میں اقوال زریں، نعتیں اور اشعار لکھنا۔ ٹی وی کے اوپر خوبصورت غلاف چڑھائے رکھنا۔ کسی کے تالا لگے ٹیلی فون کے کریڈل سے ٹک ٹک کر کے کال ملانے کی کوشش کرنا۔

باراتوں پر سکے لوٹنا۔ دولہا کا منہ پر رومال رکھنا۔ دلہن کا دوسرے شہر سے بارات کے ساتھ بس میں آتے ہوئے راستے میں دل خراب ہو جانا۔ سردیوں میں اُبلے ہوئے ایک انڈے کو بھی پورا مزا لے کر کھانا۔ محلے میں کسی کی وفات پر تدفین تک ساتھ رہنا۔

مسجد کے مولوی صاحب کے لیے گھر میں الگ سے سالن رکھنا۔ ٹی وی ڈرامے میں کسی المناک منظر پر خود بھی رو پڑنا۔ فلم دیکھتے ہوئے ہیرو کی کامیابی کے لیے صدق دِل سے دُعا کرنا۔

لڑائی میں گالی دے کر بھاگ جانا۔ بارش میں ایک دوسرے پر گلی کے پانی سے چھینٹے اڑانا۔ سونے سے پہلے تین دفعہ آیت الکرسی پڑھ کر چاروں کونوں میں پھونک مارنا۔

مہمانوں کی آمد پر خصوصی اہتمام کرنا اور محلے والوں کا خصوصی طور پر کہنا کہ،، مہمان نوں ساڈے ول وی لے کے آنا،،۔ بسنت کے دنوں میں چھت پر ڈور لگانا، مانجھا لگانا۔ بازار سے پتنگ، گچھے اور چرخیاں خریدنا۔

گڈیاں لوٹنا، ڈوریں اکٹھی کرنا۔ چارپائی پر بیٹھ کر ٹوٹا ہوا شیشہ سامنے رکھ کر چہرے پر صابن لگا کر شیو کرنا۔

لیٹ ہمیشہ تھوک سے صاف کرنا۔ محلے کے بڑے بوڑھوں سے اکثر مار کھانا اور بھول جانا۔ پنکج ادھاس کی غزلیں یاد کرنا اور، میکدہ، کے لفظ سے نا آشنائی کے باعث گاتے پھرنا،، ایک طرف اُس کا گھر، ایک طرف میں گدھا،،۔ 😐

بنٹے، ڈبیاں اور تاش کھیلنا، نہر میں نہاتے کپڑے گنوا بیٹھنا، بیری کے نیچے بیٹھ کر پیشاب کرنے سے ڈرنا کہ کہیں جن نہ چمٹ جائیں، نانا یا ابا کو آتے دیکھ کر ریڈیو یا ٹی وی بند کر دینا، ناول کتابوں میں چھپا

کرلانا، روزانہ ملنے والے پیسوں سے کچھ بچا کر کوئی کھلونا خرید لینا۔ دوستوں کو امی سے نہ ملنے دینا، عام طور پر جھوٹ نہ بولنا مگر سکول سے دیر ہونے پر امی کے چچا کی فوتگی بتانا، ایک چچا کو کئی کئی بار فوت کرا کر سکول سے چھٹی لینا، سکول میں صبح ناخن چیک کروانا، سائیکل کو قینچی سے چلانا، بھائی بہن کی پیدائش پر چپ سادھ لینا اور کسی کو نہ بتانا، ریڈیو پر نسیم بیگم، لتا اور رفیع کو ساری فیملی کے ساتھ سننا، دیوار پر کیلنڈر لٹکا کر روزانہ تاریخ دیکھنا، ڈائری لکھنا، سکول میں آدھی چھٹی کے وقت دال سویاں اور پیٹھی والے لڈو کھانا، محلے کے لڑکے لڑکیوں کا اکٹھے کھیلنا، سائیکل کے ٹائر کو ایڑھ لگا کر بھاگنا، سارے محلے کے کام بھاگ بھاگ کر کرنا، فقیر کو کھانا دیتے دعا لینا۔ 🙏

اگر آپ کو یہ سب یاد ہے تو آپ خوش قسمت ہیں کہ آئی ٹی انقلاب سے پہلے والی زندگی انجوائے کر آئے۔ اِن میں سے شاید ہی کوئی چیز باقی بچی ہو، اور اگر ہو گی بھی تو شاید ویسی نہیں رہی ہو گی۔ زندگی کی نہر کے بہتے پانیوں میں سے ایک دفعہ ہاتھ نکال لیں تو وہ دن ویسے کب رہتے ہیں! ایسی بھی تھی زندگی!

جس کی لاٹھی اس کی بھینس

از ڈاکٹر سلطان محمود

28 جولائی 2019

پاکستان میں عوام کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے صرف ایک طبقے کی بالادستی قائم کی گئی تھی اور باقی سب کو لاغر کر کے مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ کچھ یہی صورتحال ازل سے ہماری زمین پر بھی کھیلا جا رہا ہے۔ جس سے خدا کی زمین پر امیر غریب میں تقسیم بڑھی۔ اسی کھیل کو اٹھارھویں صدی میں گریگر مینڈل نے ، survival of the fittest، یا might is right، یا جس کی لاٹھی اس کی بھینس، جیسی تھیوری میں پیش کیا جو بڑی طاقت سے آج بھی درست مانی جاتی ہے۔ اس نظام بد کو توڑنے کے لئے بھی مختلف دین آئے نیز جمہوریت ایجاد کرنا پڑی۔ مگر یہ کھیل اب بھی جاری و ساری ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔

قومی تاریخ کا چہرہ مسخ نہ کریں

از ڈاکٹر سلطان محمود

04 اگست 2019

ایک فیس بک فرینڈ نے لکھا ہے کہ پاکستان میں موروثی سیاست کا آغاز گورنر جنرل قائد اعظم جناح کی بہن فاطمہ جناح نے صدارتی انتخاب لڑ کر کیا۔ ان سے عرض کی کہ ذرا وجہ پر بھی غور کریں۔

دراصل آزادی کی تحریک کی تاک میں بیٹھے چند امریکی حمایت یافتہ جرنیلوں نے قائد کی وفات کے ساتھ ہی سیاستدانوں میں سے سونگھ سونگھ کر امریکن پلانٹڈ سیاستدان ساتھ ملائے، لیاقت علی خان سمیت، اور پھر ان کی مدد سے حکومت پر شب خون مار دیا۔ اب ان سیاستدانوں کے پاس جو ملک کو حقیقی جمہوری پٹڑی پر رکھنا چاہتے تھے، کوئی رستہ نہ بچا تھا سوائے محترمہ فاطمہ جناح کے انتخاب کے۔ کیونکہ وہی ایک محترم شخصیت بچ گئی تھی جسے ازاں بعد ان جرنیلوں اور انکے حمایت یافتہ بد بختوں نے ذلیل کر کے رکھ دیا۔

امریکہ نے نئے ملک کی تحریک چلتے ہی اپنے بندے پلانٹ کر دیئے تھے اور نوزائیدہ پاکستان کا خود انتخاب کیا تھا کیونکہ امریکن زندہ قوم تھی اور اسے سوویت یونین کی بڑھتی طاقت کو توڑنا تھا۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ امریکہ نے ایوب، بھٹو اور ضیاء کے ذریعے سوویت پاور توڑ کے دکھا دی۔

جاری رکھا جا سکتا ہے۔۔۔۔

کشمیر پر سلامتی کونسل کا مشاورتی اجلاس

تجزیہ از ڈاکٹر سلطان محمود

16 اگست 2019

اس وقت اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا پاک بھارت کے کشمیر قضیے پر بند کمرہ مشاورتی اجلاس ہو رہا ہو گا۔ دونوں متحارب ممالک سلامتی کونسل کے رکن نہ ہونے کے باعث شرکت نہیں کر سکیں گے نیز کونسل کے 12 رکن ممالک کی مشاورت باہر نہ آپائے گی۔ ماسوائے سرکاری نوٹ کے۔ پاکستان کو چین اور بھارت کو امریکہ البتہ تفصیل بتادے تو یہ انکی صوابدید پر منحصر ہے۔ اس مشاورتی اجلاس سے قبل اگر پاکستان نے ایٹمی حملے کی سنجیدہ دھمکی دیدی تو پانچوں ویٹو پاورز شاید اس قضیے کو سنجیدہ لیں ورنہ دونوں ممالک کو جنگ سے باز رہ کر امریکی ثالثی میں مذاکرات کا کہا جانے کے زیادہ امکانات ہیں۔

مرد مومن مرد حق ضیاالحق

از ڈاکٹر سلطان محمود

17 اگست 2019

پہلے شاہد خان کا مضمون اور پھر جواباً ہماری رائے ملاحظہ کریں۔

جنرل ضیاء پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ افغانیوں کو پاکستان لایا جن کے ساتھ ہیروئین اور کلاشنکوف کلچر آیا۔

کیا واقعی؟ آیئے آج اس پر بات کرتے ہیں۔

کچھ باتیں سمجھنے کی کوشش کریں۔

روس کے خلاف جہاد اور جنرل ضیاء کی شرائط۔

افغانی پاکستان کیوں آئے تھے؟

روس کے افغانستان پر حملے کی وجہ سے۔

اور روس کو اس حملے کی دعوت کس نے دی تھی؟

یہ دعوت جنرل ضیاء نے نہیں بلکہ ان سرخوں نے دی تھی جو آج بھی افغانیوں کو واپس بھیجنے کے خلاف ہیں۔

انہی افغانیوں کے ساتھ پاکستان میں روسی کلاشنکوف اور ہیروئن آئی۔

روسی حملے سے پہلے افغانستان میں ہیروئین کی پیداوار کو افغانستان کا حکمران خاندان کنٹرول کرتا تھا اور نسبتاً محدود تھی۔ لیکن روسی حملے کے بعد جب مرکزی حکومت ختم ہوئی تو تمام وارلارڈز نے افیون کی کاشت خود شروع کر دی جس کے نتیجے میں افغانستان دنیا میں سب سے زیادہ افیون پیدا کرنے والا ملک بن گیا۔

ظاہر ہے اس افیون کی کھپت افغانستان میں تو ممکن نہ تھی۔

ایران میں فوری اور سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ دوسری طرف روس تھا جہاں سے حملہ جاری تھی۔ گو کہ اس کے باوجود روس میں افیون کی بہت بڑی مقدار کھپائی گئی۔

تب ایک پاکستان ہی بچتا تھا جس کی افغانستان کے ساتھ سب سے لمبی اور پیچیدہ سرحد ہے جسکی اس وقت کوئی نگرانی موجود نہیں تھی۔

افغانیوں اور ہیروئن کو روکا کیوں نہیں گیا۔

پاک افغان سرحد دنیا کی سب سے پیچیدہ اور مشکل سرحد ہے۔ اس کا ایک بہت بڑا حصہ ان قبائلی علاقوں پر مشتمل جہاں بہت سے گاؤں ایسے ہیں جو آدھے افغانستان اور آدھے پاکستان میں ہیں۔

2005ء سے پہلے کبھی پاک فوج اس قبائلی پٹی اور ان سرحدوں پر تعینات ہی نہیں ہوئی تھی۔

اس لیے نہ وہاں سے افغانیوں کی نقل و حمل کو روکا جا سکتا تھا اور نہ ہی ان کے ساتھ آنے والی ہیروئین اور کلاشنکوف کو۔

آج پاکستان کی کم از کم دو سے ڈھائی لاکھ فوج پاک افغان سرحد پر تعینات ہے اس کے باوجود اس 2200 کلو میٹر لمبی سرحد کی مکمل نگرانی نہیں ہو پا رہی اس لیے مجبوراً پاک فوج اب اس سرحد پر باڑ لگا رہی ہے۔

میں خود ایک قبائلی ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ ہیروئن کی سمگلنگ میں قبائلی ملوث ہیں اور سب سے زیادہ اسلحہ بھی قبائل کے پاس ہے۔

لیکن شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ پاکستان میں سب سے کم ہیروئین پینے والے قبائلی ہیں۔ بلکہ کم از کم مجھے آج تک ایک بھی قبائلی ہیروئنچی نہیں ملا۔

کلاشنکوف تو کیا ان کے پاس گھروں میں راکٹ لانچر تک موجود ہیں۔ لیکن دہشت گردوں کی آمد سے پہلے غالباً پاکستان بھر میں قتل اور چوری کی سب سے کم وارداتیں قبائل میں ہوتی تھیں۔

کیوں؟

یہ 80 کی دہائی کا درمیان عرصہ تھا۔

سادہ سی بات ہے۔ وہاں جرگے کی مدد سے تیز رفتار انصاف کا نظام رائج ہے بس۔ کلاشنکوف کلچر سے اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ ضیاء نے پاکستانیوں میں کلاشنکوف تقسیم کی جس کے بعد وہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے تو اس سے زیادہ بودی اور مضحکہ خیز بات کوئی اور نہ ہو گی۔

درحقیقت پاکستان میں انصاف ناپید ہے۔ جس کی وجہ سے بے خوف قتال و فساد عام ہے اور اس کے لیے انکو کسی کلاشنکوف کی بھی ضرورت نہیں۔ جو کچھ ان کے ہاتھ لگتا ہے یہ کر گزرتے ہیں۔

ایک اہم ترین بات اور۔۔

اگر پھر بھی ضیاء ہی ذمہ دار تھا تو اس کے بعد ان 27 سالوں میں افغانیوں، ہیروئین اور کلاشنکوف کو روکنے کے لیے کیا کیا گیا؟؟

بلکہ حالت یہ ہے کہ جو کیا جا رہا ہے اس کے راستے میں بھی روڑے اٹکائے جا رہے ہیں۔

پاک فوج افغانیوں کو واپس بھیجنا چاہتی ہے۔ جے یو آئی، اے این پی اور اچکزئی مخالف۔ پاک فوج سرحد پر باڑ لگانا چاہتی ہے۔ جے یو آئی، اے این پی اور اچکزئی مخالف۔

لیکن ڈھٹائی کا عالم یہ ہے کہ صرف چند سال پہلے پاکستان میں سرخوں کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت اے این پی کے لیڈر غلام بلور نے ایک بار پھر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "آمریت نے ہمیں ہیروئین اور کلاشنکوف کلچر دیا"۔۔

یہ وہی سرخے ہیں جن کی دعوت پر روس نے افغانستان پر چڑھائی کی تھی اور جس کے نتیجے میں یہ سب کچھ ہوا۔

جن دنوں جونیجو جنرل ضیاء کی محنت کا کریڈٹ لینے کے چکر میں روس سے معاہدہ کرنے کو بے تاب تھا۔

انہی دنوں جنرل موصوف نے کہا تھا کہ "مجاہدین کی حکومت تسلیم کروائے بغیر روس سے یہ معاہدہ نہ کرو ورنہ افغانستان میں حکومت کے حصول کے لیے یہ سارے آپس میں لڑ پڑینگے نتیجے پاکستان میں پناہ لینے والے افغانی یہیں رہ جائنگے۔۔

اس وقت کی جمہوری بالشتیوں نے ضیاء کی بات پر کان نہیں دھرے اور بعد میں بلکل وہی ہوا جسکا اندیشہ جنرل ضیاء نے ظاہر کیا تھا۔

اور ایک آخری بات۔ جتنے افغانی پاکستان آئے تھے اتنے ہی ایران بھی گئے تھے۔ دونوں ممالک نے انسانی ہمدردی کی بنا پر انکو پناہ دی تھی تاکہ انکی جانیں بچ سکیں۔

ایران نے آخر کیسے ان کو سنبھالا؟

حقائق جانے بغیر کچھ رٹے رٹائے جملے دہرا کر در حقیقت ہم جنرل ضیاء کے ساتھ تاریخی بے انصافی کر رہے ہیں۔

تحریر شاہد خان انتخاب آرزو تبسم

اب ہماری رائے (ڈاکٹر سلطان محمود)

شاہد خان کی اس تحریر میں کچھ بنیادی باتیں حقیقت کے خلاف ہیں اور بعضی تو لگتا ہے جمہوریت پر شب خون مارنے والے اس جرنیل کے بیٹے سے لفافہ وصول کر کے لکھی گئی ہیں۔ ہم بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں نیز جمعیت کے پلیٹ فارم سے نام نہاد تحریک نظام مصطفے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کر چکے ہیں لہٰذا ملاحظہ کریں شاہد خان کی تحریر میں چند حذف شدہ یا تخریف شدہ حقائق:

1۔ ضیاء کو سی آئی اے نے بھٹو کے ہاتھوں چیف بنوایا کیونکہ یہ ان کا فلسطینیوں کو اردن کی طرف سے قتل عام کرنے والا قابل اعتماد مہرہ گردانا جاتا تھا۔

2۔ سی آئی اے کا مقصد ضیاء کے ذریعے تین اہم کام لینا تھے۔ ایک سوویت یونین کو پاکستانی فوجیوں کے ساتھ مل کر توڑنا، جو پندرہ ہزار ڈالر میں فی فوجی پڑا جبکہ ایک امریکی فوجی ان کو ایک ملین ڈالر میں پڑتا تھا۔ امریکہ نے 1947 ہی سے پاکستان کی تحریک کو ھائی جیک کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ یہ کام وہ کسی مسلمان ملک کے ذریعے، کافر، اشتراکیوں کے خلاف اپنے سرمایہ دارانہ نظام کو بچانے کے لئے کرنا چاہتا تھا اور اس نے کر بھی دکھایا۔ دوم پاکستانی فوج کو نیوکلیئر پاور بننے سے روکنا اور سوم، لگتے ہاتھ بھٹو کا قتل، جسے امریکی یہودی ہنری کسنجر سبق سکھانے کی دھمکی دے چکا تھا۔

3۔ امریکی تحقیق نے ثابت کیا تھا کہ پاکستان بنتے ہی کروڑوں ان پڑھ اور غریب عوام اس اسلامی ملک کے حصے میں آئیں گے۔ جنہیں مالی مدد دے کر اسلام کے نام پر جب چاہیں گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ تبھی ضیاء نے فوج کی ہر جگہ مدد کرنے والی (مثلاً الشمس والبدر والی) سیاسی جماعت اسلامی اور دیگر 8 جماعتوں کو ساتھ ملا کر نظام مصطفے کا دلفریب نعرہ دیا جس نے حقیقت میں ملک بھر کے نوجوانوں میں، میرے سمیت، پارہ بھر دیا۔ اور پھر ہم سب نے زور لگا کر، مرد مومن، ضیاء کی آمریت کے 11 سال شروع ہونے پر مٹھائی بھی بانٹی اور ان پڑھ ہونے کے ناطے یہ نہ سوچا کہ اس گاڑی میں پٹرول امریکی تھا جو وہ افغان علاقوں میں ہیروئین کاشت کی اجازت دیکر پورا کرتا رہا تھا، جنرل فضل رازق اور جنرل اختر عبدالرحمان کی نگرانی میں۔ مگر پھر ہم ہی نے ان نوستاروں سے بھٹو ہٹوا کر پھوٹ پڑتے دیکھی ماسوائے جماعت اور ایک دو اسلامی جماعتوں کے جو آج تک زندہ مردہ ضیاء کی نمازوں کی وجہ سے یا حکومت میں رہنے کی وجہ سے اسکی پوجا پاٹھ میں لگی ہوئی ہیں۔

4۔ امریکہ نے ضیاء اور اسلامی جماعتوں کی مدد سے انتہائی اہم فوائد حاصل کر لئے۔ سوویت یونین توڑ دی، عملاً ہمارے فوجی اور سیاسی کارکن مروائے اور اپنے بچا لئے، ایک ڈالر اپنا نہیں لگایا ساری دولت ہیروئین سے کما کر بعد میں الزام بھی پاکستان پر دھر دیا۔ بلکہ ہمارے جماعتی دوست جو بات آج تک چھپائے بیٹھے ہیں وہ جنرل رازق کے بیٹے کی امریکی قید ہے ہیروئین ٹریفک کے الزام میں، امریکی ایجنٹ کے طور پر ملکی سیاست پر قبضہ کرنے والے بھٹو کو اسی بدبخت ضیاء سے پھانسی لگوا کر دنیا بھر کے ممالک کے سیاستدانوں و آمروں کو دہشت زدہ کر دیا اور پھر پوری دنیا اکلوتی سپر پاور امریکہ کی جھولی میں آ گری تاوقتیکہ ابھی حال ہی میں چین نے اسے چیلنج کرنے کی جرات کی ہے۔ یہی پیشگوئی ڈاکٹر مبشر حسن نے 1975 میں کر دی تھی۔

5۔ بہر حال امریکہ دو اہداف حاصل نہ کر سکا۔ اول ایوب اور بھٹو کی طرح ضیاء میں بھی قومی حمیت جاگ گئی اور ایٹم بم والا معاملہ امریکہ کی شدید مخالفت کے باوجود نا صرف جاری و ساری رہا بلکہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بقول ضیاء دور ھی میں 1983 میں مکمل بھی ہو گیا تھا، دوم امریکہ فوری طور پر دولت اگلتی ہیروئین سے پیچھا نہ چھڑا سکا جو کہ پھر کل کے امریکی مجاہدین اور آج کے طالبان نے اپنے زمانہ اقتدار میں آ کر پابندی لگا دی۔ ایک تیسرا کمزور سا ھدف ایسا بھی تھا جو امریکہ پورا نہ کر سکا کیونکہ اسے ضیاء کو جلد مروانا پڑا یعنی اس کی مندرجہ بالا، کوتاہیوں، نیز کام نکل جانے کے بعد جس طرح وہ ابتدا میں ہمارے غداروں کو بعد میں اپنے غدار قرار دیکر کتے کی موت نصیب کرتا ہے۔ بھٹو اور ضیاء اسی طرح کی مثال بنے۔ ایوب کو اس لئے معافی مل گئی کیونکہ اس نے جان بچانے کے لئے خود اقتدار چھوڑ دیا تھا۔ ہاں تو وہ ہدف ایران کی ناکہ بندی تھا جہاں اسی ضیاء کو دیگر دو کافرین، امریکی ریگن اور اسرائیلی بیگن، کے ساتھ خطبات جمعہ میں پورے ملک میں لعنت بھیجی جاتی رہی تھی۔

حرف آخر

شاہد خان اگر اتنے ہی حقیقی محقق ہیں تو مندرجہ بالا حالات کی نفی کر کے دکھائیں اور counter arguments پیش کریں۔ اگر ضیا کی کہانی سے امریکہ و یہودی نکال دیں تو پھر باقی اس کے ماتھے کا محراب ہی بچتا ہے جسے سطحی لوگ مومنیت اور حقانیت سمجھ کر آج بھی منافقت سے کام لیتے رہے ہیں۔ میں اپنے سابقہ مضامین میں ضیاء کا اصل چہرہ دکھا کر ہیروئن، کلاشنکوف، مہاجرین، ایم کیو ایم، نون لیگ، اور مصنوعی اسلام کی وضاحت کر چکا ہوں اس لئے ان کو یہاں دہرانا اب اچھا نہیں لگتا۔ ہاں ایک بات ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔ ہم عوام کل بھی احمق اور جاہل تھے سو آج بھی ہیں۔ کل نظام مصطفے کہا گیا اور آج ریاست مدینہ کہا جا رہا ہے۔

جانوروں کی پرورش

از ڈاکٹر سلطان محمود

30 اگست 2019

ویٹرنری کی تعلیم ایک گندی ذاتیاتی سازش کا 1974 میں اس وقت شکار ہوئی جب چند وژنری ویٹرینیرئینز نے اینیمل پروڈکشن کو علیحدہ فیکلٹی کا درجہ دیا اور دیگر چند متعصب اساتذہ نے مخالفت شروع کر دی۔ ایک انتہا پسند متعصب شخص کو تب زرعی یونیورسٹی سے نکال باہر بھی کیا گیا۔ مگر بد قسمتی سے اسی انتہا پسند پروفیسر کا کینہ پرور مافیا دن بدن پروان چڑھتا گیا کچھ تو اینیمل ہسبنڈری اساتذہ کی مفاد پرستی سے اور کچھ متعصبین کی پنجاب حکومت میں اکثریت سے۔ اور بالآخر بیس برس بعد حقیقی ضرورت والی اینیمل پروڈکشن فیکلٹی کو بند کروا کر اس ملک کو دیگر مفاد پرستوں کے چنگل میں پھنسا دیا گیا۔ اساتذہ تمام ہی قابل احترام تھے اور ہیں لیکن پروفیسر باز محمد صاحب کی گزارشات پر اگر غور کیا جائے تو آج جانور اتنا غریب اور استاد اتنا امیر نہ ہوتا اور ہم ایشیا کے بہترین جانور رکھنے کے باوجود آج اوسطاً آٹھ نو لٹر دودھ والے جانوروں کی ذلت پال کر انہی جانوروں کے ساتھ بھارت وغیرہ سے شرمندہ نہ ہو رہے ہوتے۔ بزرگ اساتذہ بڑے لوگ تھے مگر ان کی غلطیاں بھی تاریخی غلاظت کے ساتھ بڑی ہی گنی جائیں گی۔ اب اینیمل پروڈکشن کو ویٹرنری کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ کام اس وقت کے بڑے لوگ اسی وقت کر لیتے کیوں قوم کے تیس برس ضائع کئے؟ کاش ہمارے ستر کی دھائی والے پروفیسر ذاتیات سے اوپر ہو کر سوچتے۔ ہمارے ملک میں تو کوئی کسی کو پوچھتا نہیں وگرنہ، معذرت کے ساتھ، ان چند انا پرست اساتذہ کی سزا کم از کم پھانسی بنتی

ہے۔ اب جانور کو اصل پیداوار میں لانے میں مزید کتنی دہائیاں درکار ہیں کاش کوئی اس پر بھی تحقیق کرتا۔

اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

از ڈاکٹر سلطان محمود

20 ستمبر 2019

اگر کوئی اردو کو زندہ رکھنا چاہے تو مبادلات موجود ہیں مگر ہم اپنے آپ کو زیادہ پڑھا لکھا ثابت کرنے کی کوشش میں اردو مبادلات موجود ہونے کے باوجود انگریزی ٹھونک دیتے ہیں۔ چونکہ ہم پوری انگریزی بولنا نہیں جانتے اس لئے انگریزی کے چند الفاظ اردو کی گفتگو میں ڈال کر اپنے اوپر اپنا ہی رعب ڈال رہے ہوتے ہیں۔ زیادہ ہنسی اس وقت آتی ہے جب لفظ انگریزی کا مگر اس کی جمع اردو میں کر رہے ہوتے ہیں جیسے ارکان یار ہنماء کہنے کی بجائے ممبران اور لیڈران کہتے ہیں۔ ہم زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں دیہاتی اساتذہ کا مذاق اڑایا کرتے تھے جو بھیڑوں اور بکریوں کو شیپاں اور گوٹاں کہتے تھے مگر آج چالیس برس بعد ہمارے طنز کو ذرائع ابلاغ نے باقاعدہ طور پر اپنا لیا ہے۔ ہمیں ایک بار طبیعات کے مشہور ترقی پسند استاد ڈاکٹر پرویز ہود بھائی کا دبستان اقبال میں مقالہ سننے کا اتفاق ہوا جنہوں نے ایک گھنٹے کے خطاب میں کائنات کے طبعی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے مکمل اردو بولی اور ایک لفظ انگریزی کا استعمال نہ کیا۔ اس بات سے ہم ان کے مدح خوان بن گئے حالانکہ ان کی تصویر ہمارے نام نہاد اسلام پسندوں نے خاصی بگاڑ کے پیش کی ہوئی تھی۔ مکمل اردو یا پنجابی بولنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا مکمل انگریزی بولنا۔ مگر ان زبانوں کو آپس میں ملا کر بولنے کا رواج نیم پڑھے لکھوں نے ڈالا۔ مثلاً ہماری ایک میٹرک پاس کزن نے اپنے آپ کو پڑھا لکھا ثابت کرنے کی کوشش میں پہلے تو اپنے بچے کا نام ٹونی رکھا۔ پھر وہ باگڑ بلا جب بولنے کے قابل ہوا تو اسے وہ

انگریزی الفاظ سکھانے لگ گئی۔ مثلاً ٹونی بیٹے مائی سن زو چلو گے، دیکھو ہینڈی نہ جلالینا، چلو انکل سے ہینڈ شیک کرو، پوٹی تو نہیں آئی، نوزی صاف کرو، وہ دیکھو ڈوگی۔۔۔۔ وغیرہ۔ اب ہماری اگلی نسل بھی مزے کا کام کر رہی ہے۔ بچوں کو بیکن، سٹی، شوئفات وغیرہ میں داخل کرا کر ان کے سامنے گھریلو گفتگو میں خود ہی محتاط ہو جاتی ہیں کی مبادہ منہ سے جاہل زبان پنجابی کا کوئی لفظ نہ نکل جائے۔ لہٰذا بچہ بڑا ہو کر ایک اعلیٰ درجے کا دوغلا اور منافق جب نکل آتا ہے تو پھر اس بیچارے کو اسی پنجابی میں کوسنے دینے لگی ہوتی ہیں۔ جب پنجابی خواتین کو زیادہ اردو نہ آتی تھی تو وہ سفید کو اردو میں چیٹا کہتی سنی گئیں اور اب اردو آ گئی ہے تو انگریزی بخار چڑھ دوڑا ہے لہٰذا اب ہاتھ ہینڈی ہو گیا ہے اور ابو پاپا۔ اب آگے دیکھئے چینی قوم کے چھانے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ اب تو، یہ کیا ہوا،، ہوا نگ ہوا، ہونے والا ہے۔ اب معلوم نہیں ہماری بہوں، پوتیوں کی زبان بھی ہمارے پلے پڑ پائے گی یا نہیں۔

کیا طاہر القادری سیاست سے آؤٹ ہو گئے؟

از ڈاکٹر سلطان محمود

21 ستمبر 2019

ڈاکٹر طاہر القادری بنیادی طور پر ایک علمی شخصیت ہیں مگر ذہنی طور پر ان کا جھکاؤ مفاد پرستی اور خود نمائی کی طرف زیادہ ہونے کے باعث وہ ہمیشہ چکا چوند اور چمک کے اسیر رہے ہیں۔ اسی چمک پسندانہ فطرت کے باعث وہ خلائی مخلوق کے ایجنٹ کا کردار سیاست میں بھی ادا کرتے رہے اور بیشمار ان سے ایسے کام بھی لئے گئے جن سے وہ روز بروز ناپسندیدہ ہوتے چلے گئے۔ اپنی متلون مزاجی ہی کے باعث انہوں نے پاکستان چھوڑا جو دراصل خلائی مخلوق سے بیزاری کی نشانی بھی تھا۔ وہ چونکہ مذہب کے اس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں قابل ترین انسان بھی مرید کی شکل اختیار کرتے ہی عقل سے پیدل ہو جاتا ہے لہٰذا انہیں اپنی انا کی گہری تسکین پیر بن کر ملی جہاں نہ خلائی مخلوق کی بلیک میلنگ ہوتی ہے اور نہ سیاسی چشمک۔ بس وہ اپنی افتادِ طبع کے باعث جو حادثاتی سیاستدان بن کر بدنامی خرید بیٹھے تھے جتنی جلد ہو سکا اس سے خلاصی کروالی۔ اب وہ دنیا کے بیشمار ممالک میں پھیلے نوے لاکھ اندھوں کے بلاشرکت غیرے کانے راجہ ہیں۔ بیوی بچوں، زر و سیم، مریدین، شہرت وغیرہ کی ریل پیل ہے اور ان کے لئے واحد کلنک کا ٹیکہ سیاست تھی جسے کافی دیر بعد سہی مگر بالآخر اسے چھوڑنے کا اعلان کر کے دراصل اب صحیح طور پر سیاست میں آئے ہیں۔ بلکہ اب عالمی سیاست میں آ گئے ہیں۔ وہ اب بھی خلائی مخلوق کے لئے کام کرتے رہیں گے مگر اپنی شرائط اور زیادہ معاوضے پر۔ اب وہ یہودیوں و نصرانیوں کے لئے پہلے سے زیادہ پسندیدہ بن جائیں گے۔ اور اب وہ

ان مریدوں کی اس دنیا کے واحد روحانی پیشوا بننے جا رہے ہیں جو ان پر مال تو نچھاور کرتے ہی رہتے ہیں مگر جان بھی کر سکتے ہیں اور ان کے ماضی میں بولے گئے بیشمار جھوٹ بھی انکی اندھی عقیدت کے سامنے پرکاہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ انہوں نے کمال ہوشیاری سے دنیاوی کامیابیاں کچھ اس انداز میں سمیٹی ہیں کہ جہاں ان کے کروڑوں مخالفین بانت بانت کی بولیاں بولتے ہیں وہیں ان کے لاکھوں معتقدین انہیں اس گناہوں سے بھرپور کرہ ارض پر زندگی ہی میں جنتی بھی سمجھتے ہیں۔

اپنی ہی یونیورسٹی ہونے کے باعث وہ پی ایچ ڈی بھی ہو گئے، پروفیسر بھی اور شیخ الاسلام بھی۔ امریکہ کے ایک ادارے، امریکن بائیوگرافک انسٹیٹیوٹ، سے انہوں نے 35 ایسی سندیں بھی خرید رکھی ہیں جن کی 1990 میں قیمت 300 سے 700 ڈالر فی سند تھی۔ میں نے کوپن ہیگن کے ان کے دارالسلام میں کچھ عرصہ رہ کر اندازہ لگایا کہ دینی تدوین و اشاعت میں انہوں نے مولانا مودودی کی نقل کی ہے، اشاعت مذہب میں مولانا احمد رضا خان بریلوی کی کاپی ماری اور دنیاوی معاملات مثلاً ہوس انسانی میں یہودیوں سے متاثر ہیں۔ ان تمام کامیابیوں کے پیچھے انکی واحد ذاتی قابلیت زبان و بیان کی طاقت ہے جو کہ ماننا پڑے گا کہ خداداد ہے۔ اپنی دنیاوی طمع اور نخوت کے باعث وہ اپنی زندگی میں شاید کبھی بھی روحانی مقام حاصل نہ کر پائیں مگر راہی عدم ہوتے ہی انکی ولایت کا غلغلہ ضرور اٹھے گا۔ وما علینا الا البلاغ۔

بغض عمرانی

از ڈاکٹر سلطان محمود

29 ستمبر 2019

اگر اقوام متحدہ پر یہودی و عیسائی لابی کا قبضہ ہے تو کیا مسلمان یا دیگر کمزور اقوام وہاں بولیں بھی نہ۔ کیا آپ لوگ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اقوام متحدہ بے کار ادارہ ہے اگر ایسا ہے تو کیا اس ادارے میں جانا بند کر دیں۔ جن لوگوں کے مزاج پر عمران کی شخصیت گراں گزرتی ہے وہ اس کی معرکتہ الآراء تقریر کا اثر زائل کرنے کے لئے نجانے کیوں، سکھر کی کتیا بھکر سے ملانے، کی بیکار کوشش میں اپنا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ سیدھا سیدھا ایمانداری سے کہہ کیوں نہیں دیتے کہ ان کے سینے میں بغض عمرانی کا وبال اٹھ رہا ہے۔ انکا بس نہیں چلتا ورنہ وہ یہاں تک تیار لگتے ہیں کہ اسلام اور پاکستان جائیں بھاڑ میں (خاکم بدہن) لیکن عمران کی شدید بے عزتی ہوتی رہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اپنی ادھوری ذات کے اسیر رہتے ہوئے احساس کمتری کو ظاہر کرنے میں ایسی پوسٹیں بناتے ہیں جن سے ان کی انا کی تسکین ہوتی رہے یا پھر ان کو اپنے کرپٹ لیڈروں سے لفافہ ملتا رہے۔ کیا کسی میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ وہ اقوام متحدہ میں گئے اپنے وزیر اعظم کو صرف پاکستانی و مسلمان کی نظر سے دیکھنے کی ہمت رکھے اور اس شخص کی مخالفت میں اتنا اندھا نہ ہو کہ اسے ذاتیات ملک و مذہب سے بھی بڑی نظر آنے لگے۔

جماعت اسلامی کے زوال کے اسباب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اول

تحریر۔۔۔۔۔افتخار احمد و تبصرہ ڈاکٹر سلطان محمود

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ اور میاں محمد طفیل رحمہ اللہ تک جماعت کو دوسری جماعتوں پر اخلاقی برتری حاصل رہی۔ اور پھر 1987 سے جماعت کی اخلاقی برتری کو گرہن لگنا شروع ہوا اور جماعت کا ووٹ بینک بڑھنے کی بجائے سکڑنے لگا۔

مؤرخہ 13-7-2019 پروگرام جرگہ میں سلیم صافی نے سراج الحق صاحب سے سوال پوچھا کہ آپ بھی پانامہ کیس لے کر سپریم کورٹ گئے تھے کیا آپ کو اب شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔
سراج الحق نے فرمایا کہ پانامہ کیس میں 450 لوگوں میں سے صرف نواز شریف کو نااہل قرار دیا گیا اور وہ بھی پانامہ کی وجہ سے نہیں بلکہ بیٹوں (کمپنی) سے تنخواہ نہ لینے پر۔ محترم جناب سراج الحق کا جواب سن کر حیران رہ گیا اور اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر جماعت کے عروج وزوال پر سوچنے لگا۔

1970 کے الیکشن میں جماعت کو غیر متوقع ناکامی ہوئی جبکہ جماعت سب جماعتوں سے زیادہ منظم اور کارکنان والی پارٹی تھی۔

(1)۔ الیکشن ہارنے کی اصل وجوہات سے آنکھیں بند کر لی گئیں۔ بھٹو نے روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ دیا۔ جاگیر دار اور سرمایہ دار طبقات کے خلاف بھی نعرے دیئے۔ جماعت نے اسلامی نظام کا نعرہ دیا۔ جماعت کو ادراک نہ رہا تھا کہ مولویوں نے صدیوں سے اسلامی نظام کا خاکہ یہ بتایا تھا کہ اسلام میں چور کا ہاتھ اور ڈاکو کا ہاتھ اور ٹانگ کو بھی کاٹا جاتا ہے۔ شرابی کو اسی کوڑے

لگائے جاتے ہیں۔ صدیوں ہوئیں قوم تو بھول چکی تھی کہ خلافت کیسا انسان پرور فلاحی نظام تھا ۔۔۔! جماعت نے سرمایہ دار اور جاگیر طبقہ کے بارے بھی زبان بند رکھی۔

(2)1977ء میں بھٹو کے خلاف سیاسی تحریک کو نظام مصطفیٰ کہا گیا۔ ضیاء الحق نے مارشل لاء لگا دیا۔ قومی اتحاد PNA ٹوٹ گیا، بتایا گیا تھا کہ اسلامی نظام کے لیے قومی اتحاد بنایا ہے۔ ضیاء الحق کی حمایت کا الزام لگنے سے، جماعت کو بڑا اخلاقی اور سیاسی نقصان ہوا۔ جبکہ جنرل ضیاء الحق اندر خانہ ایم کیو ایم اور نواز شریف کو پروموٹ کرتا رہا۔

(3)میاں محمد طفیل کے بعد 1987 کو قاضی حسین احمد کو جماعت کا امیر بنایا گیا۔

سترہ اگست 1988 کو جنرل ضیاء الحق کے طیارہ حادثہ میں جان بحق ہونے پر جنرل اسلم بیگ آرمی چیف بنا۔ جنرل اسلم بیگ کی زیر نگرانی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی نے اسلامی جمہوری اتحاد آئی جے آئی بنایا۔ سب جماعتوں میں پیسے بانٹے گئے۔ نواز شریف نے بھی بٹورے۔

1988 سے پہلے دائیں بازو کی سیاست کا مطلب جماعت اسلامی تھا۔ مذہبی ووٹ جماعت کو ملتا تھا۔ جب جماعت نے آئی جے آئی میں نواز شریف کو دائیں بازو کی سیاست کا سربراہ تسلیم کر لیا تو جماعت کو علم ہی نہیں ہوا کہ جماعت کو کتنا بڑا نقصان ہو چکا ہے۔ سارا مذہبی ووٹ نواز شریف کو شفٹ ہو گیا اور مذہبی ووٹ نواز شریف کا مستقل ووٹ بینک بن گیا۔ اور دائیں بازو کی سیاست کا ٹائٹل بھی نواز شریف نے جماعت سے چھین لیا۔ نواز شریف کے پاس تو کارکن ہی نہ تھے۔ اب جماعت کے کارکنان سرمایہ دار کے جلسے جلوسوں کے قلی بنا دیے گئے۔ بڑی جانفشانی سے سرمایہ دار کو اقتدار کے ایوانوں میں پہنچا کر دم لیا۔ 1999 میں پھر اسی سرمایہ دار نواز حکومت سے واجپائی کے دورہ لاہور میں بزرگوں کو پٹوایا۔

(4) 2002 میں متحدہ مجلس عمل میں مولانا فضل الرحمن کے اتحادی بن کر ستر ہویں ترمیم میں مشرف کو وردی سمیت ووٹ دے دیا۔ قاضی صاحب نے ایران واپسی پر فرمایا، ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا۔

صوبائی اسمبلی تحلیل کر دی جاتی تو مشرف دوبارہ صدر منتخب نہیں ہو سکتا تھا۔ مولانا فضل الرحمن سے دھوکا کھایا۔ مولانا فضل الرحمن کی کرپشن کی سے جماعت کو اخلاقی و سیاسی نقصان ہوا۔

مشرف نے کراچی کا مکمل کنٹرول ایم کیو ایم کو دے دیا۔ جماعت کراچی سے بھی فارغ ہو گئی۔

(5)2009ء میں سید منور حسن صاحب جماعت کے امیر ہوئے تو جماعت کو نواز شریف، فضل الرحمن، اسٹیبلشمنٹ سے فاصلہ پر رکھنے کی کوشش کرنے لگے تو میڈیا نے شور کرنا شروع کر دیا کہ سید منور حسن صاحب پر وطالبان ہیں۔ حالانکہ وہی باتیں عمران خان، فضل الرحمن اور مولانا سمیع الحق بھی کر رہے تھے۔ اتحادی سیاست سے جماعت کو نقصان پہنچا۔ سید منور حسن صاحب نے جماعت کو دوبارہ نہج پر لانے کی کوشش کی لیکن جماعت کا گورباچوف گروپ نے ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔

(6) 2013 میں سراج الحق امیر ہوئے تو غلطیوں سے سبق سیکھنے کی بجائے، تازہ دم سراج الحق نے از سرِ نو انہیں غلطیاں کا افتتاح کر دیا۔ تحریک انصاف کی حکومت سے باہر رہ کر، حکومت سے زیادہ اچھے فیصلے کروا سکتی تھی۔ لیکن جماعت نے مولانا فضل الرحمٰن کے طریقے کو اختیار کیا۔ کیوں نہ پھر تحریک انصاف سے آئندہ الیکشن کیلئے معاہدہ کیا۔ دوسری طرف کرپٹ ایاز صادق کو ووٹ دیے دیا۔ سیاست میں دوہرا معیار میں نہیں چلتا۔

2018 کے الیکشن میں دوبارہ نواشریف کے اتحادی مولانا فضل الرحمن کے اتحادی بن گئی۔ اس کا عوام کو پیغام بڑا منفی پیغام گیا۔ سپریم کورٹ میں نواز شریف کے خلاف گئے۔ سینٹ الیکشن میں ن لیگ سے اتحاد کر لیا۔ جماعت نے نہ غلطیوں سے اور نہ ترک جسٹس پارٹی سے سبق سیکھا ہے۔

.(7) اتحادی سیاست نہ کرتے اصولوں پر قائم رہتے۔ قوم بالآخر ضرور دیکھ لیتی کہ سالوں سے ہمارے لیے کھڑے ہیں۔ ترک جسٹس پارٹی والوں نے مولانا کو پڑھا اور بہت ہی مشکل حالات میں بھی کھڑے رہے!

تبصرہ از ڈاکٹر سلطان محمود

اس گئے گزرے وقت میں بھی بہترین ایماندار اور منظم لوگوں پر مشتمل سیاسی جماعت، جماعت اسلامی ہی ہے مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنی ساکھ کھو رہی ہے۔ وجہ معاشرے کا تیزی سے بگڑنا ہو یا جماعت کا دوغلہ پن مگر میں نے جمعیت کے ساتھ گزارے وہی ایام، جن کا مسعود انور نے ذکر کیا ہے، یہی اندازہ لگایا کہ اسلامی بھیس میں وہی انقلابی کونسل والی غنڈہ گردی ہے۔ گو کہ میں جمعیت ہی کی حمایت سے فیکلٹی انتخابات جیتا مگر اپنی، قوت تجزیہ، سے مجبور ہو کر اس نتیجے پر تبھی پہنچ گیا تھا کہ مولانا مودودی ایک بہترین مبلغ اسلام کے طور پر کچھ اور ہیں مگر سیاست میں آ کر جمعیت کے روپ میں کچھ اور۔ مولانا مودودی کے انہی سیاسی نظریات کے سبب 1958 میں بہت سے اہم زعماء جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے تھے اور پھر نہایت کامیاب بھی رہے مثلاً ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا عبد الرحیم اشرف، مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ۔ بد قسمتی سے جماعت کے یہی دو چہرے آج بھی ہیں۔ مگر جیسا میں نے شروع میں عرض کیا کہ اس منافقت کے باوجود جماعت کے لوگ آج بھی تمام مذہبی و سیاسی جماعتوں کے لوگوں سے ایمانداری میں کہیں آگے ہیں۔ اور اگر

ان کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور دے دی جائے تو کم از کم ضیاء، مشرف، نواز و زرداری سے ملک کے لئے کہیں بہتر ثابت ہو سکتے ہیں۔

جماعت اسلامی کے زوال کے اسباب۔۔۔۔۔دوم

حوالدار نسل کے جماعتی کون ہیں؟

ازوسیم گل

اس وقت جماعت اسلامی میں اٹھانوے فیصد ارکان وکارکنان تعلیمی اداروں میں ایکٹو ایک طلبہ تنظیم کے سابقین ہیں۔اس طلبہ تنظیم کی تاریخ کو میں تین ادوار میں تقسیم کرتا ہوں۔

1۔1947 تا1970

2۔1971 تا2008

3۔2008 تاحال

اپنے پہلے دور میں یہ طلبہ تنظیم کلی طور پر تعلق باللہ، تربیت اخلاق، حصول علم پر فوکس رہی اور اس نے بڑے بڑے مفکر، مدبر، ماہرین سیاسیات وسماجیات، سائنسدان پیدا کئے جنہوں نے آگے چل کر پاکستان وبیرون پاکستان بہت بڑا اثر پیدا کیا۔یہی لوگ جماعت اسلامی میں بھی آرہے تھے اور معاشرے سے آنے والے دیگر جماعتوں کے ساتھ ملکر جماعت کو سب سے بڑی دینی تحریک جبکہ دوسری بڑی سیاسی جماعت بنادیا۔ان دنوں جماعت اسلامی کی پیش قدمی روز افزوں ہوا کرتی تھی۔

دوسرے دور میں یہ اس تنظیم نے اپنے اصل کام کی طرف توجہ کم کردی اور سارا زور تعلیمی اداروں میں عسکری کلچر پروموٹ کرنے، اداروں کی انتظامیہ پر "طلبہ "حقوق کے نام پر دباؤ برقرار رکھنے

اور اس دباؤ کے لئے ضروری افرادی قوت کی فراہمی کے لئے "بزم ادب" کی طرز کی سرگرمیوں میں دن رات ایک کرنے شروع کر دئے۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ ذہین طلبہ اب اس تنظیم میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ بلکل شامل ہوتے تھے مگر غلبہ وزور ان طلبہ کو حاصل تھا اس تنظیم کی نئ سرگرمیوں (set of activities) کو چلا اور آگے بڑھا سکتے تھے۔ یہ طاقتور طبقہ ا"رکان" اور کسی نہ کسی سطح کے "ناظم" تھے۔ اکثر و بیشتر یہ ارکان اسلام کا سطحی فہم، سیاست کا انتہائ پست درجے کا وژن رکھتے تھے۔

اس پورے دور کے بہترین و ذہین ترین کارکنان مشرقی پاکستان، افغانستان، کشمیر کے محاذوں پر کھپ گئے۔ دوسرے درجے کی ذہانتوں نے پروفیشنل فیلڈز کا رخ کر لیا اور تنظیم کا حصہ کم بنے۔ جبکہ یہی سطحی فہم اسلام اور پست سیاسی ویژن کے لوگ جماعت اسلامی میں شامل ہوتے اور مختلف عہدوں میں آتے گئے یہاں تک انہوں نے جماعت اسلامی کو اپنے سابقین کا ایک سوشل کلب بنا ڈالا اور اس میں معاشرے کے عام افراد کی آمد کو تقریباً ناممکن بنا دیا۔ یہی طبقہ اس وقت ضلعی، صوبائی، مرکزی عہدوں پر موجود ہے اور یہی ہر سطح کی فیصلہ سازی کرتے ہیں۔ انکے فیصلوں میں بآسانی دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ نہ ماضی سے کوئ سبق سیکھتے ہیں، نہ انہیں حال کا کوئ ادراک ہوتا ہے اور نہ یہ مستقبل میں جھانک پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکے فیصلے ڈنگ ٹپاؤ یا محض وقتی تدبیر قسم کے ہوتے ہیں جن کا کوئی شارٹ ٹرم یا لانگ ٹرم اپیکٹ نہیں ہوتا۔

پھر چونکہ یہ عموماً مڈل اور لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں تو انکا کوئی خاندانی یا معاشی بیک گراؤنڈ نہیں ہوتا۔ انکا کوئی علمی یا پیشہ ورانہ کارنامہ نہیں ہوتا تو انکو جو کچھ نام، ساکھ میسر آتی ہے وہ جماعت اسلامی کے ذریعے ہی آتی ہے۔ سو یہ معاشرے کے ذہین لوگوں کا راستہ روک دیتے ہیں۔ انہیں

اس بات کا خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں انکے کاروبار، سوشل، پولیٹیکل اسٹیٹس چھن نہ جائے۔ یہ دبنگ و دوٹوک موقف اختیار نہیں کر سکتے اور ٹھوس اور دبنگ فیصلوں سے بھی کمی کتراتے ہیں۔ کسی سطح کا نظم یا امیر غلط فیصلہ کرے تو اسکی تنظیمی طاقت دیکھ کر بولتے یا چپ رہتے ہیں۔ خرابی سے اس لئے آنکھیں بند رکھتے ہیں کہیں اصلاح خود انکی طرف رخ نہ کرلے۔ اپنی نالائقیوں کو چھپانے کے لئے م "ناسب فورم" کے قلعے میں پناہ لیتے ہیں بلکہ بسا اوقات تو قرآن و حدیث کا غلط استدلال تک استعمال کرتے ہیں۔

آپ نوٹ کریں یہی سطحی فہم اسلام اور پست سیاسی وژن کے حاملین کسی دور میں نواز شریف اور حالیہ سالوں میں عمران خان کو اسلام کا ہیرو مان کر اسکے ساتھ گئے ہیں۔ یہ اپنے دور طالب علمی میں "رکن" یان "اعظم" تھے۔

لیکن چونکہ جماعت اسلامی کی فکر، دعوت، تنظیمی ڈھانچہ اور دستور مضبوط ہے اور پھر مخلصین کی ایک بڑی تعداد اسکے ساتھ ہے (گو ان کو فیصلہ سازی میں کوئی اختیار نہیں) تو یہ جماعت، یہ تحریک اپنے اوپر سوار نااہلیت کے باوجود زندہ ہے۔ کوئی اور جماعت ہوتی تو ابھی تحلیل ہو چکی ہوتی۔

اس تنظیم کا تیسرا دور سن دو ہزار آٹھ کے بعد شروع ہوتا ہے جس میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ اسکے کارکنان پچھلے دور کی فضولیات کو سمجھنے لگے ہیں۔ وہ اس بوجھ سے جان چھڑا کر نئے چہرے کے ساتھ بہتر طریقے سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں مگر بدقسمتی سے پچھلا دور اتنا طویل تھا کہ اسکی تاریکی سے جان چھڑانا مشکل ہو رہا ہے۔ تاہم ایک ذہنی کشمکش، ایک عملی کوشش نظر ضرور آتی ہے۔

مجھے اس تیسرے دور کے کارکنان سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ ہیں کیونکہ سوشل میڈیا نے انکو اسلام، سماجیات، سیاسیات سمیت بہت سے شعبوں اور زندگی کے پہلوؤں سے آشنا کیا ہے جس کا پہلے امکان نہیں تھا۔

دیکھتے ہیں موجودہ دور والے بہتری کا سفر جاری رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟

از ڈاکٹر سلطان محمود

میر اسید مودودیؒ سے تعلق اور ملاقاتیں 1969 ہی میں شروع ہو گئی تھیں اور پھر کالج لائف ہی سے جماعت اسلامی کے دارالمطالعہ میں تواتر سے آنا جانا رہا۔ خیر پھر یونیورسٹی میں جمعیت کی طرف سے الیکشن لڑ کر جیتا بھی۔ مگر 1981 کے آتے آتے میں خود جماعت اور جمعیت سے بد ظن ہو گیا اور علیحدگی اختیار کر لی اسی دوسرے دور کے اکابرین جمعیت کی دو عملی اور مفاد پرستی کی وجہ سے۔ گو کہ کچھ عرصہ امریکہ میں پھر جماعت کے قریب ہو گیا مگر میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اس جیسی منظم جماعت کوئی نہیں۔ دوسروں کو قریب لانے میں بے لچک ہونے کے باعث اسکی سٹریٹ پاور کبھی بھی نہ بن سکے گی۔

طاہر القادری کے متبادل مولانا

از ڈاکٹر سلطان محمود

20 اکتوبر 2019

اب فوج سے رخصتی کی بناء پر فضل الرحمان دوسرے طاہر القادری ہونگے۔ چونکہ جاہل عوام اکثریت میں ہے اور ان کو قابو کرنے کی master key مذہبی کارڈ ہے اس لئے اس کو کسی نہ کسی ہاتھ میں تھمانے کا بندوبست رکھنا بے حد ضروری ہے۔ اب طاہر القادری کی سیاست سے ریٹائرمنٹ کے بعد سب سے مناسب ہاتھ فضل الرحمان ہی کا ہے۔ انکے 90 لاکھ مریدین تھے تو انکے بھی دس بیس لاکھ سے کم نہیں۔

مولانا کی پہلی پہلی ڈیوٹی محض دو نکاتی اور بے حد آسان ہے۔ پہلا نکتہ کشمیر معاملے پر حکومت اور فوج کی مدد کرنا ہے تاکہ اس واقعے کو غیر محسوس طریقے سے عوام کی زبان سے نکال کر پس پشت ڈالا جاسکے۔ دوسری ٹاسک عمران کو دکھانا ہے کہ بھئی آپ حکومت میں کلیدی طاقت کے حامل نہیں لہٰذا اگر پر پرزے نکالنے کو دل کرے تو مولانا سے ہم کچھ بھی کرا سکتے ہیں۔

اب مولانا کا پچھلے ہفتے تک مکاہرہ گرام فائنل ہو گیا ہے عمران حکومت سے۔ اب دھرنا نہیں ہو گا۔ دوروزہ نمائشی احتجاج ہو گا۔ ان کے پٹھے ڈنڈا نہیں چلائیں گے اور حکومتی چمچے تشدد پر نہیں اکسائیں گے۔ نہ کوئی قتل نہ زخمی۔ دونوں اطراف سے گیدڑ بھبھکیاں ہونگی۔ اور پھر عوام کا ناک میں دم کرنے کے بعد باعزت گھر واپسی۔

فیس کے طور پر ان کو بدلے میں مدارس پر نرم ہاتھ کا تحفہ ملے گا۔ ان کے خاندان کی لوٹ کھسوٹ پر انگلی نہیں اٹھائی جائے گی۔ احتجاج کے بعد زرداری اور نواز شریف کے دیئے گئے خرچے میں سے جو بچ جائے وہ بھی مولانا کا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انکو کشمیر کمیٹی کا دوبارہ چیئرمین بنا دیا جائے۔ دیکھتا جا شرماتا جا۔

سموگ پر میڈیا کوبریفنگ

از ڈاکٹر سلطان محمود، مینیجنگ ڈائریکٹر
ایکوکیئر کنسلٹینسی سروسز (ECCS) پرائیویٹ لمیٹڈ

لاہور، 6 نومبر 2019

کل ہواؤں کا رخ چندی گڑھ بھارتی پنجاب سے لاہور و سیالکوٹ کی جانب تھا اور پھر وہاں سے سرینگر۔ اطلاعات کے مطابق اس روٹ پر کسانوں نے فصلوں کی باقیات کو آگ لگا رکھی ہے جس سے دہلی اور لاہور میں سموگ پیدا کرنے والی آلودگی کا درجہ خطرے کو چھ گنا تک بڑھا رہا ہے۔ کل لاہور کی فضائی آلودگی محفوظ 70 پوائنٹ کی بجائے 454 تھی۔ یورپ میں 200 پوائنٹ سے اوپر آلودگی چلے جانے کی صورت میں سائرن بجائے جاتے ہیں۔

سموگ دھوئیں (smoke) اور دھند (fog) کے ملاپ کو کہتے ہیں جس میں موسم سردی کے آغاز یا خزاں (20 اکتوبر تا 10 جنوری) میں زمین پر پیدا ہونے والی آلودگی مثلاً دھواں، گرد، جراثیم وغیرہ فضا کی بالائی سطح پر موجود جمے ہوئے مائع (دھند) کے باعث رستہ نہ ہونے کے باعث محدود جگہ پر معلق رہتی ہے اور اگلے پچھلے موسموں کی طرح ہوا میں تحلیل نہیں ہو پاتی لہٰذا سانس کے ذریعے پھیپھڑوں نیز آنکھوں کو شدید نقصان پہنچاتی ہے۔

امریکہ، جاپان و چین وغیرہ میں ایسے حالات میں بچوں کے سکول بند کر کے انہیں گھر سے باہر بھی نہیں نکلنے دیا جاتا۔ اور گھر سے باہر جانے والے تمام لوگ ماسک کا استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان میں

سموگ والا مدتوں سے ہوتا چلا آرہا ہے مگر فضائی آلودگی ناپنے والے آلات کی غیر موجودگی نے ہمیں وہ شعور نہیں دیا تھا جو حالیہ برسوں میں ہمیں ملا ہے اور ہم پریشان سا رہنے لگ گئے ہیں۔ سچ ہے کہ ہم جیسے غریب ممالک میں شعور کا آجانا بھی ہمیں ذہنی دباؤ میں مبتلا کر دیتا ہے کیونکہ ان علتوں سے بچنے کا ہمارے ہاں انتظام نہیں۔ اب چونکہ ان آفات کا علم ہو چکا ہے اس لئے سب لوگ خصوصاً بچے باہر نکلتے وقت ماسک لگائیں۔ دن میں زیادہ سے زیادہ پانی پئیں۔ اور دن میں بار بار آنکھوں کو دھوئیں۔ نیز سفر کرتے وقت عینک یا لینز لگائیں۔

سموگی لاہور

میں نے سوشل میڈیا پر کبھی بھی اپنی کسی پوسٹ کو لائیک یا شئیر کرنے کی درخواست نہیں کی۔ لیکن لاہور سمیت پنجاب کے مختلف شہروں کا موجودہ دگرگوں سموگ دیکھ کر اور آنے والوں سالوں میں زیادہ شدید ماحولیاتی تباہ کاریاں کی پیشگوئی کے پیش نظر التماس کرتا ہوں کہ مندرجہ ذیل مضمون کو جس حد تک بھی شئیر کرسکتے ہوں ضرور کریں۔ کیونکہ صرف 2017 کے سموگ سے ایک سال کے اندر اندر چار لاکھ انسانوں کے ہلاک ہو جانے کا واضح امکان ہے (ڈاکٹر سلطان محمود، ماحولیاتی مشیر، حکومت پنجاب)

سموگ کا آغاز لندن سے ہوا تھا، لوگ 5 دسمبر 1952ء کی صبح اٹھے تو شہر گہرے سیاہ دھوئیں میں ڈوب چکا تھا، ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دے رہا تھا، حد نظر صفر ہو چکی تھی، گاڑیاں گاڑیوں کو نظر نہیں آرہی تھیں، ٹرین ڈرائیور پٹڑی نہیں دیکھ پا رہے تھے، پائلٹس کو رن وے نظر نہیں آرہا تھا اور بچے والدین اور میاں بیوی ایک دوسرے کو دکھائی نہیں دے رہے تھے، پورا شہر دھند میں گم تھا، شام کے وقت پتہ چلا یہ دھند دھند نہیں یہ عذاب ہے، یہ گاڑھا سیاہ دھواں ہے، یہ دھواں اگلے دن چار ہزار لوگوں کی جان لے گیا، لوگ کھانس کھانس کر دم توڑنے لگے، لندن کی سماجی زندگی رک گئی، ٹریفک بند ہو گئی، ٹرینیں معطل ہو گئیں۔ فلائٹس منسوخ ہو گئیں۔

دفتروں اور اسکولوں میں چھٹی ہو گئی، شاپنگ سینٹرز بند ہو گئے اور لوگوں نے گھروں سے باہر نکلنا ترک کر دیا، شہر میں سناٹا تھا، یہ سناٹا ایمبولینسز کی آوازوں سے پنکچر ہوتا تھا، قبرستان بھر چکے تھے

اور اسپتالوں میں مردے اور بیمار دونوں ایک بیڈ پر پڑے تھے، یہ عذاب پانچ دن جاری رہا، نو دسمبر کی رات بارش شروع ہوئی اور فضا آہستہ آہستہ دھل گئی لیکن اموات کا سلسلہ جاری رہا۔

دسمبر کے آخر تک لندن کے بارہ ہزار لوگ انتقال کر چکے تھے جب کہ ڈیڑھ لاکھ لوگ دمے، آشوب چشم، ٹی بی اور نروس بریک ڈاؤن کا شکار تھے، ماحولیات کے ماہرین نے تحقیقات شروع کر دیں، پتہ چلا 5 سے 9 دسمبر کے دوران لندن کی فضا میں روزانہ ہزار ٹن اسموک پارٹیکلز پیدا ہوتے رہے، ان میں 140 ٹن ہائیڈروکلورک ایسڈ، 14 ٹن فلورین کمپاؤنڈ اور 370 ٹن سلفر ڈائی آکسائیڈ شامل ہوتی تھی، یہ تمام مادے صحت کے لیے انتہائی مضر تھے۔

ماہرین نے سوچنا شروع کیا،، یہ تمام پارٹیکلز آئے کہاں سے تھے،، پتہ چلا یہ ساڑھے سات سو سال کی غلطیوں کا دھواں ہے، یہ سلسلہ 1200ء میں شروع ہوا تھا، ساڑھے سات سو برسوں میں لندن کی آبادی میں دس گناہ اضافہ ہو گیا، جنگل کٹ گئے، ندیاں اور جھیلیں ختم ہو گئیں، گاؤں دیہات شہر میں آ گئے، کھیت کھلیانوں کی جگہ ہاؤسنگ سوسائٹیاں بن گئیں، صنعتی انقلاب آیا، شہر میں ہزاروں فیکٹریاں لگ گئیں، بجلی ایجاد ہوئی، کوئلے سے چلنے والے پاور پلانٹ لگ گئے، ٹرین سروس شروع ہوئی، ٹرام آئی، گاڑیاں آئیں، تعمیرات شروع ہوئیں۔

دوسری جنگ عظیم نے بھی دھواں اڑایا اور آخر میں لوگ بھی آلودگی پھیلانے لگے چنانچہ لندن کی فضا آلودہ ہوتی چلی گئی، ہوا میں آکسیجن کم ہو گئی، یہ سلسلہ چلتے چلتے 1952ء تک پہنچ گیا، سردی شروع ہوئی، لوگوں نے اپنی انگیٹھیوں میں کوئلہ جلایا، لاکھوں ٹن دھواں پیدا ہوا، یہ دھواں ساڑھے سات سو سال کی آلودگیوں میں،، مکس اپ،، ہوا، دسمبر کی دھند میں ملا اور گہری، دبیز اور سیاہ گیس میں تبدیل ہو گیا اور یہ گیس پانچ دن شہر کے اندر گھومتی پھرتی رہی، ماہرین نے اس دھند

کو اسموک اور فاگ دو لفظ ملا کر ”اسموگ“ کا نام دے دیا اور لندن کے اس ”سانحے کو گریٹ اسموگ آف لندن“ قرار دے دیا۔

ماحولیات کے ماہرین نے اسموگ کی تشخیص کر لی، اب علاج کی باری تھی، علاج کی ذمے داری کنزرویٹو پارٹی کے ایم پی سر گیر الڈ ڈیوڈ نے لی، یہ شریف خاندان کی طرح بزنس مین اور کارخانے دار تھے، یہ 1950ء میں سیاست میں آئے، یہ گریٹ اسموگ آف لندن کے دنوں میں ہاؤس آف کامنز کے تازہ تازہ رکن بنے تھے، یہ اٹھے اور لندن کی فضا کو صاف کرنے کا پلان بنانا شروع کر دیا۔

یہ ماہرین کے ساتھ مل کر چار سال منصوبہ بندی کرتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے 1956ء میں ،، کلین ائیر ایکٹ،، بنالیا، یہ ایکٹ ہاؤس آف کامنز میں پیش ہوا اور ایوان نے 5 جولائی 1956ء کو اس کی منظوری دے دی، یہ ایکٹ چھ بنیادی اصلاحات پر مشتمل تھا، حکومت نے شہر کے اندر کوئلے کے استعمال پر پابندی لگا دی، عوام کو،، فائر پلیس،، کے لیے متبادل ذرایع فراہم کرنے کا اعلان کر دیا گیا، حکومت نے ایک سال میں یہ ذرایع فراہم کر دیے، ماڈرن ہیٹنگ سسٹم اسی ایکٹ کی پیداوار تھا۔

سردیوں میں بجلی بھی سستی کرنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ لوگ بجلی کے ذریعے گھر گرم کر لیں، حکومت نے شہر کے اندر فیکٹریاں بند کر دیں، مالکان کو شہر سے دور مفت جگہ بھی فراہم کی گئی، ٹیکس میں گنجائش بھی اور فیکٹریاں شفٹ کرنے کے لیے قرضے بھی دیے گئے، بجلی کے تمام پلانٹس دو برسوں میں لندن سے دور جنگلوں میں منتقل کر دیے گئے۔

لندن اور لندن کے اطراف میں درخت کاٹنا، زرعی زمینوں کے اسٹیٹس میں تبدیلی اور گرین ایریاز کے خاتمے پر پابندی لگا دی گئی، ملکہ تک کو درخت کاٹنے سے قبل تحریری اجازت کا پابند بنا دیا گیا اور

پبلک ٹرانسپورٹ میں اضافے، پرائیویٹ گاڑیوں کی حوصلہ شکنی اور پٹرول کے معیار کو بلند کرنے کا فیصلہ کیا گیا، ہاؤس آف کامنز نے ان اصلاحات کی منظوری دی، حکومت نے کام شروع کیا اور ایکٹ کی منظوری کے صرف چار سال بعد 1960ء میں لندن کی فضا مکمل طور پر،، اسموگ فری،، ہو گئی، یہ ایکٹ اس قدر مکمل اور سخت تھا کہ سر گیر الڈ ڈیوڈ کو خود اس کا نقصان اٹھانا پڑا، ان کی اپنی فیکٹریاں بھی لندن سے باہر منتقل ہوئیں۔

ہم اب گریٹ اسموگ آف لندن سے گریٹ اسموگ آف لاہور کی طرف آتے ہیں، پنجاب پچھلے تین برسوں سے شدید اسموگ کا شکار چلا آ رہا ہے، نومبر کے مہینے میں لاہور، بہاولنگر، پاکپتن، فیصل آباد اور ٹوبہ ٹیک سنگھ زہریلی دھند میں گم ہو جاتے ہیں، پنجاب اس بار بھی اسموگ میں دفن ہے، ہماری فضا میں اگر 80 مائیکرو گرام زہریلے مادے ہوں تو ہمارے پھیپھڑے انھیں برداشت کر جاتے ہیں لیکن لاہور اور اس کے مضافات میں اس وقت آلودگی کی شرح 200 مائیکرو گرام کیوبک میٹر ہے۔

ہم اگر فضا کا ٹیسٹ کریں تو ہمیں اس میں کاربن مانو آکسائیڈ، سلفر اور نائیٹروجن کی بھاری مقدار ملے گی، یہ تمام مادے زہر ہیں، لاہور کی فضا میں تین سو سے چار سو فٹ تک آکسیجن کی شدید کمی بھی ہے، یہ فضا کتنی مضر صحت ہے آپ اس کا اندازہ سگریٹ سے لگا لیجیے، ہم اگر روزانہ 50 سگریٹ پئیں تو ہمارے پھیپھڑوں کو اتنا نقصان ہو گا جتنا لاہور کی فضا میں ایک دن سانس لینے سے ہو رہا ہے، بھارت ہم سے بھی بری صورتحال کا شکار ہے، بھارت میں 2012ء میں اسموگ کی وجہ سے پندرہ لاکھ لوگ مر گئے، لاہور میں بھی اس سال چار لاکھ لوگ متاثر ہوئے ہیں، یہ لوگ 2018ء کے دوران انتقال فرما جائیں گے۔

یہ اسموگ کہاں سے آرہی ہے، یہ سوال بہت اہم ہے، اس کے چار بڑے سورس ہیں، پہلا سورس بھارتی پنجاب کا شہر ہریانہ ہے، ہریانہ میں دس سال میں چاول کی فصل میں آٹھ گنا اضافہ ہوا، ہریانہ کے کسان اکتوبر کے آخر میں چاول کے پودے کے خشک ڈنڈل اور خالی سٹے جلاتے ہیں، بھارتی کسانوں نے اس سال 3 کروڑ 50 لاکھ ٹن ڈنڈل جلائے، ڈنڈلوں کے دھوئیں نے دہلی سے لے کر لاہور تک پورے پنجاب کی مت مار دی، دو، لاہور کی فیکٹریوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، یہ فیکٹریاں دھواں پیدا کر رہی ہیں، تین، حکومت نے لاہور کے گرد و نواح میں درجن کے قریب بڑے پاور پلانٹس لگائے، بجلی کا ایشو ختم ہو گیا لیکن فضا آلودہ ہو گئی اور چوتھا سورس گاڑیاں ہیں، لاہور شہر میں دس لاکھ گاڑیاں ہیں، ہمارے پٹرول کا معیار انتہائی پست ہے چنانچہ یہ گاڑیاں چلتا پھرتا اسموگ ہیں، ان چاروں سورسز کے علاوہ بھی سورسز ہیں۔

لاہور میں ٹائروں کو جلا کر تاریں اور تیل حاصل کیا جاتا ہے، شہر میں ٹائر جلانے والے سیکڑوں احاطے ہیں اور سیالکوٹ ریجن میں بھی اس موسم میں مونجی کی باقیات جلائی جاتی ہیں، لاہور کی آبادی بھی پھیل رہی ہے، مضافات میں جنگل، کھیت اور کھلیان بھی ختم ہو رہے ہیں اور دیہات بھی، آپ لاہور کے گرد ہاؤسنگ سوسائٹیوں کا ڈیٹا نکال کر دیکھ لیجیے، آپ سرپیٹ کر رہ جائیں گے۔

یہ ان سوسائٹیوں کا کمال ہے، ہم اب سبزیاں، پھل اور اناج بھی چین سے امپورٹ کر رہے ہیں، ہم امرود، تربوز، آڑو، کینو اور آم بھی درآمد کر رہے ہیں چنانچہ لاہور تیزی سے اسموگ میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ ہمیں ماننا ہو گا ترقی انتہائی اہم ہے، ہمیں یہ بھی ماننا ہو گا میاں شہباز شریف نے پنجاب کے لیے بے تحاشہ کام کیا، لاہور اس وقت ملک کا خوبصورت اور ترقی یافتہ ترین شہر بن چکا ہے، پنجاب میں انگریز کے بعد پہلی مرتبہ اتنے بڑے پیمانے پر ترقیاتی کام ہوئے۔

ہمیں بہر حال میاں شہباز شریف کو اس کا کریڈٹ دینا ہو گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے ترقی کا جھنڈا لاشوں پر نہیں لگا کرتا، پنجاب اگر اس ترقی کے ہاتھوں بیمار ہو گیا یا لوگ اگر مرنا شروع ہو گئے تو یہ ذمے داری بھی بہر حال میاں شہباز شریف کے کندھوں پر جائے گی چنانچہ میری درخواست ہے پنجاب حکومت فوری طور پر کلین پنجاب کمیشن بنائے، فضائی آلودگی کی وجوہات تلاش کرے، اصلاحات کرے، اسمبلی سے منظوری لے اور لاہور کو لندن کی اسپرٹ سے صاف کرنا شروع کر دے۔

لاہور اور اس کے گرد و نواح میں اصلی شجر کاری کرائے، فیکٹریاں باہر شفٹ کرائے، گاڑیوں کی تعداد کنٹرول کرے، پٹرول کا معیار بہتر بنائے، کوڑا، ٹائر اور کوئلہ جانے پر پابندی لگائے اور درخت کاٹنے کی سزا متعین کرے، حکومت کلین ائیر لندن ایکٹ سے بھی مدد لے سکتی ہے اور یہ بھوٹان ماڈل کو بھی اسٹڈی کر سکتی ہے، یہ بھارتی حکومت کے ساتھ مل کر دھان کی باقیات جلانے پر بھی پابندی لگا سکتی ہے اور یہ بچوں کے سلیبس میں ماحولیات کا مضمون بھی متعارف کرا سکتی ہے، یہ اقدامات ضروری ہیں ورنہ دوسری صورت میں پنجاب بالخصوص لاہور ایک ترقی یافتہ قبرستان بن جائے گا اور اورنج لائین ٹرین مردے ڈھونے کے کام آئے گی۔

کیا میاں شہباز شریف یہ پنجاب چاہتے ہیں؟

نواز شریف کا ملکی سیاست سے دائمی اور طبی فرار

از ڈاکٹر سلطان محمود

18 نومبر 2019

نواز شریف کل عارضی طور پر امریکہ مگر پاکستان سے ہمیشہ کیلئے روانہ ہو جائیں گے۔ اس وقت کا سچ یہی ہے کہ ایک خاص پلان کے تحت حکومت، نواز شہباز اور طاقت کے مراکز کی رضامندی سے انہیں دل و بلڈ پریشر کی ایسی محفوظ دوائیں دی گئیں جن سے مصنوعی اور عارضی طور پر ان کے پلیٹلیٹس کم کئے گئے اور پھر اس فیکٹر کو میڈیا میں خوب اچھال کر عوام کو نفسیاتی طور پر بلیک میل کیا گیا تا کہ جب نواز ڈیل کر کے بھاگے تو سٹوری سچی لگے۔ ہم وہ بدقسمت اور جاہل عوام ہیں کہ جنہیں نہ حکومت، نہ اپوزیشن اور نہ ہی طاقت کے مراکز سچ بتانا گوارا کرتے ہیں اور ہمیں محض افواہوں اور سازشی تھیوریوں کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ گمان غالب ہے کہ جب شہزاد اکبر اور ملک ریاض نے ڈیل کرائی تو یہ ساری جزئیات طے کی گئیں۔ اس قومی ڈرامے میں چونکہ ہر ادارہ شامل ہے مگر نشانے پر عدلیہ کو لیا گیا ہے اس لئے عوام کو کبھی سچ کا پتہ نہ چلے گا۔ عمران کی حکومت میں نواز واپس نہ آئے گا اور عدالتیں اس کو مجرم قرار دیکر دائیں بائیں ہو جائیں گی اور نواز کہیں باہر ہی مر کھپ جائے گا مگر پلیٹلیٹس کی کمی سے نہیں بلکہ اپنی طبعی عمر پوری ہونے تک لندن میں موجیں مارے گا۔ رہا اس کا ضامن شہباز تو وہ واپس آئے گا اور سکرپٹ کے مطابق طاقت کے مراکز کا چمچہ بن کر بغیر مریم کے نون لیگ کو سٹیٹس کو کی جماعت کے طور پر زندہ رکھے گا۔

ہمیں اس سارے ڈرامے کو عالمی تناظر سے جدا کر کے کبھی نہیں دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ طبی ڈرامہ ہماری خارجہ پالیسی کی تبدیلی کا اشارہ ہے اور ہمیں جتنی مشکلات آ رہی ہیں وہ امریکی کو کھ سے سیزیرین کے ذریعے نکلنے کے سبب ہیں۔ اب ہم چینی کیمپ میں چلے گئے ہیں لہٰذا نواز لیگ اور زرداری لیگ کی ہمیشہ کے لئے چھٹی ہوتے ہوتے صرف اس لئے رہ گئی ہے انہوں نے کمال ہوشیاری سے علی الترتیب شہباز اور بلاول کو آگے کیا ہے تاکہ اس جاہل قوم پر کبھی پھر سے حکومت کر سکیں۔

میرے خیال سے اب طاقت کے اصل مراکز بھی پسپا ہونے کو ھیں صرف مسئلہ کشمیر کے حل ھونے کی دیر ھے اور اگلے چند برسوں تک ملک میں صدارتی نظام لاگو ہو جائے گا۔

میرے نزدیک اس وقت تک کا سچ یہی ہے۔

تقسیم کرو اور حکومت کرو Divide and Rule

از ڈاکٹر سلطان محمود

6 دسمبر 2019

زرداری و شریف خاندان کی اصل گندگی یہ ہے کہ انہوں نے تمام پاکستانی اداروں کے اندر حرامی مافیا داخل کیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ بروقت ان چوروں کے ہاتھ روک دیئے گئے ورنہ یہ ہمیشہ اقتدار میں رہنے کے لئے آرمی کے اندر بھی سرمایہ کاری کر رہے تھے۔

رہ گئے ان کے احمق حامی تو ان کو سردست احمق ہی کہہ دینا کافی ہے کیونکہ ان کی اکثریت ان پڑھ و جاہل ہے جن بے چاروں کو ان عفریتوں کی ریشہ دوانیوں کی خبر ہی نہ تھی۔ ہاں ان کے اندر مٹھی بھر پڑھے لکھے بھی ہیں جو اکثر سوشل میڈیا پر ان کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں مگر ان کی اکثریت ایسے مفاد پرستوں پر مشتمل ہے جن کی پہنچ اس مافیا کے ٹٹووں اور کن ٹٹوں تک تھی اور انہوں نے بھی عوام کو لوٹنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ ان میں وہی زیادہ ڈھیٹ ہیں جن کو ان پارٹیوں کے کن ٹٹوں نے سوشل میڈیا پروپیگنڈے کے لئے خرید رکھا ہے۔

اس بات سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ زرداری و شریف مافیا نے اداروں کی طرح عوام کو بھی تقسیم کر دیا ہوا ہے۔ یہی لوگ زیادہ سرگرم بھی ہیں لیکن یاد رکھیں یہ صرف تب تک نونی و پپلی رہیں گے جب تک یہ دوبارہ کسی سماج دشمن کیساتھ مل کر اپنے چولہے گرم نہیں کر لیتے۔

اس مفاد پرست طبقے کی سوشل میڈیا پر نوحہ خوانی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو یقین ہو چلا ہے کہ عمرانی دور میں شاید ان کو عوام کے استحصال کا موقع نہ ملے گا اسی لئے یہ موجودہ حکومت کے خلاف کسی بھی سچے جھوٹے پروپیگنڈے سے باز نہیں آتے۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کے احتجاج میں دن بدن کمی واقع ہو رہی ہے کیونکہ عوام میں بحیثیت مجموعی سیاسی شعور کی سطح بلند ہو رہی ہے اور خصوصاً نوجوان ایسے احمقوں کے منہ پر مسلسل تھوک رہے ہیں۔ یاد رکھیں جس دن عمران نے ان احمقوں کو ہڈی ڈال دی یہ اپنے باپ نواز شریف وزرداری کو پلک جھپکنے میں بھول جائیں گے۔

پولیس گردی

از ڈاکٹر سلطان محمود

6 دسمبر 2019

دن دیہاڑے علی الاعلان مسلح ڈاکہ ڈالنے والی ہماری پولیس محافظ کی بجائے لٹیرے کا کردار ادا کر رہی ہے۔ دراصل پولیس کا محکمہ دو طرح کے طبقات پر مشتمل ہے۔ ایک نچلا یعنی ایس ایچ او تک کا طبقہ اور دوسرا اے ایس پی سے لیکر اوپر تک کا۔ اکا دکا چھوڑ کر زیادہ تر نچلا طبقہ گاؤں کی سطح کے غریب اور ان پڑھ خاندانوں سے براہ راست بھرتی ہو کر آتا ہے جبکہ اوپر والے شہری اور امیر خاندانوں کے سی ایس ایس کر کے پڑھے لکھے افراد پر مشتمل لوگ ہیں۔ پولیس کے نچلے طبقے کی تنخواہ اور مراعات ناقابل یقین حد تک کم ہیں مگر ساری محنت ان ہی کو کرنا پڑتی ہے۔ ذرا سوچیں کہ اگر ہمارے پاس اختیارات ہوں مگر ہم ہر لمحہ مصروف بھی ہوں ہر بات کے ذمہ دار بھی ہوں مگر ساتھ ساتھ ہر لمحہ غربت اور تضحیک کی دلدل میں بھی اتر رہے ہوں تو کیا ہم اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہ کرینگے؟ لہٰذا اگر انہی حالات میں میں یا آپ ہوں تو یقین کریں ہم بھی ویسے ہی عوام کا برا حال کر کے مال بنائیں جیسا کہ یہ طبقہ کرتا ہے۔ اس طبقے کو چونکہ سیاست زدہ بھی کر دیا گیا ہے اس لئے ہر لمحے عوام کا جان، مال اور عزت خطرے کی حالت میں رہتے ہیں۔ یہی طبقہ اپنی نگرانی میں جوئے خانے، قحبہ خانے، سمگلنگ، چور بازاری، قبضے، بدمعاشی و ہر طرح کی دیگر بداخلاقیوں کا محافظ ہے حتی کہ سائیکل چوری جیسی معمولی وارداتوں میں بھی گھٹنے گھٹنے ملوث ہوتا ہے۔

اب آئیں پولیس کے اوپری طبقے کی جانب۔ یہ کھاتے پیتے خاندانوں کے چشم وچراغ ہونے کے ناطے، عوام سے دور ہونے کے سبب اور اوپر سے مکمل سیاست زدہ ہونے کی وجہ سے صرف تین کام کرتے ہیں۔ طاقتوروں سے قربت رکھتے ہیں، بلا ضرورت مال بناتے ہیں نیز اپنے محکمے کے ہی نچلے طبقے سے سلیوٹ اور احکامات کی فوری بجا آوری کرواتے ہیں۔ نہ تو انکو عوامی مسائل کا درست ادراک ہوتا ہے اور نہ یہ محنت کرنا ہی چاہتے ہیں۔ یہ مال پانی اپنے نچلے طبقے کی وساطت سے نیز جاگیرداروں و سرمایہ داروں کی قربت سے بناتے ہیں اور اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ عوام کے اندر زیادہ ڈسکس نہ ہوں۔

اب آیئے مندرجہ ذیل تین وڈیوز کی جانب۔ پولیس کے نچلے طبقے نے دن دیہاڑے غریب پھیری والے کو علی الاعلان لوٹا، عوام نے سوشل میڈیا کی طاقت سے وزیر اعظم پورٹل پر شکایت درج کرا دی اور پھر پولیس کے اوپری طبقے نے زیادہ ڈسکس نہ ہونے کی خواہش میں ریڑھی والے کی شکایت کا ازالہ کر دیا۔

ذہن میں رکھیں کہ ایسا ازالہ عموماً بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔ ہماری غریب شہری و دیہاتی زندگی روزانہ کی بنیاد پر کس عذاب سے دوچار ہے اس کا میں اور آپ شاید اندازہ بھی نہ لگا پائیں۔

ایک خاندان ایک بچہ

از ڈاکٹر سلطان محمود

12 دسمبر 2019

" ایک خاندان ایک بچہ " کی سخت پالیسی لاگو کر کے تیز ترین معاشی رفتار اپنائی جائے ورنہ گہرے گڑھے میں گرنے کی تیاری پکڑ لیں۔ چین نے بھی اپنی آبادی پر قابو پانے کے لئے یہ پالیسی اپنائی تھی۔

ہمارے پاکستانی بھائی بڑے جذباتی ہیں۔ زمینی حقائق کو نظر انداز کر کے اندھا دھند اسلام اسلام کرتے رہتے ہیں۔ در حقیقت ہمارے قومی انحطاط کی وجہ قومی وسائل کی تلاش اور استعمال میں کوتاہی اور آبادی کا بے ہنگم پھیلاؤ ہے۔ قرآن پر تحقیق اور اجتہاد کے دروازے بند ہونے کے سبب اپنے دماغ کو تکلیف نہ دینے والے دوستوں کو اس دنیا رنگ و بو میں ترقی پسندانہ تجاویز پر اعتراض ہوتا ہے۔

حالیہ تاریخ میں چین کی ترقی سے بہتر کوئی مثال موجود نہیں۔ اس نے مندرجہ بالا دونوں اقدام بیک وقت اٹھا کر آدھی دنیا کو فتح کر لیا ہے اور پہلی منزل حاصل ہوتے ہی دوسرا بچہ پیدا کرنے کی اجازت دیدی۔ بھٹو جب ماوزے تنگ سے ملے اور ان کے مستقبل کے بارے میں سوال کیا تو ماوزے تنگ نے اپنی میز کی دراز سے چینی ترجمے والا قرآن کریم دکھایا۔ اور آج چین کا پھیلاؤ اسی قرانی تعلیمات کے بل پر ہے۔

ہمارے ملاں محنت کے عادی نہیں اور آبادی پر قابو کے بھی خلاف ہیں۔ بس انہوں نے پوری قوم کو نیم جاہل بنا رکھا ہے اور بے مغز عوام اجتہاد کے دروازے بند ہونے کے باعث پھر بھی انہی کی بات کے زیر اثر رہتی ہے۔

ہمیں یا تو چین کی نقل کرنی چاہئیے یا ملا کو پرے کر کے براہ راست قرآن کی روح بحال کر کے اسے پکڑ لینا چاہئیے۔ ورنہ اس صدی کے نصف کے بعد اپنا وجود کھو دینے کی تیاری کر لینی چاہئیے۔

بارہ وفات سے عید تک کا سفر

از ڈاکٹر سلطان محمود

انسانی فطرت میں بڑائی اور لڑائی کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی ہے اس لئے شخصی اور اجتماعی طور پر ہم دوسروں سے ممتاز نظر آنا چاہتے ہیں۔ جس طرح آپ سید، چودھری اور میں ڈاکٹر کہلوانا چاہتا ہوں۔ بعینہ آزادی سے قبل حضرت عیسیٰؑ کے جنم دن کو جب انگریز شان سے مناتے تھے اور ہندو بھولے رام (ایشور) کے شان و شوکت سے جلوس نکالتے تھے تو اس وقت مسلمان اپنی شناخت اونچی ثابت کرنے کے لئے شیعہ سنی مل کر عاشورہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زور شور سے جنم دن مناتے تھے۔ پھر اپنا پاکستان الگ ہوا تو ہندو اور عیسائی سے مقابلہ ختم کر کے ہم نے آپس میں فرقے کی بنیاد پر بڑائی ثابت کرنے کے لئے لڑائی شروع کر دی۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ آزادی کے بعد دس بیس برس تک عاشورہ اور میلاد النبی شیعہ اور سنی مل کر مناتے رہے۔

پھر بد قسمتی سے یوں ہوا کہ شیعہ کے پیچھے ایران اور وہابی کی پشت پر سعودیہ کا مال لگنا شروع ہوا۔ اب ہم آپس کی مسابقت میں قعر مزلت میں جا ڈوبے۔ اور عاشورہ اور میلاد النبی الگ الگ منایا جانے لگا۔ پھر ان رسومات میں دشمن شدت لاتا رہا۔ اور شیعہ اور وہابی ایک دوسرے کا خون کرتے رہے۔ مال لگتا رہا اور پاکستان کے احمق مسلمان خون خون ہوتے رہے۔

پھر اچانک سعودیہ نے عرب سپرنگ سے اپنے خاندان کو محفوظ کرنے کے لئے پاکستان میں وہابیوں کے ساتھ ساتھ سنیوں کو بھی دانہ ڈالنا شروع کیا تو ہم بد بخت پاکستانی مسلمانوں کو خیال دیا گیا کہ سنی

اکثریت کی بنا پر سوادِ اعظم ہیں۔ اب دوڑ لگی کہ جلدی سے کسی مذہبی تہوار پر اپنا فرقہ ورانہ قبضہ منوالو مبادہ کہیں مذہبی دوکانداری اور کاروبار ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ لہٰذا پہلے ہلکی پھلکی رسم بارہ وفات سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جنم دن پر خالص کاروباری انداز میں چھینا جپٹی ہوئی۔ اور بڑی سرعت سے پہلے تو اس مبارک جنم دن کو عید کا غیر شرعی اور غیر تاریخی لقب دیا گیا۔ پھر اس ٹائٹل کو وہابیوں، شیعوں اور دیوبندیوں سے چھین کر سوادِ اعظم بریلویوں کی چھاپ تلے لایا گیا۔ اور اس "مقصد عظیم" کو حاصل کرنے کے لئے بدبخت فرقہ باز غیر ملکی فنڈنگ سے پیدا شدہ 24 لاکھ مدرسہ طالبان وقتاً فوقتاً میدان کفر میں اتارتے رہے کبھی ناموس رسالت کے نام پر اور کبھی بھارت اسرائیل روس اور امریکہ کے نام پر اور کبھی محض عرسوں کے نام پر۔ لیکن ہر بار کمان غیر ملکی فنڈ کھانے والے "علماء" کے ھی ہاتھ میں رہی۔

اس سال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر غیر شرعی تہوار کو عید کا نام دینے والوں نے ایک ایسی منظم دھاچوکڑی مچائی ہے کہ الامان الحفیظ اس میں نیم شعور رکھنے والے تعلیم یافتہ جوان بھی پاگل پن کی حد تک ملوث ھوگئے ہیں اور سوشل میڈیا کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے سے بہتر مسلمانوں کو آنکھیں دکھا رھے ہیں۔ اس مبارک جنم دن کا نام استعمال کر کے سیاسی پارٹیاں بھی اپنی روائتی نالائقی کے باعث غیر ملکی فنڈنگ کا شکار ھوگئیں اور قادیانیت والے فتنے کو بھی پلاننگ کے تحت مخلوط کر کے عین میلاد النبی کے موقعے پر اپنے ڈرامے کا ڈراپ سین کر گئے۔ اب کسی حد تک اس غیر اسلامی تہوار "عید" پر سنیوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ اب ہمارے اندر عدم برداشت کا فتنہ اتنا غالب آگیا ہے اور مذہبی دوکانداری اتنی مستحکم ھوگئی ہے کہ لگتا ہے اگلے برس سیاسی و مذہبی پارٹیاں دشمنوں سے مال لے کر خاکم بدہن یہاں خانہ جنگی اور وسیع پیمانے پر کشت وخون بھی کرانے سے باز

نہیں آئیں گی اور دینی وسیاسی لحاظ سے جاہل مطلق اور بے شعور احمق مسلمان اس کو بھی جہاد کا نام دینگے۔ شکریہ آپ کا یہاں تک پڑھ لینے کا۔

آزادی کے وقت کی جغرافیائی مجبوری

از ڈاکٹر سلطان محمود

دراصل قیام پاکستان سے قبل ہی مجبوری کے تحت ہزار میل کی دوری پر موجود دو ذمینی ٹکڑوں پر مشتمل، ایک، پاکستان والی سازش کھیلی گئی۔ اور اکیلے قائد اعظم کی مدد کے لئے بکھری ہوئی مسلمان سیاسی جماعتیں اور انکے سر کردہ رہنما اس موضوع پر ایک صفحہ پر نہ آسکے۔ وگرنہ آزادی کے بعد سیاسی داشمندی کا تقاضہ یہ تھا کہ مستقبل قریب میں پیش آنے والی ٹوٹ پھوٹ کی خفت سے بچا جاتا اور شروعات ہی سے مشرقی و مغربی بازووں کو دو الگ مسلم ممالک بنانے کا اعلان کر کے ایک فیڈریشن میں پرو دیا جاتا۔ آزادی کے ساتھ ہی لیاقت علی خان نے قائد اعظم کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے مگر پھر بھی دونوں بازووں کے مشترکہ سیاسی رہنما کا درجہ نہ پا سکے اور اس وقت کی فوجی جنتا کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ اپنے دور میں انہوں نے جغرافیائی طور پر ہزار میل دور واقع دونوں پاکستانی بازووں پر سیاسی دوراندیشی سے کام نہ لیا۔ لہٰذا موقعے کی تاک میں بیٹھا مافیہ پاکستان کے اقتدار پر چھا گیا اور اس نے آتے ہی یہ انتہائی اہم معاملہ حل کرنے کی بجائے قتل کر دیا۔ اور پھر ایک جغرافیائی معاملہ گندی سیاست کی بھینٹ چڑھ کر 1971 میں شکست کی صورت میں برامد ہوا جو کہ ہونا ہی ہونا تھا۔ قیام پاکستان کے وقت ہی سے فوجی اکابرین مشرقی پاکستان کو الگ کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہے۔ لہٰذا وہ اس مسئلے پر جان بوجھ کر مسلسل غلط سیاسی فیصلے کرتے رہے۔ پھر ملکی معاملات آہستہ آہستہ سیاستدانوں کے ہاتھوں سے نکل کر آمروں کے ہاتھ میں چلے گئے۔ بد قسمتی سے یہی کشمکش آج تک جاری ہے۔

نام نہاد شہید ماں اور نانا

از ڈاکٹر سلطان محمود

بلاول کا مشرف پر اپنی ماں کے قتل کا الزام لگانے سے قبل اپنے باپ کو ماں کا بحیثیت قاتل بھول جانا محض ایک سیاسی چال ہے جس کا سبق اس نے یقیناً اپنے باپ ہی سے لیا ہو گا۔ بینظیر کے علاوہ اکبر بگٹی کا قتل بھی تو سیاسی گنا جانا چاہیئے۔ بگٹی کو مشرف نے براہ راست قتل کی دھمکی دی تھی۔ اور وہ قتل ہو بھی گیا۔

بینظیر قتل میں زرداری کے کچھ احکامات اس کے پوری طرح ملوث ہونے کی جانب اشارہ دیتے ہیں۔ مثلاً بینظیر کا پوسٹ مارٹم نہ ہونے دینا، اپنے دور حکومت میں تحقیقات نہ کرانا، مشرف کو گارڈ آف آنر دینا اور ملک سے باہر جانے دینا وغیرہ۔ زرداری کی خفیہ ہاتھ سے ڈیل کے بدلے میں پانچ سالہ صدارت بھی زرداری ہی کو قاتل یا قتل کا حصہ دار ثابت کرتا ہے۔

بلاول ابھی ایک ناتجربہ کار پالتو جانور کی طرح اسی خفیہ ہاتھ کا آلہ کار ہے جس نے اس کی ماں کا قتل کرایا۔ وگرنہ حقیقت وہ بھی جانتا ہے لیکن وہ محض جھوٹ اور سیاسی شعبدے بازی کے بل پر پیپلز پارٹی کے مردہ گھوڑے میں جان ڈالنے کی بے سود کوشش کر رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کو زندہ رہنے کے لئے کسی نہ کسی نام نہاد شہید کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا دعوی ہے کہ اگر بلاول کا "شہید ماں اور نانا" والا ڈرامہ فلاپ ہو گیا تو زرداری اقتدار کی خاطر اس کو بھی، شہیدوں، کی فہرست میں لانے سے گریز نہیں کرے گا۔

Human Genome Project

Dr Sultan Mahmood: Wait for a Century, What Human Genome Project will Conclude.

By Dr Sultan Mahmood

Gene mutation is normally a process of million years of genetic coding or by chance accidently or abruptly it can also change the genetic behaviour. Since the advent of Wi-Fi, Salt-Sugar-Oil nexus and Ozone layer depletion, mutation process is faster than ever in humans as well as in other animals and plants.

As per latest research (1992) human genome consists of 103 proteins which support Watson-Crick Model of DNA. Both scientists are Nobel Laureate of 1952. This research favours the lifestyle theory where scientists still believe in the truth of Gregor Mandel‹s theory of four basic genetic principles.

Human Genome Project is still working day and night with an investment of billions of dollars annually and four countries are competitively in lead, viz, USA, France, Israel and Japan. It looks

that this project will be able to understand within this century that how human species (homo sepien) was evolved, either from a monkey or what Quran says about Adam. Up to the moment of resolution of this myth by the scientists, Darwin will always be criticized by the believers of divine books. Since Muslims are on the back benches of the class of scientific research, rather out of the class room, so we should wait, and avoid criticism, what Human Genome Project infers at the end.

انسانی جینوم پروجیکٹ

ڈاکٹر سلطان محمود: ایک صدی کا انتظار کریں، ہیومن جینوم پروجیکٹ کیا نتیجہ اخذ کرے گا۔

جین میوٹیشن عام طور پر جینیاتی کوڈنگ کے ملین سال کا عمل ہے یا اتفاقی طور پر یا اچانک یہ جینیاتی رویے کو بھی بدل سکتا ہے۔ وائی فائی، سالٹ شوگر آئل گٹھ جوڑ اور اوزون کی تہہ کی کمی کے بعد سے، انسانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے جانوروں اور پودوں میں بھی تبدیلی کا عمل پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہے۔

تازہ ترین تحقیق (1992) کے مطابق انسانی جینوم 103 پروٹینوں پر مشتمل ہے جو ڈی این اے کے واٹسن کرک ماڈل کو سپورٹ کرتے ہیں۔ دونوں سائنسدان 1952 کے نوبل انعام یافتہ ہیں۔ یہ تحقیق طرز زندگی کے نظریہ کی حمایت کرتی ہے جہاں سائنسدان اب بھی گریگور مینڈل کے چار بنیادی جینیاتی اصولوں کے نظریہ کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں۔

ہیومن جینوم پراجیکٹ اب بھی دن رات سالانہ اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کے ساتھ کام کر رہا ہے اور چار ممالک امریکہ، فرانس، اسرائیل اور جاپان کی قیادت میں مقابلہ کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ پروجیکٹ اس صدی کے اندر یہ سمجھنے کے قابل ہو جائے گا کہ انسان کی نسل (ہوموسیپین) کیسے تیار ہوئی، یا تو بندر سے یا قرآن آدم کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ سائنسدانوں کی طرف سے اس افسانہ کے حل کے لمحے تک، ڈارون کو ہمیشہ آسمانی کتابوں کے ماننے والوں کی طرف سے تنقید کا نشانہ بنایا جائے گا۔ چونکہ مسلمان سائنسی تحقیق کی کلاس کے پچھلے بنچوں پر ہیں، نہ کہ کلاس روم سے باہر، اس لیے ہمیں انتظار کرنا چاہیے، اور تنقید سے گریز کرنا چاہیے، جو ہیومن جینوم پروجیکٹ آخر میں بتاتا ہے۔

ڈاکٹر عشرت حسین کی کتاب پر تبصرہ

از ڈاکٹر سلطان محمود

13 مئی 2018

سٹیٹ بنک آف پاکستان کے سابق سربراہ ڈاکٹر عشرت سے بہتر موجودہ ملکی ترقی اور اس میں حائل رکاوٹوں کے باوجود ترقی کر جانے کے راز شاید اور کوئی دوسرا نہ جانتا ہو۔ ان کی کتاب "Governing the Ungovernable" پر ابھی انکی گفتگو سنی ہے۔ ان کے مطابق کچھ معاملات پر ہمارے خیالات درج ذیل ہیں:

ہمارے اداروں کو سب سے زیادہ نقصان بھٹو نے انڈسٹری اور تعلیم کو قومیا کر پہنچایا۔ بس آج انڈسٹری اور تعلیم دونوں گراونڈ زیرو پر ھیں۔ بھٹو کے فائدہ بخش اقدامات آئین اور ایٹم بم کی طرف پیش رفت رہے۔ ایوب سب سے بہتر ملک میں انڈسٹری لگا کر اور دو ڈیمز بنا کر رہا مگر ایران کو سیستان بیچ کر پاکستان تیل کی دولت سے محروم رہا۔ گوادر کی خریداری البتہ پاکستان کی بہتری کی طرف مڑ گئی۔ ضیا الحق ہر لحاظ سے ناکام رہا۔ افغان مہاجرین، کلاشنکوف، ھیروین، ن لیگ، ایم کیو ایم، مذہبی جنونیت اور کالا باغ ڈیم بنا سکنے کے باوجود نہ بنانا اس کے تحفے تھے۔ نواز، زرداری الطاف اور مشرف نے ذاتی طور پر ملک لوٹا اور ملک میں انارکی کی بنیاد رکھی۔ بینظیر ملک کو بہتر چلا سکتی تھی مگر اسٹیبلشمنٹ نے اس کے ہاتھ باندھ دیئے۔ اس ملک کے ساتھ اصل بدقسمتی یہ رہی کہ قیام پاکستان کے ساتھ ہی سازش کے ذریعے سیاست کو کمزور اور اسٹیبلشمنٹ کو مضبوط کیا گیا۔ اور امریکہ

کی جھولی میں گر کر دنیا کو یہ تاثر دیا گیا کی ہم اس کے منشا سے وجود میں آئے تھے اور آخر کار روس کو شکست دے کر یہ نقطہ نظر ثابت بھی کر دیا۔ بھٹو کی آنکھیں اگرچہ ہنری کیسینجر نے کھول دیں تھیں جس کی وجہ سے اس نے پاکستان کو مضبوط بنانے کی کوششیں 1974 میں شروع کر دیں مگر تب تک وہ امریکی ایجنٹ کے طور پر ملک کی بنیادوں میں قومیانے والا بم رکھ چکا تھا لہٰذا امریکہ نے اپنا کام لے لینے کے بعد اس کو پھانسی دلا دی۔ پاکستان کی اس مختصر کہانی میں بے سمتی کا الزام سراسر اسٹیبلشمنٹ کے سر ہے کیونکہ جتنے بھی جرنیل تھے اسی کے تھے اور جتنے بھی نالائق سیاستدان تھے سبھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔

How to Get Rid of Corrupt Leadership

کرپٹ رہنماؤں سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے؟

By Dr Sultan Mahmood

23Jul18

Some doable steps are suggested to get rid of corrupt leadership in Pakistan:

1. Honest dictators are better than corrupt democrats. A National Security Council (NSC) is suggested to confer power to a real group of ruling NSC. President, cabinet, chief justice, army chief, intelligentsia, governor of State Bank, Speakers of National/Provincial Assemblies, a pronounced media person, an economist, foreign as well as internal affairs expert and other heads of several other departments should work under the NSC.

2. Introduce presidential system in the country instead of parliamentary system.

3. Select a group of visionary politicians who are honest. Elect one of them as president by vote.

4. Give the President a choice to select (not elect) maximum 20 ministers for 2 years and reshuffle next 20 honest persons (preferably technocrats) after 2 years.

5. Compare their effectiveness and finalize 20 ministers for next 5 years under the same honest President.

6. Every minister should be qualified, practitioner and specialist of his/her ministerial subject.

7. No development fund should be given to any MNA/MPA but all financial powers should be decentralized down to district nazim.

8. Not a single person among ministers or district nazims should be taken from 10٪ of upper class and 30٪ of lower class.

9. All these government officials could be banned for ever if they are failed to maintain 10٪ GDP for consecutive 5 years and primary education by 100٪.

10. Parliament must be established after general elections but only for legislative purpose. No minister should be taken from the Pakistan.

11. NSC must have a power of imposing death penalty to assassinate anyone from 20 member cabinets and the district nazims, through speedy judicial trial within 30 days of arrest.

12. Financial corruption starting from Rs.1 million should be subjected to death without prejudice.

13. After 10 years of such democracy firming emergency campaign, go for real general elections to firm up Presidential System. Parliamentary system may not be practiced until achieving target of 100٪ literacy rate in the country.

پاکستان میں کرپٹ لیڈرشپ سے نجات کے لیے کچھ قابل عمل اقدامات تجویز کیے گئے ہیں:

1۔ کرپٹ جمہوریت پسندوں سے ایماندار آمر بہتر ہوتے ہیں۔ ایک قومی سلامتی کونسل (NSC) کو تجویز کیا گیا ہے کہ وہ حکمراں NSC کے ایک حقیقی گروپ کو طاقت فراہم کرے۔ صدر، کابینہ، چیف جسٹس، آرمی چیف، دانشور، گورنر سٹیٹ بنک، قومی / صوبائی اسمبلیوں کے

سپیکر، میڈیا پرسن، ماہر اقتصادیات، خارجہ اور اندرونی امور کے ماہر اور دیگر کئی محکموں کے سربراہان کو اس کے تحت کام کرنا چاہیے۔ این ایس سی۔

2۔ ملک میں پارلیمانی نظام کی بجائے صدارتی نظام رائج کیا جائے۔

3۔ بصیرت رکھنے والے سیاستدانوں کا ایک گروپ منتخب کریں جو ایماندار ہوں۔ ان میں سے کسی ایک کو ووٹ کے ذریعے صدر منتخب کریں۔

4۔ صدر کو 2 سال کے لیے زیادہ سے زیادہ 20 وزیروں کا انتخاب (منتخب نہ کرنے) کرنے کا اختیار دیں اور 2 سال کے بعد اگلے 20 ایماندار افراد (ترجیحاً ٹیکنوکریٹس) کو تبدیل کریں۔

5۔ ان کی تاثیر کا موازنہ کریں اور اسی ایماندار صدر کے تحت اگلے 5 سالوں کے لیے 20 وزراء کو حتمی شکل دیں۔

6۔ ہر وزیر کو قابل، پریکٹیشنر اور اپنے وزارتی مضمون کا ماہر ہونا چاہیے۔

7۔ کسی بھی ایم این اے / ایم پی اے کو کوئی ترقیاتی فنڈ نہ دیا جائے بلکہ تمام مالی اختیارات ضلع ناظم کو دیے جائیں۔

8۔ وزراء یا ضلعی ناظمین میں سے ایک بھی فرد 10 فیصد اعلیٰ طبقے اور 30 فیصد نچلے طبقے سے نہیں لیا جانا چاہیے۔

9۔ ان تمام سرکاری افسران پر ہمیشہ کے لیے پابندی لگائی جا سکتی ہے اگر وہ مسلسل 5 سال تک 10 فیصد جی ڈی پی اور پرائمری تعلیم کو 100 فیصد تک برقرار رکھنے میں ناکام رہے۔

10۔ پارلیمنٹ کا قیام عام انتخابات کے بعد ہونا چاہیے لیکن صرف قانون سازی کے لیے۔ پاکستان سے کوئی وزیر نہ لیا جائے۔

11۔ NSC کے پاس 20 رکنی کابینہ اور ضلعی ناظمین میں سے کسی کو بھی گرفتاری کے 30 دنوں کے اندر تیز عدالتی ٹرائل کے ذریعے قتل کرنے کے لیے سزائے موت دینے کا اختیار ہونا چاہیے۔

12۔ 10 لاکھ روپے سے شروع ہونے والی مالی بدعنوانی کو بغیر کسی تعصب کے سزائے موت دی جائے۔

13۔ اس طرح کی جمہوریت کے 10 سال کے بعد ہنگامی مہم کو مضبوط بنانے کے بعد، صدارتی نظام کو مضبوط کرنے کے لیے حقیقی عام انتخابات میں حصہ لیں۔ ملک میں شرح خواندگی کا 100 فیصد ہدف حاصل کرنے تک پارلیمانی نظام رائج نہیں ہو سکتا۔

عمران سے پاکستان کو راتوں رات ریاست مدینہ بنانے کا مطالبہ

از ڈاکٹر سلطان محمود

22 اگست 2018

اگر اپنی محبوب ترین شخصیت کی بھی لمحہ بہ لمحہ تصویر کشی کی جائے تو اس میں بھی گندے، بدبودار اور سمجھ میں نہ آنے والے معاملات شامل ہوتے ہیں۔ ہم جب تک اعلیٰ ظرف رہیں گے تب تک انسان کہلانے کے حقدار رہیں گے وگرنہ اس مکھی کے درجے پر گر جائیں گے جو صرف گندگی پر ہی بیٹھتی ہے۔

سلیم صافی جیسی قماش کے صحافی سیاستدانوں کے ٹکڑوں پر پل کر میڈیا میں اپنا قد کاٹھ نکالتے ہیں۔ اور پھر اپنی قیمت والی ہڈی منہ میں دبا کر مخالفین پر بھونکتے ہیں۔ ایسے بدبخت صحافی کبھی نواز کے کتے اور کبھی عمران کے بھانڈ بن کر صبح شام ضمیر بیچتے رہتے ہیں۔ اگر قوم کو حقیقت میں بدلنے کا عزم لئے کوئی رہنما آ ہی گیا ہے تو کوتاہ اندیش اور جلن کے مارے حاسدین اب اس کے لمحے لمحے کو قوم کے سامنے پیش کر کے آخر قوم کی کون سی خدمت سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عمران ڈرامے ہی کر رہا ہو مگر ان لفافہ صحافیوں کے منہ میں ہڈی ڈال دے تو یہ اپنی ماں کو بھی چھوڑ سکتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہماری قوم میں پڑھے لکھے بھی وہی ذہن رکھتے ہیں جو ان پڑھوں کا ہے۔ اس لئے سلیم صافی جیسے لفافے گروہ جاہلاں کے امام بن کر ماحول کو ناصاف کرتے رہیں گے۔ کسی فلاسفر نے

انسانوں کو تین دماغی درجوں میں تقسیم کیا تھا۔ شخصیات پر بحث کرنے والے گھٹیا درجے کے لوگ، واقعات پر بولنے والے درمیانے درجے کے لوگ اور پالیسی پر بات کرنے والے اعلیٰ لوگ۔ اگر انسان لفافہ ملتے ہی اعلیٰ سے گھٹیا درجے پر گر جائے تو پھر اللہ ہی حافظ۔

عہد حاضر کے مسلمان

از ڈاکٹر سلطان محمود

13 اکتوبر 2018

قادیانیت پیدا کر کے مسلمانوں کے ساتھ دھوکے کی حدیں پار کر دی گئی ہیں۔ انگریز نے بر صغیر میں مسلمان کی طاقت توڑنے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کئے۔ بریلوی، دیوبندی وغیرہ تو پیدا کئے ھی مگر قادیانیت پیدا کر کے توحد ہی ختم کر دی۔ یہی حرکت ابتدائے اسلام میں عرب قبائل کی چشمک کی بنیاد پر شیعہ سنی کی تقسیم میں مضمر تھی۔ اور آج نتیجہ سو فیصد غیر مسلموں کے حق میں ہے۔

مسلمان آج بھی جہالت میں ڈوبے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی شکل میں بمشکل زندہ ہیں اور اجتماعی طور پر جہالت کے باعث فرقہ بندیوں میں گھٹنوں گھٹنوں دھنس چکے ہیں۔ لہٰذا اجتماعی طور پر ان میں ایمان سمیت کوئی طاقت نہیں بچی۔ اس تناظر میں دیکھیں تو دین اسلام اب مذہبی رنگ اختیار کر چکا ہے بالکل ویسے ہی جیسے عیسائیت، سکھ، بدھ اور ہندوازم۔

اگر اب دین اسلام زندہ بچا بھی ہے تو محض ذاتی سطح پر ہے مگر عالمی سطح پر مکمل بے اثر ہے۔ یاد رہے کہ مسلمانوں کے پاس اب تیل واحد دولت ہے جس کے باعث دنیا میں کوئی نام وام موجود ہے کیونکہ اس کو چوسنے کی خواہش آج بھی طاقتوروں کو ہے اور انہوں نے تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک پر اپنے پالتو حکمران مسلط کر دیئے ہیں۔ تبھی ٹرمپ کا حالیہ بیان دیکھیں جس میں اس نے کہا ہے کہ سعودی عرب ہماری مدد کی بغیر دو ہفتے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ دنیا میں یہودیت پھیل رہی ہے

جس نے مسلمانوں سے تیل جیسی آخری دولت بھی چھین کر اسلام کی رہی سہی اجتماعیت بھی ختم کر دینی ہے۔

ایران سعودی کشمکش بظاہر شیعہ سنی جنگ نظر آتی ہے مگر در حقیقت یہ طاقتوروں کی تیل پر قبضے کی جدوجہد کا پلان بی ہے جس میں وہ دونوں کو اکیلے اکیلے ماریں گے۔ بلکہ سعودیہ کو تو وہ قبضے میں لے چکے ہیں۔ اور اس طرح مسلم طاقتیں پاش پاش ہو کر ختم ہو جائیں گی۔ دشمن کی نظر بلوچستان، افغانستان اور وسط ایشیائی ریاستوں پر بھی صرف اس لئے ہے کہ یہ ممالک معدنی دولت سے مالا مال ہیں۔ چین، امریکہ اور یورپ سمیت سبھی طاقتور اب اسی طرف دیکھ رہے ہیں۔ Survival of the fittest والا قانون پورا ہو رہا ہے۔

طاقتور ممالک کے پاس اتنا اسلحہ اور ٹیکنالوجی موجود ہے کہ وہ آن واحد میں بھی تمام امیر مسلم ممالک پر قبضہ کر سکتے ہیں مگر اس ڈر سے وہ ایسا نہیں کرتے کہ کمزور کو دیوار سے لگانے سے عام مسلمان کے دل میں سویا ہوا ایمان کہیں جاگ نہ جائے اور یہودی کی بادشاہت کے خواب کی تعبیر دور نہ ہو جائے۔ کیونکہ کمزور مسلمان کے دل میں بھی اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کافی اندر تک گھس جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اج بھی اذان کی آواز سن کر ایک زانی بھی میوزک بند کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس ایمان کو دل کے اندر ہی آہستہ آہستہ ختم کرنے کے لئے عیاشی بذریعہ میڈیا عام کر دی گئی ہے جو اب ففتھ جنریشن ہائبرڈ جنگ کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اب مسلم نوجوان میں سوشل میڈیا کو چھوڑ کر عمل کے میدان میں نکلنا ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ اب صرف ایمانی بھڑکیں ہی رہ گئی ہیں اور وہ بھی تب تک جب تک کہ موبائل کی بیٹری ختم نہ ہو جائے۔

قصہ مختصر کہ آج مسلمان ہر محاذ پر شکست وریخت کا شکار ہے۔ سکولوں میں دینی تعلیم ہے نہیں اور مدرسوں کو مال ایران اور سعودیہ لگاتے ہیں۔ آج کا مسلمان اب صرف اسلاف کے کارنامے بیان کرنے میں شیر ہے یعنی کہ ماضی میں زندہ ہے اور مستقبل غیر مسلموں کے ہاتھ دیکر سکون کی نیند سو رہا ہے۔

اسلامی شعائر

از ڈاکٹر سلطان محمود

21 نومبر 2018

مجھ جیسا عام سا گنہگار مسلمان اس بات پر خاصہ الجھن میں گرفتار ہے کہ دین اسلام کا ایک فرقہ سازو آواز اور عورتوں مردوں کی مخلوط محفلوں، چاہے دینی ہی ہوں، کا سخت ترین مخالف ہے اور اسے گناہ عظیم قرار دیتا ہے اور دوسرا اسے علی الاعلان ثواب قرار دیکر سوشل میڈیا پر پھیلا رہا ہے۔ دین اسلام میں اجتہاد نہ ہونے کے سبب ابھی تک کوئی ایسی کامیاب اجتماعی کوشش سامنے نہیں آئی ہے کہ جس سے اندازہ ہو کہ مسلم امہ ایک جسم و جاں ہو کر رہنا چاہتی ہے اور نہ ہی پوری دنیا میں دین اسلام کہیں بھی اجتماعی طور پر نافذ ہے لہٰذا اسی الجھن کے باعث آہستہ آہستہ دین انفرادی سطح پر سمٹ آیا ہے۔ اور اس پر مستزاد کہ ہر، صاحب علم، کا اپنا ایک الگ ہی دینی ورژن ہے۔ اگر ہم خود ہی دین اسلام کی اصلیت کی کھوج میں لگ جائیں تو شاید ایک عمر میں نہ تو اس دینی کوشش میں کامیاب ہو پائیں اور نہ دنیا میں کامیاب رہ پائیں۔ جبکہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ دعا تھی کہ، یا اللہ ہماری دنیا اور آخرت دونوں حسین فرمادے،۔ یہ شاید اسی الجھن کا شاخسانہ ہے کہ اب میرے جیسے کروڑوں مسلمانوں کا دین آہستہ آہستہ انفرادی سطح پر سمٹ آیا ہے اور یہی شاید دشمنان اسلام چاہتے بھی تھے اور یہی ہم نے کر کے دکھا بھی دیا ہے۔ اب بدقسمتی سے معاملہ اس نہج تک پہنچ گیا ہے کہ دشمنوں کے لئے ہمیں اکیلے اکیلے کو جہنم واصل کرنا بے حد آسان ہو گیا ہے (خاکم بدہن)۔

پھر ایک دن کیا ہوا؟

از ڈاکٹر سلطان محمود

8 دسمبر 2018

یہ بلوچستان کے ضلع ناڑی کے علاقہ بھاگ کے عوام کی آج کی تاریخ میں دہائی ہے جو جوہڑ کا پانی پینے پر مجبور ہیں۔ میں اس علاقے کی حالت آج سے 25 برس قبل دیکھ چکا ہوں جب بلوچستان رورل سپورٹ پروگرام کا یہاں علاقائی دفتر ہوا کرتا تھا۔ اور ہم ساڑھے چار سال مسلسل یہاں کے عوام کی حالت سدھارنے کے لئے جرمن حکومت کے تعاون سے ان لوگوں کو اپنی مدد آپ کے اصول سکھانے کوئٹہ سے آیا کرتے تھے۔ تب بھی یہی حالت تھی اور آج بھی یہی ہے۔ اس ناکامی کی وجہ بڑی ہولناک ہے۔

ہوا یوں کہ ایک آخر جنوری 1997 کے ایک دن اچانک پیرس کنسورشیم میں جرمنی کی نمائندہ خاتون، جس کا نام یاد نہیں رہا، کوئٹہ آئی اور بی آر ایس پی کے چیدہ چیدہ پندرہ بیس لوگوں کو رات سرینا ہوٹل طلب کر کے یہ خبر دی کہ جرمنی کی خیراتی تنظیم جی ٹی زی پاکستان میں اپنا کردار ختم کر کے واپس جا رہی ہے اور جاتے جاتے پیرس کنسورشیم میں اس وقت کے آٹھ امیر ممالک کو بھی پاکستان کی مدد بند کرنے کی سفارش کر رہی ہے کیونکہ اس ملک کے جابر طبقے سے تعلق رکھنے والے قاضی عظمت عیسیٰ نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہماری امداد کی رقم کا غلط استعمال کر کے چالیس لاکھ کا ذاتی گھر خرید لیا ہے۔

یہ قاضی عظمت عیسیٰ، قائد اعظم کے کھوٹے سکے یعنی بلوچستان کی مسلم لیگ کے صدر قاضی عیسیٰ کے بیٹے ہیں اور موجودہ جسٹس سپریم کورٹ قاضی فائز عیسیٰ کے بڑے بھائی ہیں۔ اور اس وقت یہ صاحب ورلڈ بنک اسلام آباد کی نوکری چھوڑ کر محض مال کمانے کوئٹہ آئے تھے اور پانچ برس لوٹ مار کر کے دوبارہ اپنی پوسٹ پر اسلام آباد چلے گئے۔ یہ صاحب آج بھی پاکستان پاور ٹی الیوی ایشن فنڈ کے سربراہ کے طور پر اب ملک بھر میں لوگوں کی غربت یا قائد اپنی غربت دور کر رہے ہیں۔ ان کو بی آر ایس پی میں لانے والی ان کی چچی محترمہ قاضی جینیفر موسیٰ تھیں جو ہمارے بورڈ کی ڈائریکٹر ہوا کرتی تھیں۔ میری ان سے تین ملاقاتیں ہوئیں جس میں وہ عظمت کی کرپشن پر ہاتھ ملا کرتی تھیں۔

اس رات سرینا ہوٹل کوئٹہ کی خفیہ میٹنگ میں عظمت عیسیٰ نے سرگودھا کے بدبخت ساتھی ملک حمید اللہ کو بطور جاسوس اس گروپ میں شامل کروا کر ساری گفتگو ریکارڈ کرالی اور اس ننگ وطن کی تنخواہ بڑھادی۔ اور اگلے روز ان بیس میں سے مجھ سمیت آٹھ لوگوں کی گرفتاری کا چیف سیکرٹری بلوچستان نے حکم جاری کر دیا۔ اور اخبار میں اشتہار بھی دیدیا۔ یہ حکم مسلم لیگ کے دانشور مشاہد حسین کی کزن شاہدہ جعفری کے دوسرے خاوند سکندر جمالی کے کہنے پر صادر ہوا جو سابق وزیر اعلیٰ بلوچستان ظفر اللہ جمالی کے بھائی تھے۔

بھاگناڑی کی افلاس زدہ عوام کی فلم بنانے والے اس نامعلوم ساتھی سے دکھ کے ساتھ عرض ہے کہ بھائی اس تحریر میں لکھے گئے تمام بڑے نام آج بھی بڑے نام ہیں اور وہ سب ایک ہیں۔ تم تب بھی غریب تھے اور آئندہ بھی غریب رہو گے اور وجہ تمھارے اپنے لوگ ہیں۔ تم کبھی بھی اپنی غربت کے اصل ذمہ دار اپنے سرداروں سمیت ایسے ہی دیگر طالع آزماؤں کو پکڑ نہ پاؤ گے۔ مگر گالی ہمیشہ

پنجاب وغیرہ کو دوگے جو تمھارے شکایتی لہجے سے لگ بھی رہا ہے۔ کبھی موقع ملے تو سوچنا ضرور کہ امیر عیسائی ممالک کے پیسے کو تمھاری ترقی کی طرف موڑنے سے اصل میں روکا کس نے؟ اور پھر جیسے بھی چاہو اور جس سے بھی چاہو نفرت کرتے رہنا۔ مگر کم از کم میں تو تمھیں ہی سچا سمجھوں گا۔

بھٹو کے یوم وفات پر تبصرے

از ڈاکٹر سلطان محمود

6 اپریل 2019۔

میں نے 1966-67 میں اپنی پرائمری جماعت ہی کے زمانے سے پیپلز پارٹی بنتے اور پھلتے پھولتے دیکھی اور جس چیز نے مجھے ابتدا ہی سے اس سے نفرت دلائی وہ پیپلز کالونی فیصل آباد میں ہمارے ارد گرد بسنے والے کن ٹٹے اور فورتھ کیٹیگری کے لوگوں کی جوق در جوق اس پارٹی میں شمولیت تھی۔ آئے دن کی گالی گلوچ اور فائرنگ ان لوگوں کا شیوہ تھا اور ہم ٹھہرے کمزور اور شریف۔ میں بھٹو کی پالیسیوں اور کاروائیوں کا 1970 سے ہی شدید ترین ناقد رہا ہوں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بھٹو ایک قومی و عالمی سطح کا سیاسی رہنما تھا۔ اس درجے کا شہرت یافتہ شخص ہونے کے ناطے کم از کم اسکی موت کو استہزاء کا نشانہ نہیں بنایا جانا چاہئیے۔ مزید بر آں اگر ہمارے بھٹو مخالف تبصروں سے کوئی اس کا چاہنے والا ہرٹ ہو رہا ہو تو یہ بھٹو کی مخالفت نہیں سمجھی جائے گی بلکہ اس کے شیدائی پر ذہنی تشدد ہو گا۔ اس لئے احتیاط کرنا ہی بہتر ہے۔ مجھے حالیہ دنوں کی اپنی کچھ پوسٹوں پر بھی افسوس ہے مگر میں نے کوشش کی تھی کہ بھٹو کے جذباتی شیدائیوں کو کسی غلط اور بے بنیاد پروپیگنڈے سے روکا جائے نہ کہ مخالفت میں ان کے جذبات سے کھیلا جائے۔

عمران کے خلاف طبقہ بد معاشیہ کا خطرناک حملہ ناکام

از ڈاکٹر سلطان محمود

3 جون 2019

چیئرمین نیب پر عورت ڈالے جانے والے واقعے پر میرا تبصرہ درست ثابت ہو رہا ہے۔ اس میں سیاستدان، بیوروکریٹس، وکلاء، صحافی، ایف آئی اے، نیب پولیس اور دیگر اداروں کے بعض افسران، ٹی وی چینلز بلکہ وزیر اعظم ہاؤس میں بیٹھے ایک شخص کا ذاتی ٹی وی چینل، سوشل میڈیا پر نون لیگ اور پی پی کے اندھے فالوورز خصوصاً بچگانہ ذہنیت والے سوشل میڈیا کھلاڑی شامل ہیں اور ان سب کا خرچہ نون لیگ اور پی پی برداشت کر رہی ہے۔ اس طبقہ بد معاشیہ کا عمران پر حملہ ناکام ہو گیا ہے مگر ہمارے خیال سے یہ پلان اے تھا اسکی ناکامی کی صورت میں اب عمران کا مخالف طبقہ بد معاشیہ پلان بی لے کر آئے گا۔ اس حملے میں ملوث گینگسٹرز کو دیکھ کر اندازہ لگائیں کہ عمران واقعی سچا ہے اور اس ملک کی قسمت بدلنا چاہتا ہے مگر برے لوگ اس کی مخالفت میں اکٹھے ہو کر کمر بستہ ہیں اور وہی بد معاش اور لوٹ کھسوٹ کا نظام واپس لانا چاہتے ہیں جس نے پاکستان کو اس حالوں پہنچایا ہوا ہے۔

مندرجہ ذیل پوری وڈیو دیکھیں اور شاید آج ہی طبقہ بد معاشیہ اس کے الٹ وڈیوز، پریس کانفرنسز اور برے میڈیا چینلز کا استعمال شروع کر دے گا۔ اس طوفان بد تمیزی میں ہمارے وہ دوست احباب جن کی آنکھوں پر نون لیگ اور پی پی کی شخصی پٹی چڑھی ہوئی ہے ان کے لئے اب بھی موقعہ

ہے کہ طبقہ بد معاشیہ کا ساتھ چھوڑ کر صرف پاکستان کی بہتری کے لئے کام کرنے والوں کی حمایت کریں۔ بھلے سے وہ عمران کی حمایت نہ کریں مگر غلیظ پارٹیوں کو پہچان لیں۔ اگر کچھ اچھا نہیں کر سکتے تو اس وقت خیر و شر کی لڑائی میں کم از کم خاموش ہو کر بیٹھ جائیں۔ یاد رکھیں اللہ پاکستان کا حامی و ناصر لگتا ہے لہٰذا ہمیں یقین ہے کہ پاکستان مضبوط ہونے جا رہا ہے بس اس خیر میں اپنا حصہ ڈالیں۔

https://www.facebook.com/592393064492684/posts/838910789840909/?sfnsn=mo&s=100000202077301&w=y

ننگ وطن خاندان

از ڈاکٹر سلطان محمود

05جون2019

میں مسلم لیگ بلوچستان کے صدر قاضی عیسیٰ کی فیملی کے کوئٹہ میں کافی قریب رہا ہوں کیونکہ فائز عیسیٰ کے بڑے بھائی عظمت عیسیٰ بلوچستان رورل سپورٹ پروگرام (بی آر ایس پی) میں میرے باس تھے۔ اور انکی چچی محترمہ جینیفر موسی کے ہاں پشین میں بھی ہمارا تواتر سے آنا جانا تھا۔ کیونکہ وہ بی آر ایس پی بورڈ کی وائس چیئر پرسن بھی تھیں۔ محترمہ جینیفر قاضی موسی کی برٹش بیگم تھیں اور بلوچستان میں دو بار وزیر بھی رہیں۔ عظمت عیسیٰ کی کرپشن کا ریکارڈ ابھی بہت پرانا نہیں کہ جب پاکستان کو امداد دینے والا پیرس کنسورشیم عظمت کی کرپشن کے باعث امداد بند کر بیٹھا۔ یہ 1996 کے اواخر کا قصہ ہے۔

یہ ایک انتہائی پڑھی لکھی اور پروقار فیملی ہے جن کا حوالہ قائداعظم کے دوست اور مسلم لیگ بلوچستان کے صدر قاضی عیسیٰ ہیں۔ موصوف برازیل میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔

اس خاندان کی جو کہانیاں کوئٹہ اور پشین میں پھیلی ہوئی ہیں وہ کسی بھی بدکردار سیاسی الیٹ فیملی سے ذرا مختلف نہیں اور آج یوں لگتا ہے کہ انگریز نے جان بوجھ کر قائد محترم کے ارد گرد ایسے غداروں کا جال بچھایا کہ جنہوں نے ملک بناتے وقت اور ازاں بعد امریکہ اور برطانیہ کے مفادات کا خاص خیال رکھنا تھا۔

اس خاندان کی کہانی شاید کسی بھی ننگ وطن خاندان کی کہانی سے مختلف نہ ہو۔ مگر ایک اندازہ شاید لگانے میں آسانی رہے کہ قائد ان خاندانوں کو پہچان چکے تھے اور جب ان کو زیارت میں ایک طرح سے ہاؤس اریسٹ کیا گیا تب قائد نے اپنے ڈاکٹر کرنل الہی بخش کے ذریعے متعدد درخواستیں وزیر اعظم لیاقت علی خان تک پہنچائیں جن کو کبھی بھی شنوائی نہ مل سکی۔ ایک ایسے موقعہ پر قائد نے کرنل الہی بخش سے صاف صاف کہا کہ میرے مرنے کے بعد لیاقت اور قاضی عیسیٰ میرا منہ بھی نہ دیکھنے آئیں۔ قائد نے اپنے گرد چھائے ان سب وڈیروں کو کھوٹے سکوں سے بھی تشبیہ دی تھی نیز ان سب نے بھی ایک سازش کے تحت قائد کو کراچی جیسے بہتر شہر کی بجائے زیارت میں قید کر دیا۔ اور کبھی پلٹ کر ملنے نہ گئے۔

قاضی عیسیٰ نے باقاعدہ کراچی جا کر بلئیر ڈ سیکھی اور اسی بہانے قائد سے متعارف ہوئے۔

پاکستان میں سے چینی کے پورے جہاز کی پہلی سمگلنگ بھی قاضی عیسیٰ کے نام ہے اور بحیثیت سفیر برازیل کراچی ائیر پورٹ پر ان کی جیب سے سمگلڈ ہیرے برامد ہوئے جس پر اس سے سفارت واپس لے لی گئی اور اسی دکھ میں قاضی عیسیٰ دل کے دورے سے انتقال بھی کر گئے۔

بلوچستان میں فائز عیسیٰ چیف جسٹس رہے اور ان کی شریف خاندان سے خاصی قربت تھی۔ ان پر یہ الزام بھی رہا ہے کہ لندن والی جائداد ان کو شریف فیملی نے تحفتاً دے رکھی ہے۔ اگر یہ جوڈیشل کمیشن میں پیش ہوا تو یقیناً برا پھنسے گا۔ اور شریف فیملی کا طریقہ واردات بھی آشکار ہو جائے گا کہ یہ کس طرح ججوں، جرنیلوں اور بیوروکریسی کو خریدتے تھے۔ اس قاضی خاندان کی عورتوں کے قصے ایک الگ داستان ہے جو کوئٹہ کی گلی کوچوں میں اب بھی سننے کو مل جاتی ہے۔ بہر حال "اسبغول اور

کچھ نہ پھول" والی یہ کہانی بھی اب لگتا ہے کہ لیک ہونے والی ہے۔ اور کئی ننگی وطن غدار منصہ شہود پر آنے والے ہیں۔

ڈاکٹر سلطان محمود

سابق ہیڈ آف سیکشن

بی آر ایس پی۔ کوئٹہ۔

امریکی ایجنٹوں کے ذریعے پاکستان کی ترقی

از ڈاکٹر سلطان محمود

11 جون 2019

پاکستان میں لگنے والے تمام مارشل لاء امریکی پلاننگ پر لگتے تھے اور ایوب، ضیاء اور مشرف محض قوم کو بے وقوف بنانے کے لئے اسلام اور معیشت کی کہانی سناتے تھے۔ ایوبی آمریت خطے میں روس کی خلاف امریکی قدم جمانے کی سازش تھی مگر ایوب بعد ازاں کئی معاملات میں وطن کا درد رکھنے کے باعث ملک کو صنعتی ترقی کرا گیا مگر امریکہ نے اپنے پالتو بھٹو کے ذریعے بروقت ہی ناصرف ماضی کی ترقی یافتہ معیشت کے غبارے سے ہوا نکال باہر کی بلکہ ہمیشہ کے لئے ملک تنزلی میں رکھنے کے لئے تعلیم کو بھی قومیا کر اسکی جڑوں میں بارود رکھ دیا۔ ضیاء نے اسلام کو خوب بیچا مگر حقیقت میں امریکہ کے مقابل روس کو شکست دلائی۔ پھر مشرف کو آگے کیا گیا تو امریکی مقصد افغانستان میں بیٹھ کر چین کی اقتصادی پیش قدمی کو روکنا تھا۔

وڈیو بتاتی ہے کہ افغانستان میں لڑنے کیلئے ایک امریکی فوجی پر پندرہ لاکھ ڈالر جبکہ پاکستانی فوجی پر محض دس ہزار ڈالر خرچہ اٹھتا ہے۔ اس لئے اگر پاکستان پرائی جنگ لڑنے کی حامی بھرے تو یہ سراسر امریکی فائدہ ہے۔ اوپر سے امداد کے نام پر دی جانے والی رقم پہلے پاکستان اپنے پاس سے خرچ کریگا اور امریکہ بعد میں واپس کرتے وقت ناصرف بیشمار شرائط لگا سکتا ہے بلکہ انکار بھی کر سکتا ہے۔ یہ تجزیہ اب سامنے آیا ہے جب ضیاء الحق اور مشرف پاکستان کی تباہی کر کے نکل چکے۔

امریکہ ایک ترقی یافتہ قوم ہے اور وہاں ادارے ملکی ترقی کی پلاننگ کرتے ہیں اور سو سو سال کے پراجیکٹ بھی بناتے ہیں۔ تبھی کسی وقت کہا جاتا تھا کہ 2015 کے بعد دنیا کے نقشے پر پاکستان نہ ہو گا۔ یعنی 1915 میں روس میں اشتراکی انقلاب کے ساتھ ہی امریکہ نے سو سالہ پلاننگ کر کے برصغیر کے مسلمانوں کو استعمال کرنے کا پراجیکٹ بنایا اور بالآخر وقت سے پہلے ہی 1989 میں روس توڑ کر اپنا ہدف حاصل کر لیا۔ اس تناظر میں دیکھیں تو پاکستان پر واقعی اللہ کی رحمت نظر آتی ہے کہ امریکہ پاکستان کے ذریعے اپنے مفادات آگے بڑھاتا رہا مگر وہی ایوب، بھٹو، ضیاء و مشرف بحیثیت امریکی ایجنٹس کچھ نہ کچھ ایسا بھی کر گئے کہ آج پاکستان ایٹمی طاقت بن کر دنیا کے نقشے پر الحمد اللہ جما ہوا ہے اور تا قیامت قائم رہیگا انشاء اللہ۔

اے مسلمان عقل سے کام لے

از ڈاکٹر سلطان محمود

15 جون 2019

فیس بک پر ایک صاحب فرماتے ہیں تبدیلی صرف قرآن سے آئیگی۔ انکی اس بات سے انکار بھی ممکن نہیں مگر ہمیں یوں لگتا ہے کہ اس طرح کی باتیں محض زبانی اور جذباتی ہوتی ہیں اور مقصد فیس بک پر زندہ رہنا ہوتا ہے۔ اگر حقیقت میں قرآن لاگو ہو گیا تو سب سے زیادہ سزائیں مسلمانوں کو ہی شاید ملیں گی اور پھر ہم حسرت کریں گے کہ کاش یہ قرآن لاگو نہ ہوا ہوتا اور ہم آج جیسے مزے سے زندگی گزارنے کی دوبارہ فرمائش کرتے۔

ایک بات طے شدہ ہے کہ قرآن صرف مسلمانوں کے لئے نہیں ہے یہ تمام انسانوں کو مخاطب کرتا ہے۔ جو جو اس مقدس کتاب کے جتنے جتنے حصے پر عمل کریگا اتنا ہی کامیاب ہو گا۔

اس وقت عیسائی، یہودی، ہندو اور بدھ قران پر عمل مسلمانوں سے زیادہ کر رہے ہیں اور اسی لئے مسلمانوں سے زیادہ دنیاوی لحاظ سے کامیاب بھی ہیں۔

ہم مسلمانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو صرف عبادات تک محدود کر کے اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں گرایا ہوا ہے اور معاملات سے چشم پوشی اختیار کر رکھی ہے۔

نبی آخر الزماں نے اپنی عام زندگی میں کبھی غصہ و غضب نہیں دکھایا ہو گا۔ مگر معاملات میں دنیا کی غضب ناک ترین بشارتیں سنادی ہیں مثلاً انھوں نے فرمادیا کہ جو رشوت لے گا جہنم میں جائے گا، جو ملاوٹ کرے گا وہ ہم میں سے نہ ہو گا اور جس کا ہمسایہ اس کے شر سے محفوظ نہ ہو گا جنت کا حقدار نہ ہو گا۔ اللہ تعالی نے خود فرمادیا کہ جھوٹوں پر میری لعنت ہے اور سود لینے دینے والا میرے مقابل جنگ کرنیوالا ہے نیز شرک کبھی معاف نہیں کرونگا۔

ایک بات عقل سے سوچ کر بتائیں اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانیت کے لئے رحمت تھے تو کیا وہ شرک، جھوٹ، سود، ملاوٹ، رشوت اور پڑوسیوں کے حقوق میں ہم مسلمانوں میں سے کتنوں کی سفارش اللہ سے کرینگے جبکہ وہ خود غضب ناک ہو کر ان معاملات دنیا میں کوتاہی کرنے والوں کو جہنم میں جانے کا کہہ چکے ہوں۔

اور آخری عقل کی بات اگر کسی نے اپنے بھیجے کو تکلیف دینا گوارا کر کیا تو۔ اگر اللہ سب انسانوں کا ہے، قرآن سب انسانیت کے لئے اترا ہے اور اگر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم سبھی انسانیت کے لئے رحمت کا پیغام لائے تھے تو کیا ان تمام کے مطابق موجودہ مسلمانوں کی اکثریت جہنمی مگر قرانی ہدایات کو پکڑنے والے غیر مسلمانوں کی اکثریت جنتی قرار نہ پائے گی؟ جبکہ عبادات کے بل پر نہ ہی اللہ تعالی نے اور نہ ہی اسکے آخری نبی نے جنت کی بشارت دی ہو؟

رشوت خور اور نالائق مسیحا

از ڈاکٹر سلطان محمود

17 جون 2019

پاکستان کے ہر ادارے کی تباہی میں صحت کا شعبہ بھی شامل ہے۔ میں نے بڑے جذبے کیساتھ اپنی غذا اور غذایت کی مہارت کو استعمال کرنیکی خاطر ان کا فورم جوائن کیا مگر مجھے محسوس ہوا کہ ڈاکٹروں کی واحد اور اکلوتی تنظیم فارما انڈسٹری سے ملنے والی رشوت کی زیادہ سے زیادہ وصولی کے لئے ٹوٹتی جارہی ہے اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے یہ تین حصوں میں بٹ گئی۔ تینوں نے فارما انڈسٹری کی سو کمپنیوں سے ساز باز میں سبقت لے جانے کی کوشش میں اس ملک کے غریب عوام کا بھرکس تک نکال کے رکھ دیا۔ اب تینوں دھڑوں نے اپنی ایگزیکٹو کونسل میں میرا نام لکھ رکھا ہے کیونکہ ان میں اپنے جد امجد شہید ڈاکٹر بشیر ملک کا جاری کردہ رکنیت نامہ مسترد کرنے کی شاید ہمت نہیں یا کوئی اور وجہ رہی ہوگی۔ مگر میں کسی کے ہاں بھی نہیں جاتا۔ گو کہ تینوں نے کیمو فلیجنگ کے تحت CME کرانے کا ٹھیکہ بھی اٹھا رکھا ہے مگر وہاں ڈاکٹرز کی غالب اکثریت فارما انڈسٹری کی طرف سے دیئے جانے والے مفت کھانوں پر ہی ٹوٹتی نظر آتی ہے اور سی ایم ای میں کیا بتایا جارہا ہے ادھر دھیان کم کم ہی ہوتا ہے۔

ہر تینوں دھڑوں میں صدر سیکرٹری وغیرہ کو مفت بیرون ملک ناجائز سیر بھی کرائی جاتی ہے جس کا خمیازہ بالآخر غریب مریض بھگتتے ہیں اور آئی ایم ایف طرز پر اکثر ڈاکٹر سیلز ریپ سے پوچھ پوچھ کر

دوائیاں لکھتے لکھتے ڈاکٹر بنے ہوئے ہیں۔ میرا دل اس وقت سخت اچاٹ ہوا جب ایک ڈاکٹر نے اپنے باپ کا چالیسواں بھی فارما کمپنی کے خرچے سے کروایا۔ تب ہی میں نے ایسی تنظیموں پر لعنت بھیج کر گھر کی راہ لے لی۔ ڈاکٹروں کا کلینک بنانے، سجانے اور ماہانہ بل وغیرہ تو پہلے بھی کمپنیاں ادا کرتی آئی ہیں مگر تاجر کی بیغیرت آنکھ مزید گھٹیا پن پر جب اتری تو فارماسیوٹیکل انڈسٹری نے اپنی ادویات کا معیار بھی نیچے گرا لیا۔ قیمتیں پھر بھی بڑھا لیں اور عوام کو پیس کے رکھ دیا۔ اگر دوسری طرف دیکھیں تو محض ڈاکٹر تنظیموں کے عہدے داران ہی کروڑ اور ارب پتی ہوئے مگر عوام رل کر رہ گئی۔ تینوں تنظیموں کے دھڑوں نے سیاسی جماعتیں جوائن کر رکھی ہیں اور آجکل میرے ان ڈاکٹر دوستوں کی چاروں انگلیاں گھی میں ہیں جنہوں نے دن رات بنی گالا جا جا کر عمران کی مدح سرائی میں دن رات ایک کر دیا تھا مگر اب ان میں بہت سارے شاکی ہیں کی عمران نے وفا نہیں کی اور انکو عوام لوٹنے کا کھلا لائسنس عطا نہیں کیا۔

میں گو کہ انصاف پروفیشنلز ایسوسی ایشن کا رکن ہوں مگر جانتا ہوں کہ کیوں عمران کے وزیر اعظم بنتے ہی یہ فورم غیر موثر ہو گیا ہے جس سے میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ اس کی تمام میٹنگز میں عمران کو بلانے کا مقصد محض اس کے منتظمین کا سیاسی ایجنڈا اور شو ہوتا رہا ہو گا۔

اللہ ہدایت دے ہماری قوم کو کہ اس کا سدھرنے کا مجھے تو بہت ہی مشکل مرحلہ لگتا ہے۔ معلوم نہیں عمران نے آگ کے اس دریا میں چھلانگ کیوں لگائی ہے؟

مارکسزم اور سرمائے کی جنگ

از ڈاکٹر سلطان محمود

کارل مارکس کے نظریات کے زیر اثر وہ ملک بھی نہ آسکا جہاں یہ ذہین شخص پیدا ہوا تا وقتیکہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کے درمیان شدید جنگ چھڑ گئی۔ اگر لینن اور سٹالن کی ظالمانہ آمریت روس کو طاقتور نہ کرتی تو امریکی سرمایہ دارانہ نظام شاید ان 75 سالوں پر بھی چند ممالک کے اندر کھڑا نہ رہ پاتا جہاں بالآخر اس کو سرمایہ داروں نے شکست سے دوچار کر دیا۔

مزے کی بات دونوں نظاموں کی یہ ہے کہ دونوں کی پشت پر یہودی کھڑے ہیں جو بہر صورت دنیا بھر کے سرمائے پر قابض رہنا چاہتے ہیں۔ دونوں نظام ہی اپنی عملی شکل میں غیر فطری اور عام انسان کے حقوق کا استحصال کرتے ہیں اور عملاً سرمائے کا ارتکاز کرتے ہوئے معاشیات کے بنیادی اصولوں کی نفی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان سرمائے کا غلام بن کر رہ گیا ہے اور سرمایہ چند ہاتھوں میں مرتکز ہوتا جا رہا ہے۔

لہٰذا بڑے وثوق سے یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ عنقریب سرمائے کے ارتکاز کی موجودہ یکطرفہ جنگ یا دوڑ انسان کو ایٹم بموں کے ذریعے موت سے ہمکنار کرنے والی ہے۔ اور انسان کے دم توڑتے ہی دونوں مصنوعی نظام زمین بوس ہو جائیں گے۔ پھر نہ مزدوروں کے استحصال کے نعرے کو استعمال کر کے سرمایہ اکٹھا کرنے والا اشتراکی نظام زندہ رہے گا اور نہ مارکیٹ اکانومی کی نظریں خیرہ کر کے سرمایہ اکٹھا کرنے والا دزدیدہ نظام۔

بس اپنی منطقی موت سے قبل فنڈ ڈ فلاسفر اپنی اپنی ڈفلی بجالیں جتنی بجاسکتے ہیں۔ اور لہو گرم کرتے رہیں اپنا اور ان چند فلسفیوں کا جو چند کتابیں پڑھ کر آسودگی کے ماحول میں غریب کے نام پر فلسفے گھولتے رہتے ہیں اور انسانیت صنعتی ترقی کے باوجود غربت کی بھٹی میں سسکتی تڑپتی رہے۔

محترمہ فاطمہ جناح کی کتاب، میرا بھائی، سے اقتباس

تبصرہ۔

از ڈاکٹر سلطان محمود

کیا کوئی گورنر جنرل اس طرح مرتا ہے؟ اس سازش کے کرداروں میں سب سے زیادہ جس کا نام آئے گا وہ لیاقت علی خان کا ہی ہے۔ جن کو خود قائد نے اپنے مرنے کے بعد بھی چہرہ دکھانا مناسب نہ سمجھا۔ باقی دو کرداروں میں قاضی عیسیٰ اور شاہنواز تھے۔ اگر کوئی بھی تاریخ کو انتہائی غیر جانبدارانہ ٹٹولے تو وہ تمام خفیہ ہاتھ نظر آجائیں گے جو قائد کو جلد از جلد رخصت کر کے عنان اقتدار سنبھالنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ مثال کے طور پر ایوب خان نے بحیثیت کیپٹن ڈھاکہ ائیر پورٹ پر قائد کو سلوٹ نہ کر کے اپنے تمغے نچوائے تھے اور اس کے بعد ایک درجہ تنزلی بھی پائی۔

میں سب سے درخواست کروں گا کہ مندرجہ بالا کتاب کے علاوہ کرنل الٰہی بخش، محمد صفدر، کے کے عزیز اور سیگل وغیرہ کے مضامین اور کتابوں سے بھی استفادہ کریں تا کہ پتہ چلے کہ پاکستان کو بنتے ہی کن لوگوں نے اپنی جاگیر بنالیا تھا؟ اور یہ آج تک کن ہاتھوں میں یرغمال ہے؟

انسان کی لاش پر اناء کا رقص

از ڈاکٹر سلطان محمود

اس تحریر کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

سیاست سے بالاتر ہو کر اور اپنے لیڈر کے گوبر کو گاجر کا حلوہ ثابت کرنے والے جاہلین مطلق ذرا اس قتل پر روشنی ڈالیں جو نااہل وزیر اعظم کی ریلی کا شکار ہو گیا۔ نواز، الطاف، قادری، عمران، زرداری، سراج، فضل یا پھر ایوب، بھٹو، یحیی، ضیاء، بینظیر اور مشرف وغیرہ سے ذرا بلند تر ہو جائیں اور لیڈر کی تعریف کریں۔ نااہل رہنما نے ثابت کر دیا کہ وہ نام نہاد لیڈر ہے۔ اگر وہ اصلی رہنما ہوتا تو اس موقع پر ریلی ختم کر دیتا جس کے لئے چاہے اس نے کروڑوں روپے خرچ کر کے لوگوں کو بلایا ہوتا یا کم از کم، لیڈر، بچے کے جنازے میں شامل ہوتا اور مقتول کے خاندان کے دکھ کو کم کرنے کے لئے بیس پچیس لاکھ روپے ادا کر دیتا۔

جس دور میں لٹ جائے غریبوں کی کمائی

اس دور کے آقا سے کوئی بھول ہوئی ہے

جو حکومت اپنے جیسے طالع آزما طبقے کی لینڈ کروزر گزارنے کے لئے غریب کی تعلیم اور صحت کے کھربوں روپے سڑکوں پر لگا دے اور جس کے نتیجے میں غریب سسک سسک کر ہسپتال پہنچنے سے قبل مر جائیں، ہسپتال میں جگہ نہ ہونے کے باعث مریض کو لاشوں کے ساتھ لیٹنے پر مجبور کر دیا جائے، سکول کی بلڈنگ پر جابر کا قبضہ کرا دیا جائے، ننھی بچیاں گندے نالے کے کنارے بیٹھ کر

تعلیم حاصل کریں اور ان سب سے رقم چھین کر لیڈر بیرونی ملکوں میں اتنی دولت جمع کر لیں کہ صرف جس کے دس فیصد سے ستر سالہ ملکی قرضے ادا کئے جاسکتے ہوں وہ لیڈر لعنتی نہیں ہے اس کو چننے والے لعنتی اور ملعون ہیں۔

آیئے اصل رہنما کی تلاش کے لئے عالمی میڈیا میں اشتہار دیں ممکن ہے کوئی وہ یہودی، عیسائی یا ہندو، یا پھر کوئی کافر احمدی یا کافر شیعہ اپلائی کر دے جس کو ہم مسجد میں بیٹھ کر گالیاں دیتے حب میں پھنسا دیا جائے۔

جماعت اسلامی کے مسائل

از ڈاکٹر سلطان محمود

ہماری عوام کی غالب اکثریت اپنی زندگی اسلام کے مطابق ڈھالنا قطعاً نہیں چاہتی۔ اور ہر گزرتے دن کے ساتھ ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت کے لوگوں کو تو پسند کیا جاتا ہے لیکن ووٹ سے نہیں نوازا جاتا۔

اسی سبب جماعت بہترین انسان اور نمائندے رکھنے کے باوجود ہمیشہ انتخابات ہارتی چلی جائے گی۔ لیکن پھر بھی اسے انتخابات میں حصہ لیتے رہنا چاہیئے مگر صرف اپنے کارکنوں کی آخرت میں اللہ کی خوشنودی کی خاطر وگرنہ اس تکذیبی معاشرے میں وہ مکمل طور پر غیر موزوں ہیں۔ لیکن پھر بھی بڑی بات ھے کہ اپنے آپ کو نا صرف متحد اور جمہوری طور پر یکتا پارٹی ثابت کر چکے ہیں بلکہ اس قوم کو سراج الحق صاحب جیسا دلیر اور پاکباز رہنما مہیا کر چکے ہیں۔ چونکہ ہمارے موجودہ معاشرے میں جماعت وجود تو برقرار رکھے ہوئے ہے بظاہر اسلام کے نعرے کے ساتھ، مگر حقیقت شاید یہ ہو کہ کوئی خفیہ ہاتھ اس جماعت کی برقراری کا ضامن رہا ہو تاکہ اس کو وقتاً فوقتاً قومی و بین الاقوامی محاذوں پر ایک منظم جتھے کے طور پر استعمال کر سکے جیسا کہ ماضی میں ہوتا آیا ہے۔ مگر ویسی تمام ،خدمات، کے باوجود اس قوم نے ان کو بحیثیت مذکورہ بالا وجہ کے حکمران کبھی بھی تسلیم نہیں کرنا۔ نتیجتاً اقتدار میں آنے کے لئے ان کو یا تو ضیاء الحق جیسے منافقین سے ہاتھ ملانا پڑے گا یا شاید چند سیٹوں کے عوض تحریک انصاف سے گٹھ جوڑ کرنا پڑے گا۔ مگر افسوس موجودہ حالات کی یہ صالح

جماعت اس قوم کے مزاج پر پورا نہ اترنے کے باعث جناب سراج الحق جیسے ہیرے قوم کی عدم رہبری کے باعث ضائع کر رہی ہے۔

مولانا مودودی صاحب کا سیاست میں موجود رہنے کا فلسفہ در حقیقت درست ضرور تھا مگر اس نے اس جماعت کے کارکنوں کو ایک ناقابل دسترس منزل کی جدوجہد میں ڈال رکھا ہے۔ اور مختلف اداروں کے جماعتی کارکن بھی صرف اس لئے ابھی تک زندہ ہیں کیونکہ آپس میں متحد اور نچلی سطح پر طاقتور ہیں۔ اور ان کے اندر باقی تمام سیاسی جماعتوں کے چھچھورے کارکنوں کے برعکس ایک اتحاد، تنظیم اور تمیز کا مظاہرہ نظر آتا ہے۔

اس تحریر کا مقصد صرف ان گوشوں کو اجاگر کرنا تھا جن کے بارے میں شاید اندر کے کارکن اظہار نہیں کر پاتے ہوں گے۔ اور قیادت ان حقائق کو تسلیم کرنے کے باوجود کسی اور طاقت کی پلاننگ کے انتظار میں رہتی ہو گی۔ جو بھی وجوہ ہوں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ جماعت اسلامی کبھی بھی عوامی جماعت نہیں بن پائے گی۔ وجہ یہ ہے کہ عوام صالح نہیں اور جماعت کا معیار عوام کے معیار سے بے حد اونچا ہے۔

احمق مسلمان

از ڈاکٹر سلطان محمود

(1) القاعدہ، ائی ایس ائی ایس اور بے شمار دیگر تحریکوں میں نام مسلمانوں کا استعمال ہوتا رہا مگر ان کے اصل بانی وہ یہودی تھے جنہوں نے ایک خاص سکیم کے تحت اپنے بچوں کو مسلمان بنا کر ان تحریکوں کو برپا کر کے مسلمانوں کا ہی قتل عام کیا۔ اور (2) دوسری حقیقت زیادہ پریشان کن ہے یعنی مذہب کے ذریعے قتل و غارت۔ پہلے نادان ملاوں کے ذریعے مذہبی شدت کو ابھارا جاتا ہے اور ازاں بعد یہودی فارمولے پر عملدرامد کرایا جاتا ہے۔ نتیجہ مسلمان کی بربادی کی شکل میں برامد ہو چکا ہے۔

اگر ہم اپنی صفوں کا بغور جائزہ لیں تو لبرل اور فرقہ پرست دونوں طرح کے مسلمان مختلف رنگ کی چھریوں سے اپنے ہی دین کو مٹا رہے ہیں۔

فوڈ مافیا اور غذائی اشتہارات

از ڈاکٹر سلطان محمود

اکثر ٹی وی چینلز ایسے غذائی برانڈز کے اشتہارات دکھاتے ہیں کہ عوام سچائی جان نہ پانے کے سبب ان کا بے دریغ استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ حال ہی میں معلوم ہونے والے غذائی ملاوٹوں کے بارے چند حقائق مندرجہ ذیل ہیں:

■ بچوں کے لئے تیار کردہ جیلی میں حرام اور مردہ جانوروں کی ہڈیاں پیس کر ڈالی جاتی ہیں۔

■ کوکنگ آئل اور گھی میں صابن بنانے والا پام آئل ڈالا جاتا ہے۔ انسانی جسم کا درجہ حرارت 37 ڈگری ہوتا ہے جبکہ فیل ہونے والے کچھ آئل 65 سے 70 ڈگری پر پگھلتے ہیں۔

■ تیل کے کچھ برانڈ یورپ سے استعمال شدہ اس تیل کو بیچتے ہیں جہاں اس تیل میں خنزیر فرائی ہوتا تھا۔ اس میں ہم نمکو، سموسے اور پکوڑے تلتے ہیں۔ کچھ برانڈز مردہ جانوروں کی چربی ڈالتے ہیں۔

■ لوکل طور پر فرائی کرنے والا تیل مردہ جانوروں کی ہڈیوں سے کشید کیا جاتا ہے۔

■ ٹینگ پاوڈر نوش کرنے کے قابل نہیں۔

■ بلیو بینڈ نہ تو مکھن ہے اور نہ مکھن کا نعمل البدل ہے۔

■ والز اور اومور آئسکریم کے نام پر بکنے والے فروزن ڈیزرٹ ہیں۔

■ ٹی وائیٹنز جو دودھ کے طور پیش ہو رہے ہیں وہ دودھ نہیں ہیں اور نہ ہی دودھ کا نعم البدل ہیں۔ اس میں ایوری ڈے بھی شامل ہے۔

مشرف کا کردار بحیثیت نیم فوجی نیم جمہوری حکمران

از ڈاکٹر سلطان محمود

کسی دوست نے مشرف کا مقدمہ شاید مال لے کر یوں لڑا ہے کہ بقول اس کے یہ فوجی دس بار موت کے منہ سے بچ کر بالآخر صدارت کی کرسی تک پہنچا۔ ہم نے بھی 2011 میں دورہ چترال کے موقعہ پر تجویز دی تھی کہ اگر اللہ (A) نے اس جرنیل کو بار بار موت کے منہ سے بچایا اور امریکہ (A) نے اس کو پسندیدہ قرار دے کر افغانستان پر قبضے کے لئے منتخب کر لیا تو ہماری آرمی (A) کے لئے یہ شخص غالباً بہترین انتخاب برائے حکومت ہو سکتا ہے بشرطیکہ اسے سیاسی ڈرائی کلین کر کے اقتدار سونپ دیا جائے۔ کیونکہ اس کے پاس شاید AAA ٹرپل اے کی بھرپور پسندیدگی کی مہر تو بحر حال پہلے سے موجود ہے۔ نیز پاکستان بھی بار بار کے خالص فوجی تجربوں سے محفوظ رہ کر سابقہ ترکی کی طرز پر نیم فوجی اور نیم جمہوری شخص کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکے۔

برا ہو ہماری شریر یادداشت کا کیونکہ ہمیں اس کے دس دفعہ کے موت کے منہ سے بچ رہنے کے ساتھ ساتھ کوئی لگ بھگ دس ہی مرتبہ اخلاقی طور پر مر جانے کے واقعات بھی یاد آ رہے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ریٹائرڈ جرنیل صاحب زندگی اور موت برابر کر چکے۔ اب عوام خود فیصلہ کر لے اور 2018 کا انتخاب جتوا دے تو ہم بھی اس کے حق میں ہو جائیں گے کیونکہ ٹرپل اے سے پھڈا لینا ہمارے بس سے قطعی طور پر باہر ہے۔ یا اگر اس کے لئے زمین ہموار کرنے میں ابھی وقت درکار ہو تو وقتی طور پر ٹیکنو کریٹس کی حکومت بنا کر وقت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے محترم کی دس اخلاقی اموات:

1۔ افغانستان میں امریکی دراندازی سے قبل سہولت کار کے طور پر امریکہ کی مدد سے جمہوری حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قابض ہوا اور پہلی دفعہ اخلاقی طور پر مر گیا۔

2۔ پھر امریکہ کے افغانستان میں گھستے ہی ان کے ٹرینڈ نمک خوار کے طور پر ان کی ساری شرائط مان گیا۔ اور دوسری دفعہ اخلاقی طور پر مر گیا۔

3۔ آزاد کشمیر بارڈر پر باڑ لگوا کر مجاہدین کو روکے رکھا اور بھارت کو کشن گنگا ڈیم بنانے کا بھرپور موقع فراہم کیا۔ اور تیسری دفعہ اخلاقی طور پر مر گیا۔

4۔ ام کیو ایم کے بھارتی ایجنٹ الطاف کی بھرپور پذیرائی کرتا رہا اور کراچی میں تاریخی دہشت گردی کا مرتکب ہوا۔ اور چوتھی دفعہ اخلاقی طور پر مر گیا۔

5۔ باقی آئندہ۔۔۔۔۔۔

مسلمان ممالک کی لوٹ کھسوٹ

از ڈاکٹر سلطان محمود

ممکن ہے اوبامایا دیگر امریکن صدور کے مسلمانوں کے بارے خیالات ان کے ذاتی ھوں یا کوئی قومی پالیسی مگر ان سب کے دور میں دنیا بھر کی امیر مسلم اقوام کی تباہی بتاتی ہے کہ جس مسلم ملک کے پاس بھی دولت، تیل یا معدنیات ہوں گی ان کو لیبیا کی طرح برباد کر کے لوٹنا یا سعودیہ کی طرح ڈرا دھمکا کے لوٹنا البتہ امریکہ کی قومی پالیسی ہے۔ یورپ بھی اب امریکہ سے ناراض نظر آتا ہے کیونکہ امریکہ کے ساتھ مل کر لوٹ مار کے بعد ان کو پھر وعدے کے مطابق پورا حصہ نہیں ملتا۔ اگر باریک بینی سے جائزہ لیں تو مستقبل میں جن ممالک کے لوٹے جانے کا پکا پروگرام ہے ان میں افغانستان، ایران اور بلوچستان اب اگلے ہدف ہیں۔ اب مسلمان ممالک کو چاہیئے کی یونہی عیاشی اور نیند کے مزے لیتے رہیں کیونکہ اب جاگنے اور بچنے کی کوئی امید نہیں بچی۔

شخصیت پرستی کی بجائے ترقی پسندی

از ڈاکٹر سلطان محمود

کسی رہنما کے کام اور پیغام سے زیادہ اگر اس کی شخصیت سے محبت یا نفرت ہو جائے تو دراصل یہی شخصیت پرستی کہلاتی ہے۔ اور ثقہ بند حقیقت ہے کہ شخصیت پرستی دراصل جہالت کی بنیاد ہے۔ اور بدقسمتی سے اگر کسی شخصیت سے شدید محبت یا شدید نفرت ہو جائے تو یہ بذات خود شدید جہالت کی علامت ہے۔ کیونکہ پھر مقتدی کی توجہ اپنے مرشد یا رہنما کے پیغام سے ہٹ کر اسکی ذات کی طرف بھٹک جاتی ہے۔ ہمیں چاہیئے اعتدال میں رہیں۔ تدبر سے کام لیں اور مدبر کہلائیں۔ نہ تو نواز، شہباز، عمران، مشرف، سراج، ضیاء، بھٹو یا زرداری وغیرہ حقیقی رہنما ہیں اور نہ ہی حقیقی دشمن۔ ان میں سے کسی کی گائے کا گوبر گاجر کا حلوہ نہیں اور نہ کسی کی گاجر کا حلوہ گائے کا گوبر ہے۔ ان سب رہنماوں کے کردار شیطان کے پرچارک جیسے بھی نہیں لیکن رحمان کی منشاء کے مطابق بھی نہیں۔ بس بیچوں بیچ کے منافقانہ سے ہیں۔ بجائے ان کی شخصیت میں خوبیاں یا عیب ڈھونڈنے کے ہمیں خود اپنی شخصیت کا بھرم رکھنا چاہیئے اور صرف ایک اشاریئے پر اپنے اپنے، رشک قمر، کا تجزیہ کرنا چاہیئے اور ہماری نظر میں وہ ہے کہ، کس نے کتنا قوم کو معتبر بنایا؟۔ آپ دیکھیں گے کہ اس حمام میں پھر سب ننگے ہی نظر آئیں گے۔

پاکستان میں افراتفری کے اسباب

از ڈاکٹر سلطان محمود

اس دور میں عدم برداشت کے باعث دہشت گرد عام ہو گئے ہیں۔ اور تمام مسلمانوں کے اندر ایک عجیب سی جہالت اور خجالت طاری ہے۔ اس لئے مذہب میں فرقے اور سیاست میں پارٹی کے نام پر مارا ماری جاری ہے۔ یہ جہالت صرف پاکستان میں ہے اور اس ملک کو اندر سے تباہ کرنے کی ایک عالمی سازش ہے۔ جبکہ باقی مسلمان ممالک کو باہر سے تباہ کیا جا رہا ہے۔

پاکستان میں نیم حکیم، نیم ملا نیز نیم پڑھے لکھے، نیم شعور اور نیم نیک کوئی 99 فیصد بنتے ہیں۔ جن سے ہم اس لئے دور بھاگتے ہیں کہ وہ اپنے احساس کمتری کے باعث باقی ماندہ ایک فیصد کی خاص طور پر اور عام طور پر کسی بھی بھائی بند کی پگڑی ایک لمحے میں اچھال سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر سوشل میڈیا پر غیر جانبدار رہ کر اگر دیکھیں تو ہم جنونی ریمارکس اکثر پڑھتے رہتے ہیں جنکو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کیا ہم ایک فیصد میں آتے ہیں؟

قرآن ویسے تو عام انسان سے مخاطب ہے لیکن فوقیت چونکہ صرف تدبیر اور فکر کرنے والوں کو ہی دیتا ہے یعنی ایک فیصد انسانوں کو، وہی جو کائنات تسخیر کر سکتے ہیں، اس لئے میرا مشورہ ہے کہ ہمیں اولین کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ ان ایک فیصد میں آجائیں تاکہ یہ ایک فیصد بڑھ کر ترقی یافتہ ممالک کی طرح دس بیس فیصد ہو جائیں۔ یعنی تدبر اور فکر کرنے والوں میں۔ پھر مزہ بھی آئے گا بات کرنے کا۔ وگرنہ 99 فیصد کے ساتھ سر پھٹول کون کرے۔

مغربی جمہوریت نے majority is authority والا جو قانون متعارف کرایا ہوا ہے وہ سرے سے غلط ہے۔ اور صرف طالع آزمائی ہے اور نتیجہ اب دنیا بھر میں تباہی کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔ اس اصول کے اور فوائد تو ہیں مگر انسانی ترقی اس اصول سے ہر گز نہیں ہو رہی۔ اور پاکستان میں تو یہ اصول عدم برداشت اور جنونیت کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اور شکار سارا معاشرہ ہو رہا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء کے ادوار کے علاوہ تمام غیر مسلم ترقی یافتہ ممالک کی ابتدائی کامیابیاں بھی انہی ایک فیصد کے ذریعے مکمل ہوئیں۔

قران سمجھنے والے جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو نہ کبھی خطرہ ہوا تھا نہ ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ یہ ناموس رسالت والا شوشہ غیر ملکی سازش سے ہماری سیاست میں ڈالا گیا ہے تا کہ جنونی لوگ پیدا کر کے اس ملک میں فرقہ ورانہ خانہ جنگی کرائی جائے۔ اسی طرح سیاست میں بیرونی فنڈنگ سے ایسے غدار رہنما پیدا کئے گئے ہیں اور ان کو وقتاً فوقتاً حکومتیں بھی دلوائی گئی ہیں تا کہ وہ اس مملکت خداداد کی جڑوں، یعنی 60 فیصد نوجوانوں، کے اندر عدم برداشت اور دہشت گردی پیدا کر دیں اور ہمیشہ احمق عوام کا خون چوستے رہیں۔ غدار رہنما کی ایک ہی نشانی ہے کہ اس کا سرمایہ اور فیملی اپنے آقا کے ملک میں ہوتی ہے۔ وہ صرف احمق عوام کو مزید بے وقوف بنا کر حکومت کرنے پاکستان آتے ہیں اور برے وقت میں فوراً باہر بھاگ جاتے ہیں۔ لیکن جاتے جاتے انتہائی احمق ووٹروں کو اپنے ہی بھائی بندوں پر بھونکنے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ دیکھ لیں مندرجہ بالا دونوں کام پاکستان میں ہو رہے۔

7۔ سسرالی شلوار سوٹ

کالم 322 از ڈاکٹر سلطان محمود

مورخہ 6 مئی 2020

آج ہم سسرالی تحفے میں دیئے گئے اس شلوار سوٹ کی تعریف فرمائیں گے کہ جس کے ذکر ہی سے مرحوم سسر صاحب کے درجے عالم بالا میں بلند ہو جائیں گے۔ دراصل یہ سوٹ سسرال میں چھ برس رہا۔ سسر کے اس دار فانی سے رخصت ہوتے ہی ہمیں برکت کے طور پر یہ ہدیہ کر دیا گیا۔ ہم نے بھی عقیدت کے جذبے کے تحت اس عظیم سوٹ سے نو برس میں لگ بھگ ساڑھے چار سو جمعے اور اٹھارہ عیدیں پڑھ کر اپنے اللہ کو راضی کرنے کی بھرپور کوشش کر ڈالی۔

چوتھی دفعہ جب یہ شاندار سوٹ رفوگر سے واپس آیا تو اس کا بخیہ واشنگ مشین میں کہیں پھنس جانے کے باعث شلوار کچھ ایسی جگہ سے پھٹی کہ بھرم رہ گیا اور لمبی قمیض نے مزید ایک سال اس سوٹ کی پردہ پوشی اور ہماری ستر پوشی کی۔ پھر بد قسمتی سے ایک روز ہماری سائیکل میں اس مبارک سوٹ کی قمیض آ گئی مگر چار انچ چھوٹی کروانے کی برکت سے دو برس سوٹ مزید چل گیا۔ قمیض کی جیب کے پھٹتے ہی ہم نے شلوار والی بیکار جیب وہاں لگوالی۔ اور خوبصورت سی کڑھائی کرالی تاکہ اس کے سوراخ نظر نہ آئیں۔

ایک بار سسرال کے پائیں باغ کی باربڈ وائر سے دائیں کف پر ایک لکیر سی بن گئی جسے ہم نے سسرال ہی کی کارستانی سمجھ کر چھ ماہ تک درخور اعتنا نہ

سمجھا۔ مگر ایک دن ہم بیگم سے نظر بچا کر ذرا جلدی میں بائیں کف سے بہتی ناک رگڑ کیا بیٹھے کہ بھتیجے نے دور سے اس کی چمک نوٹ کر کے برخوردار بچے کی طرح فوراً اپنی امی کو جا بتایا۔ بھابی محترمہ نے حفظ مراتب کے تحت دھوتے وقت اس چمکدار کف کو ذرا زیادہ رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کی تو اس پر توہین عدالت جیسا داغ سالگ گیا۔ جس کا نوٹس بیگم نے لے کر مشورہ دیا کہ بازو آدھے کروالیں جسے بالآخر طوعاً و کرہاً ماننا ہی پڑا۔ اس تاریخی سوٹ کا موجودہ ڈیزائن تو یار لوگوں نے ناک بھوں چڑھا کر قبول کر ہی لیا تھا کہ اب مسئلہ یہ ہوا کہ سجدے جاتے کالر کا پھٹا ہوا اندرونا نظر آنے لگ گیا

تھا۔ بھابی سیانی نکلی اور کالر کا بین بنا کر اس عظیم تحفے کی موت کو پھر ٹال دیا۔

بیگم چونکہ خود بھی ابو کی نشانی تھیں اس لئے انہوں نے اس سوٹ کو آخری نشانی سمجھ کے کبھی پھینک دینے یا کسی غریب کو دینے کا مشورہ نہ دیا۔ زچ ہو

کر ایک دن ہم نے نظر بچا کر ذرا سی کوشش سے قمیض کو ایسی جگہ سے پھاڑا کہ اب کوئی مائی کا لال اسے استعمال نہ کر سکتا تھا۔ لیکن ہماری حیرت کی انتہا

نہ رہی جب بیگم نے قمیض کو جالے اتارنے کے لئے رکھ لیا اور شلوار سے ننھے کے پانچ جانگئیے بنا ڈالے۔ اب وہ ابا کی نشانی کو ننھے کی ہر چھیچھی کے

بعد لکس سے دھونے لگ گئیں۔ مگر وہ جب بھی میری مرحوم قمیض سے پنکھے کے پر صاف کرتی تھیں تو مجھے ایسا لگتا کہ سینے پر کرنٹ لگ رہا ہے۔

اب آپ سے کیا پردہ۔ اس تاریخی سوٹ سے اب بھی فرش پر پوچا مارا جاتا ہے۔ اگلے روز جب ہماری بائیک کا کپڑا کہیں گر گیا تو اسی قمیض کی بچی کھچی لاش کا ٹکڑا کام آیا ہے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ سسر محترم نے اپنی بیٹی اور یہ سوٹ اگر ہمیں نہ دیا ہوتا تو آج وہ اتنے سکون سے قبر میں ہر گز نہ لیٹے ہوتے۔

Article Published in the Writers Cafe. On 23 May 20 at 2:40 am

کیا ہم ایک حقیقی جمہوریت بن سکتے ہیں؟

CAN WE BECOME A REAL DEMOCRATIC COUNTRY?

سسرالی شلوار قمیض اور اس کالم کا نمبر 322 بھی تھا میں دونوں کی ڈیٹ دیکھ کر اس کالم کو 323 نمبر دیدیا۔ انعم

Column by DR SULTAN MAHMOOD 323

11May2020

سادہ جواب کبھی نہیں ہے۔ کیوں؟

کیوں کہ کوئی فیصلہ ساز، حتیٰ کہ پاکستان کا سب سے پڑھا لکھا شخص بھی نہیں جانتا کہ حقیقی جمہوریت کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں حقیقی جمہوریت نہیں ہے۔ مغرب میں موجودہ نام نہاد جمہوریت در حقیقت ایک قسم کی تسلط پسندی (پیسے کی بنیاد پر) ہے جہاں نمائندوں کو فنڈز کی بنیاد پر منتخب کیا جاتا ہے جو وہ مختلف قانونی یا غیر قانونی وسائل سے ترتیب دیتے ہیں۔ یہ صاف ستھری تسلط پسندی کی ایک عام مثال ہے لیکن جمہوریت کے بھیس میں۔

حقیقی جمہوریت میں بہترین، دیانتدار، صاف ستھرے اور مخلص امیدواروں کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے اور وہ اپنی برادری کے لیے ان کی ذاتی خدمات کی بنیاد پر منتخب ہوتے ہیں۔ اسکینڈینیوین ممالک، باقی یورپ، جاپان اور امریکہ حقیقی جمہوریت کے قریب ہیں لیکن پھر بھی ایک غریب

آدمی اپنے پورے حلقے کی خدمت نہیں کر سکتا جو صرف ایک لاکھ افراد پر مشتمل ہے جو ایک متعین حدود میں قید ہے۔

پاکستان نہ تو حقیقی جمہوریت سے لطف اندوز ہو سکتا ہے اور نہ ہی حقیقی تسلط پسندی کیونکہ عوام جھوٹ اور آبائی سیاست پر یقین رکھتے ہیں، جیسے پی پی پی، پی ایم ایل این، اے این پی پی ایم ایل کیو یا وہ الطاف کی قیادت والے ایم کیو ایم جیسے مقامی دہشت گردوں کو ووٹ دینے پر مجبور ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں کوئی بنیادی جمہوری نظام موجود نہیں ہے اس لیے نچلی سطح سے کمیونٹی سروسز کی ضمانت نہیں دی جاسکتی، اس طرح شروع سے ہی لوگوں اور ان کے نمائندوں کی تربیت نہیں کی جاسکتی۔

تیسری وجہ، ہمارے حلقے بے ترتیب ہیں۔ مثال کے طور پر، ایک مدمقابل بعض اوقات 150 ہزار ووٹ حاصل کر کے سیٹ ہار جاتا ہے لیکن اس کا پڑوسی اس میں سے نصف بھی حاصل کر کے جیت جاتا ہے۔

سول اور ملٹری بیوروکریسی جیسی اعلیٰ ترین پوشیدہ طاقتوں کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، یہ پاکستان میں انجینئرڈ جمہوریت کی ایک بڑی رکاوٹ کے طور پر ایک اور حقیقی وجہ ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم مذہبی طور پر ایک منافقانہ معاشرہ ہیں اور ہمارے دنیاوی اعمال کے مقابلے میں ہمارے دلوں میں نام نہاد شخصیت پر مبنی اسلامی عقائد میں اب بھی کنفیوژن موجود ہے۔ ایک اسلامی خلافت، مثال کے طور پر عمر کا دور، حقیقی جمہوریت کے لیے بہتر دلیل ہے یا حقیقی

جمہوریت کی مغربی تعریف کے قریب، لیکن ہم اس معاملے پر اس لیے بھی تقسیم ہیں کہ شیعہ اور سنی کے الگ الگ ماڈل ہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ ہم ایک بدقسمت قوم ہیں، کیونکہ اس مادی دنیا یا اللہ پر بھی کوئی صاف اور خالص ایمان نہیں ہے۔

Simple answer is NEVER. Why? Because no decision maker, even the most literate person in Pakistan knows what is real democracy?

As a matter of fact, there is no any real democracy in any country of the world. Present so-called democracy in the West is actually a type of plutocracy (money based) where representatives are elected on the basis of funds they arrange from various legal or illegal resources. That's a typical example of clean plutocracy but in disguise of democracy.

In real democracy, there is a contest between the best, honest, clean and devoted contestants and they are elected on the basis of their personal services to their community. Scandinavian countries, rest of Europe, Japan and America are closer to real democracy but still a poor man can't serve his entire constituency

which is comprised of only 100k persons confined in a defined boundary.

Pakistan can neither enjoy real democracy nor the real plutocracy because public believes on lies and ancestral politics, like PPP, PMLN, ANP PMLQ or they are forced to vote to local terrorists like Altaf lead MQM, for instance.

Second reason is that there is no basic democratic system in place in Pakistan so community services can‹t be guaranteed from grassroots level, thus no training of the people nor their representatives from the start.

Third reason, our constituencies are erratic. For instance, a contestant sometimes loses a seat by securing 150k votes but his neibour wins by securing even half of that.

Needless to mention supreme hidden powers like civil and military bureaucracy, this is another genuine reason of an engineered democracy in Pakistan as a big hurdle.

Above all, we are religiously a hypocritic society and still confusion prevails in our so-called personality centred Islamic faiths in our hearts comparing to our worldly actions. An Islamic caliphate, for example Umar era, is better argued for a real democracy or closer to western definition of real democracy but we are divided on this issue also because Shia and Sunni have different models.

Last but not least, we are an unfortunate nation, because of not having any clear and pure faith on this material world or even on Allah.

یونہی چراغ لالہ روشن نہیں ہوا۔۔۔

کالم 325 از ڈاکٹر سلطان محمود گڈ سلطان

17 جون 2020

کئی پیارے دوست معترض تھے کہ آپ طنزیہ پوسٹوں کو گن گن کر کیوں لگاتے ہیں۔ مثلاً میٹھا سچ 200 وغیرہ۔ میں جواباً منمناتا تھا کہ درحقیقت میں تیز رفتار لکھاری ہوں اردو انگریزی کا برابر برابر اس لئے یہ گنتی والا سپیڈو میٹر میری مدد کرتا ہے کہ کوئی بھی طبعزاد لائن گم نہ ہونے پائے۔ میری موجودہ طنزیہ پوسٹ 200 ویں نہیں بلکہ کوئی 500 ویں ہو گی پچھلے دس سالوں میں علاوہ 350 اخباری کالمز کے۔ مگر جو "فرمودہ" کتابی شکل میں ڈھل جاتا ہے میں پٹھان کی طرح گنتی پھر ایک سے شروع کر دیتا ہوں۔

پہلے 150 اخباری کالمز پر مشتمل پہلی طنزیہ کتاب "میٹھا سچ" میں نے چھاپ دی 2019 میں۔ پھر اگلے کوئی 100 اخباری کالمز اور 200 پوسٹوں پر دوسری طنزیہ کتاب "شوگر کوٹ" وجود میں آئی 2020 میں۔ اس کے بعد اسی سال "بونا مفکر" کے نام سے 200 پوسٹوں اور چند کالمز پر مشتمل کتاب تیار پڑی ہے جبکہ مزید 50 کے قریب کالمز بغیر چھپے پڑے ہیں جن کو لاک ڈاون کے دوران "سلطانی گواہ" کے نام سے اکٹھا کر دیا ہے۔ اس طرح سیاست و مذہب وغیرہ پر طنز و مزاح کی 4 کتابیں مکمل ہو چکی ہیں۔

مندرجہ بالا چار طنزیہ کتابوں کے علاوہ 11 کتابیں دوسرے موضوعات پر بھی ہیں۔ یعنی 8 کتابیں تو میرے بنیادی مضمون یعنی خوراک و غذا اور صحت پر ہیں۔ چار انگریزی اور 4 اردو میں۔ دو کتابیں

انگریزی میں میرے ثانوی مضمون ماحولیات کے عنوان سے ہیں جبکہ 324 غزلوں پر مشتمل ایک شاعری کی کتاب "وہ مسافر بھی گیا" بھی ہے جسے میں ناخلف بچہ سمجھتا ہوں کیونکہ جوانی مستانی کے زور میں نجانے کیا کیا بکتا رہا۔ اور اب چار ڈائریوں نے لاک ڈاون محسوس ہی نہیں ہونے دیا۔

پہلے پہل میں یہ سب شیطانیاں قرطاس پر منتقل کرتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے بیس برس گزر گئے۔ پھر مجھے لیپ ٹاپ پر اردو بھی لکھنی آگئی تو پھر سارے کا سارا کاٹھ کباڑ میرے دو ساتھیوں یاسر قریشی اور انعم عروج نے کمپیوٹر پر سجا دیا جن کا شکریہ ادا کر کے میں فارغ نہیں ہونا چاہتا کیونکہ میں ہمیشہ ان دونوں کا زیر بار احسان رہنا چاہتا ہوں۔ پھر وہ منحوس دن بھی آگیا جب سیل فون نے لیپ ٹاپ والے سارے فیچر چھین لئے۔ منحوس اس لئے کہ میرا سارا خاندان اور پیارے دوست آہستہ آہستہ نظروں کے سامنے رہنے کی بجائے اسی سیل فون کے پیچھے چلے گئے۔ مجھے یہ اب بھی سہل لگتا ہے کہ ادھر کسی خیال نے مغز پر چاندماری کی اور وہیں سے یہ قرطاس یا لیپ ٹپ پر پہنچنے سے قبل ہی ہتھیلی پہ رکھے سیل فون کے ذریعے فیس بک کے توسط سے دنیا کے پانچ براعظموں میں پھیلے دس ہزار کے لگ بھگ سوشل میڈیا کے دوستوں تک پہنچ جانے لگا۔

ازاں بعد ایک نئی برائی میں نے ایجاد کر کے دوستوں میں بھی پھیلا دی کہ جو مزید وقت کھاتی رہی نیز جس پر میرے دوستوں کے گھر والے مجھے اور میرے گھر والے انہیں صلواتیں سناتے ہونگے۔ وہ تھا کہ ہر پوسٹ کو سوشل میڈیا کے سمندر میں غرق کر کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو ای میل بھی کرتے چلے جانا۔ وقت تو لگ گیا مگر میں اپنے دوست حضرت محمد انور مسعود اور دوسرے بڑے ہی حضرت انجینئر ریاض اپل کی طرح ایک دن بھی اکاونٹ بلاک ہونے سے نہ ڈرا اور میرا لکھا ایک لفظ بھی ضائع نہ ہوا بلکہ آج مجھے تیسری بار جو ایک ماہ کیلئے اکاونٹ بلاک کئے جانے کی دھمکی فیس

بک نے دی ہے اس نے میرے اندر قطعاً کوئی سنسنی پیدا نہیں کی۔ میرے دونوں دوست حضرات کی آٹھ دس برس کی محنت جب ضائع ہوئی تو وہ اپنے گلہائے نمایاں سمندر برد ہونے پر ہارے ہوئے ملاح کی طرح ساحل پہ بیٹھ کر گریہ وزاری کرتے پائے گئے بالکل ایسے جیسے ملاح کشتیاں ڈبو چکے ہوں۔

اب آتا ہوں اس خاص بات کی طرف کہ مجھے کس شخصیت نے کتابیں بناتے چلے جانے اور جمع کرتے چلے جانے کا رستہ دکھایا۔ مگر پہلے سردار جی کا صدی پرانا لطیفہ۔ سوئمنگ پول میں بچہ گر کر ڈوبنے لگا تو ایک سردار جی نے جھٹ سے چھلانگ لگائی اور اسے بچالائے۔ لوگوں نے سردار جی کا تالیوں سے استقبال کیا اور انہیں انعام دینے کی تقریب برپا کر ڈالی۔ جب سردار جی کی بولنے کی باری آئی تو فرماتے ہیں کہ "پہلے وہ بندہ ڈھونڈو جس نے مجھے پول میں دھکا دیا تھا"۔ تو صاحبان قدر دان مجھ جیسے سردار کو بحر قرطاس میں دھکا دینے والے ہیں مارول سسٹمز کے پرنسپل کنسلٹنٹ ہمارے گہرے دوست اور ہماری کمپنی کے رہنماء جناب میاں وقار صاحب۔ میں نے لکھنا اور چھپوانا ان کی پیدائش سے پہلے سے ہی شاید شروع کر رکھا ہو گا مگر ان کے مشوروں میں نجانے کیسی طاقت ہے کہ "نہ نہ کرتے پیار تمہی سے کر بیٹھے"۔ میں جب کتاب لکھنے کا سوچتا تھا تو جھرجھریاں آتی تھیں یعنی لکھے گا کون اور پھر اصل سوال کہ پڑھے گا کون؟ مگر انہوں نے صرف سادہ سی بات سمجھائی کہ جو جو چھپ چکا ہے فی الحال وہی جمع کر لیں۔ اور پھر میں خود ششدر رہ گیا کہ میں نے گزشتہ چالیس برسوں میں 15 کتابیں لکھ ماری ہیں اور پوری دنیا میں جس کو میرے اس سنگ میل کا علم نہیں وہ میں خود ہی ہوں۔ بھرپور تالیاں ۔۔

کیونکہ کالم 327 پہلے سے موجود ہے (اس کالم کا نمبر بھی 327 تھا) جس کی ڈیٹ 20 جون ہے۔۔ابھی تک 326 مسنگ

تھوک لگانے کے فائدے

کالم 326 از ڈاکٹر سلطان محمود

19 جون 2020

اب تو سبھی جانتے ہیں کہ کرکٹ کے کھیل میں فاسٹ باؤلر جب گیند چمکانے کے لئے اسے تھوک لگا کر پینٹ سے رگڑتا ہے تو اس سے گیند نئی نویلی دلہن کی طرح ہی پرفارم کرتی ہے۔اگر وہ ایسا نہ کرے تو بیشمار چوٹیں کھا کھا کر گیند کی اوپری جلد کھردری ہو جاتی ہے جو پھر فاسٹ باؤلر کے تو نہیں مگر سپن باولرز کو فائدہ پہنچاتی ہے۔دنیائے کرکٹ جو محض جوئے کے بل پر آباد ہے وہاں پیچ کے مطابق چمکدار اور کھردری گیند کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔لہٰذا ایک بات طے ہے کہ تھوک لگانا تیز رفتاری یا تیزی کے زمرے میں آتا ہے۔

ہمارے پنجاب میں تھوک لگانا در حقیقت دھوکا دہی کے زمرے میں آتا ہے جس کا زیادہ استعمال "دھوکے" کہ وجہ سے نہیں بلکہ "دہی" کی افادیت کے باعث ہوتا ہے۔چونکہ دہی ایک نادر مکمل غذا ہے اس لئے دھوکے کے استعمال کے بغیر کسی بھی کاروبار، کھیل کے میدان حتی کہ سیاست و مذہب وغیرہ تک میں تھوک لگانا کامیابی کی کنجی سمجھی جاتی ہے۔مثال کے طور پر بار بار عمرہ کرنے سے ہر چکر پر سونے کے زیورات، ٹیم کے بعض کھلاڑیوں کا امیر ممالک میں گم جانا، بیوی اور سالے کو قتل کرا کے پارٹی اور ملکی صدارت پانا، عام جعلی شہد کو اسلامی کہہ کر بیچ دینا، دہی بڑے کا نام ارطغرل رکھ لینا نیز مزارات پر لوہے کے بڑے بڑے گلے تھوک لگانے کی عمدہ مثالیں ہیں۔

تھوک کا استعمال ایک ایسی دیسی ٹیکنالوجی ہے کہ جب بائیک کو پنکچر لگانے کے بعد چیک کرنا ہوتا تھا کہ والو لیک تو نہیں کر رہا تو پنکچر لگانے والا چھوٹا "تھوک کا تھوبا" اس پر رکھ کر چیک کر لیتا تھا۔ مشین تو بہت بعد میں ایجاد ہوئی اور وہ بھی شاید انگریز کو ہم ایشیائیوں پر شک گزرا کہ کہیں ہم ان کے ہتھے چڑھ گئے تو چھوٹے بڑے ہماری لیکیج بھی ایسے ہی نہ چیک کرنی شروع کر دیں۔ ان کو اس طریقے سے زیادہ کراہت اس بات سے آنے لگی کہ اگر چھوٹے نے دوسری بار یہی حرکت دہرائی اور انگلی منہ کی طرف لے کے گیا تو "بیمنے" کو پتہ نہیں چلنا کہ ہم پانی سے استنجا نہیں کرتے بلکہ ٹوائلٹ پیپر استعمال کرتے ہیں۔

بنک کی فرنٹ ڈیسک والی "نصف حسینہ" نے جب ہمیں تیسری بار تھوک سے نوٹ گنتے دیکھا تو چپکے سے وہ "مشین" ہمارے آگے کر دی جس سے انگلی گیلی کرتے ہیں۔ ہم خاصے شرمندہ نظر آنے لگے تو اچانک ہم نے اسے پھر سے مسکراتے پایا۔ وجہ تب سمجھ میں آئی جب ہم اصلی پنجابی کی طرح کبھی کبھار انگلی مشین پر لگاتے مگر پھر اپنی ترنگ میں انگلی منہ ہی کی طرف جاتی پائی جاتی۔ وہ نصف حسینا صرف اس لئے تھی کہ ڈیسک کی پیچھے بیٹھی تھی اور ہمارے قیام کے دوران ایک بار بھی کھڑی نہیں ہوئی۔

تندور پر تو ہمارا اچھا خاصہ جھگڑا ہوتے ہوتے ٹل گیا کیونکہ ساتھ کھڑے بزرگ نے ہمیں سمجھایا کہ سر پلاسٹک کے شاپر بیگ انگلی گیلی کئے بغیر نہیں کھولے جا سکتے۔ تنور والے بیچارے نے کونسا آپ کا نان گیلا کر دیا ہے۔ لفافہ باہر کی جانب سے کورونا زدہ ہو سکتا ہے آپ اسکے تھوک کی جگہ ہاتھ نہ لگائیں اور گھر جا کر اپنا نان دستر خوان میں منتقل کر لیں۔ ویسے اس نے آنکھ مار کے کہا کہ اگر آپ جیسا پڑھا لکھا گھر سے کپڑا نہ لائے گا تو چھوٹا بیچارہ پلاسٹک کا شاپر بیگ دینے پر مجبور ہو گا۔ ماحولیات

کے "ماہر" آپ ہیں یہ چھید اتو نہیں۔ ہم نے جونہی یہ کہا کہ تھوک لگانے کی بجائے یہ پھونک مار کر بھی توشاپر کا منہ کھول سکتا تھا تو بزرگ نے بڑے مشکوک انداز میں بابر اعوان جیسی ڈگری کا تو نہیں پوچھا مگر منہ ایسا بنایا کہ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ "جا تیرا بیڑہ غرق کورونا کہ اب ہر نتھو پھتو بھی کورونا میں پی ایچ ڈی ہو گیا ہے اور جاننے لگ گیا ہے کہ منہ کی پھونک سے نکلنے والے ننھے قطرے تو کئی ہزار کورونا کا وائرس اٹھا کے لا سکتے ہیں" ہائے میرے ربا میں کتھے جانواں؟

ایک واقعہ ذرا غیر اخلاقی سا ہے جو شرفا البتہ صرف نجی محفلوں میں سناتے دیکھے گئے ہیں۔ مگر ہمارے جرائد و اخبارات پہلے ہی ہم پر چونکہ منٹو کا ہمزاد ہونے کا الزام دھر چکے ہیں اس لئے ہم خالد احمد کی طرح استعاروں میں بات کر کے دیکھ لیتے ہیں کی آپ بھی سمجھ پاتے ہیں کہ نہیں؟ قارئین آپ بھی چونکہ شرفاء کے زمرے ہی میں آتے ہیں اس لئے آپ کو تو پتہ ہی ہو گا کہ پروفیسر ٹائپ لوگ چونکہ مطالعے کے آداب سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں اس لئے ورق پلٹنے کے لئے تھوک سے انگلی گیلی نہیں کرتے۔ اب کسی دلہن کی تقدیر میں کسی پروفیسر سے شادی لکھی گئی۔ سہاگ رات موصوف ساری رات مطالعہ کرتے رہے صرف اتنی تبدیلی اپنے عادت میں لائے کہ صفحے بھی پلٹتے رہے مگر انگلی تھوک سے بھی گیلی نہیں کی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ موصوفہ صبح طلاق لے کے چلتی بنی۔ آج کے جوانوں میں وہ صبر و حوصلہ کہاں؟

ہمارے ایک دیہاتی دوست جب بھی آئینے میں اپنا گہرا گندمی چہرہ، جسے وہ منہ کہتے تھے، دیکھنے لگتے تو پہلے آئینے پر خوب تھوک باری کر کے لنگی سے صاف کرتے رہتے تھے۔ چونکہ چہرہ پھر بھی روشن نہ ہو پاتا تھا اس لئے آئینے کی شامت آئی ہی رہتی۔ ایک روز انہوں نے ہمارے آئینے سے اپنا آئینہ

بدل کر دیکھا مگر نتیجہ حسب خواہش برامد نہ ہوا تو فرمانے لگے کہ آجکل آئینے بھی دو نمبر بننے شروع ہو گئے ہیں۔

پڑوسن کے نانا نے ہم سے مدد طلب کرتے ہوئے شکایت کی کہ عینک ساز نے معلوم نہیں گندے شیشوں والی عینک کیوں بنادی ہے۔ زور سے بھی صاف کرتا ہوں تو کسی نہ کسی شیشے پر گھی جیسے تھندے نشان رہ جاتے ہیں اور ساتھ ہی انتہائی موٹے موٹے عدسوں والا چشمہ ہمیں معائنے کے لئے پیش کر دیا۔ اب ہم چونکہ پڑوسن کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے اس لئے چشمہ پانی سے دھو کر جب نانا کو دوبارہ لگایا تو وہ بہت دعائیں دینے لگے۔ ہماری تعریفیں سن کر محترمہ نے بھی ہمیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور سوالیہ نظروں سے ترکیب پوچھی تو ہم نے نہایت احتیاط سے صرف اتنا ہی کہا کہ جب تک بزرگوں کو نزلہ زکام ہے ان سے کہیں کہ چشمہ پانی سے دھو لیا کریں۔ وہ تو خیریت گزری کہ وہ بھی ہمارے بارے میں نرم و نازک خیالات رکھتی تھیں وگرنہ ان کے چہرے پر چھائی کراہت آمیز لک سے ہمیں بہت شکایت ہوتی۔

نیازی صاحب کے موبائل فون کی سکرین جسے آجکل ڈسپلے کہتے ہیں جگہ جگہ سے ہمارے دل کی طرح ٹوٹی ہوئی تھی مگر مجال ہے کہ نیا ڈسپلے ڈلوا لیتے بلکہ ستم بالائے ستم اسے بھی ایک عدد غیر محسوس پچکاری کے بعد پیٹ سے رگڑ کے صاف کرنے کے عادی تھے۔ ایک روز ہلکی سی چیخ نکلی تو ہم متوجہ ہوئے۔ سکرین کا ایک ٹکڑا پیٹ میں چبا کھڑا تھا۔ حاضر جواب بہت ہیں۔ لہٰذا ہمیں بھی سر تسلیم خم کرنا پڑا جب فرمایا کہ ابھی بھی ہر پوسٹ صاف نظر آتی ہے۔

پپو جب بار بار ٹشو پیپر بھی لعاب دہن سے گیلا کر کے لیپ ٹاپ کا کی بورڈ صاف کرنے لگ گیا تو ہمیں ڈانٹنا پڑا کہ یہ گندی عادت پختہ نہ ہو جائے اور ہم نے اسے بازار سے گلنٹ لا دیا۔ مگر کل ہم

بے ہوش ہوتے ہوتے بچے جب دیکھا کہ وہ کی بورڈ تو گلنٹ کے سپرے سے صاف کر رہا تھا مگر ڈسپلے حسب معمول اسی ٹشو پیپر کو گیلا کر کے صاف کر رہا تھا۔ ڈانٹنے پر پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بکنے لگا کہ آپ نے تو صرف کی بورڈ ہی کا کہا تھا۔

خیر ہم بچپن کے سلیٹ صاف کرنے کے بے ہودہ اور گھن والے طریقے پر قطعاً کچھ نہیں لکھیں گے مگر ہمیں خود زیادہ کراہت اس وقت محسوس ہوتی تھی جب صاف کپڑے پہنے ہوتے تھے مگر جیب میں رومال نہ ہوتا تھا۔ معلوم نہیں غالب طارق اور اکرام وظفر گھر جا کر ہاتھ بھی دھوتے تھے یا ویسے ہی گندے ہاتھوں سے کھانا کھانے بیٹھ جاتے تھے؟ ہمیں تو ماسٹر جی کے ایک ہی تھپڑ سے سمجھ آ گئی تھی کہ سلیٹ کے ساتھ "سوفا" ڈوری کیسا تھ باندھ کر بھی سلیٹ صاف رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن شکر ہے کہ ماسٹر جی نے ہمیں کبھی ان حالات میں نہیں دیکھا جب "سوفا" بھی سوکھ جاتا تھا۔

ہمارا مردہ سکولنگ سسٹم

نمبر مسنگ

از ڈاکٹر سلطان محمود

25جون2019

ہمارا مردہ سکولنگ سسٹم سات سے گیارہ سال کے بچوں کو آٹھ مضامین کی الجھن، کتابوں کاپیوں کے غیر ضروری وزن اور امتحانات کے خوف میں مبتلا رکھتا ہے مگر سب سے کم توجہ کریکٹر بلڈنگ پر رکھتا ہے۔ پرائیویٹ سکولوں کے سستے اور غیر تربیت یافتہ اساتذہ جن کو خود سدھرنے کی ضرورت ہوتی ہے ایک دی گئی روٹین کا شکار ہو کر روبوٹ کی طرح سکول میں چار چھ گھنٹے گزار کر بھگٹٹ بھاگ کر جان چھڑاتے ہیں اور پھر ساری زندگی ان کا دماغ ننھے بچوں کے پڑھاتے پڑھاتے انہی کے درجے پر ٹک جاتا ہے اور وہ معاشرے میں ایک ناکام عضو کے طور پر ہمیشہ معطل رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچہ کارآمد شہری بننے کی بجائے رٹو طوطا بن کر ایک کھوکھلے انسان کے روپ میں کھوکھلا معاشرہ جنم دیتا ہے۔ اور استاد روٹی پانی کے چکر میں ایک بھوکا اور غیر تربیت یافتہ کنبہ معاشرے کے حوالے کر کے چلتا بنتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو تبدیلی ایک مختصر گروہ اساتذہ کی زندگی میں آتی ہے وہ یہ کہ کسی گلی محلے میں اس سے بھی بدتر سکول کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور بے وقوف والدین "نزدیکی" اور "انگریزی" کے چکر میں ٹاٹ کی بجائے کرسی اور شلوار سوٹ کی بجائے ٹائی نیکر والا احمق طالب علم معاشرتی سمندر میں کچرے کی طرح پھینک کر ازاں بعد اس کو اسکے حالوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ وہ تبدیلی ہے جو 1974 میں تعلیم کو قومیانے کے بعد ہمارے سسٹم میں آئی ہے جس نے نا صرف اس دور کے بعد پاکستان سے میٹرک کرنے والے کو کسی بھی عالمی و قومی اعزازات

حاصل کرنے کے قابل نہیں چھوڑا بلکہ تعلیم کو مشن سے گرا کر کاروباری درجے پر لا پھینکا ہے۔ ترقی یافتہ معاشروں کے مطابق جب تک ہم اپنے تعلیمی نظام میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں لاتے ہمارے تعلیمی ادارے تربیتی اداروں میں نہیں بدل سکتے۔

دیسی نظام تعلیم اور درسی کتب سے بغاوت

کالم 324 از ڈاکٹر سلطان محمود

21 مئی 2020

فنا و بقا

کالم 333 از ڈاکٹر سلطان محمود

12 جولائی 2020

اگر قران و حدیث اور سائنس کی موجودہ ترقی کو مشترکہ طور پر سامنے رکھ کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جائے تو اس معاملے کو سمجھا نہیں جا سکتا

اور یہ بے سود کوشش ہو گی۔ ہاں اگر جسم اور روح کو دو الگ چیزیں سمجھ کر تشریح کی جائے تو بات کسی حد تک سمجھ آ سکتی ہے۔

جسم کے فنا کو موت کہتے ہیں روح کی بقا کو زندگی کہتے ہیں جو فنا نہیں ہوتی۔ جسم کو مٹی میں دبا کر یا آگ سے جلا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جاتا ہے اور نہ اسے دوبارہ اٹھایا جاتا ہے اور نہ اس کی ضرورت ہی ہے۔ ہم صرف لاش کو سر عام گلنے سڑنے کے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور سڑاند

سے بچنے کی خاطر اسے دفنا کر آنکھ سے اوجھل کر دیتے ہیں۔ بس دفناتے ہی اس شخص کا قصہ ہمیشہ کے لئے ختم۔ اگر روح کی تشریح میں جائیں تو یہ معمہ حل ہو سکتا ہے کہ وہ قائم رہتی ہے یا نہیں مگر اس کا ثبوت فی الحال صرف الہامی کتابوں میں ہی دستیاب ہے۔

سائنس ابھی اس مسئلے کو حل کرنے سے کوسوں دور ہے۔ لیکن ایک نہ ایک روز سائنس نے یہ معمہ حل کر لینا ہے۔

فی الحال اپنی الجھن کی تشفی کے لئے یہی سمجھ لینا کافی ہے کہ قبر، عذاب قبر، وسعت قبر وغیرہ موجودہ انسانی عقل کے تناظر میں محض اشارے اور استعارے ہیں ورنہ حقیقت میں تو محض رنگ بازی ہے۔ ہاں قبر ایک علامت ضرور ہے جہاں ہم دعا وغیرہ کے لئے جاسکتے ہیں۔ بس نہ قبر کے اندر کچھ واقعات برپا ہوتے ہیں۔ نہ مردہ اٹھ بیٹھتا ہے نہ فرشتے اس گڑھے میں اتر کر سوال جواب کرتے ہیں اور نہ یہاں آگ یا گلستان بنتا ہے۔

روح سے جب جسم جدا ہوتا ہے تو جسم کے محسوسات یعنی لذتیں اور تکلیفیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ ہم لذت و تکلیف کے سبھی استعارے جسم کے لئے بولتے ہیں مگر الجھن میں تب پڑتے ہیں جب جسم کے ساتھ روح کے کانسیپٹ کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ انہیں ہم اپنے محدود علم میں قبر اور مردے سے منسوب کر کے بعض اوقات کاروبار بھی شروع کر دیتے ہیں جو ہمارے شاطرانہ ذہن کا کمال ہے اور آج نوے فیصد مسلمان اس کا شکار بھی ہیں۔

ہاں قرآن و حدیث کو ماننے والے بطور مسلمان کے ہم روح کا معاملہ ابھی لاینحل چھوڑ سکتے ہیں کہ اللہ اسے کیسے عذاب یا انعام دے گا۔ یا بقول حضرت

علامہ اقبال ابھی یہی مان لیں کہ جنت دوزخ کسی جگہ کے نام نہیں یہ محض محسوسات ہیں۔ اور یہ محسوسات روح کیسے باور کرے گی اس کا جواب ابھی موجود نہیں۔ بقول شاعر:

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔۔۔۔۔۔۔

حکمران کی قابلیت کو کشمیر سے جوڑ کر للکارنا

کالم 334 از ڈاکٹر سلطان محمود

12 جولائی 2020

ایک دوست فرماتے ہیں کہ کیسی عجیب بات ہے کہ مسئلہ کشمیر کے مستقل حل کے لئے مودی کی کامیابی کیلئے عمران دعا گو اور پر امید تھا اور اسی مودی نے ہندوستانی آئین میں تبدیلی کر کے مقبوضہ کشمیر کی خصوصی حثیت ختم کر کے اس کو مستقل ہندوستان کا حصہ بنالیا ہے اور ہندوستان کے لوگوں کو کشمیر میں جائیدادیں خریدنے کی اجازت دے کر کشمیر میں مسلمانوں کو اقلیت بنانے کا عمل بھی شروع کر رکھا ہے لیکن غدار پھر بھی بھٹو، بینظیر، زرداری اور نواز شریف ہیں کہ جن کے ادوار میں ہندوستان اتنا بڑا قدم اٹھانے کی جرأت بھی نہیں کر سکا تھا۔

ہم نے تحمل سے سننے کی شرط پر عرض کیا ہے کہ محترم کشمیر عالمی ایشو ہے اسے نواز زرداری کی جرأت سے جوڑنا ملک خصوصاً ایوب اور بھٹو کے ساتھ عظیم زیادتی ہو گی کیونکہ یہ دونوں حکمران جرأت مند تھے جبکہ نواز و زرداری انتہائی بزدل۔

رہا کشمیر کا موجودہ سٹیٹس تو ہم نے ادب سے عرض کی کہ آپ جیسے محقق کو علم ہو گا کہ علاقائی طاقتوں مثلاً چین، ایران، افغانستان و بھوٹان کے علاوہ

امریکہ اور پاکستان بھارت سمیت اسے تین حصوں میں بانٹ کر معاملہ حل کرنے پر متفق ہو چکے ہوئے ہیں۔ دو حصے وہ جو بھارت پاکستان کے پاس ہیں وہ انہی کے اور اب تیسرا حصہ سکم اور لداخ

چین کا۔ بھٹو نے بھی اندرا گاندھی سے یہی فارمولا طے کیا تھا مگر تب ہماری فوجی قیادت آڑے آگئی تھی۔ اگر اسی وقت کشمیر تقسیم کر دیا جاتا تو شاید آج چین حصہ دار نہ بنتا جیسے اب بن گیا ہے۔

بھارت نے یہ تقسیم تسلیم کرنے کے بعد پہلا جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور اس متفقہ منصوبے کو عملی شکل دیتے ہوئے اپنے کشمیر کو مکمل ضم کر لیا۔ چین سی پیک کو محفوظ رکھنے کے اقدامات کے طور پر لداخ اور سکم میں موجود ہے جبکہ ہم چوں چوں کا مربہ قوم یا ہجوم شخصیتوں سے ہی باہر نکل نہیں پاتے کیونکہ ہم جیسے لوگ ملک کی کریم میں شامل ہونے کے باوجود شخصیتوں کے طلسم سے یا اپنے مفادات سے یا پسند ناپسند سے باہر نہیں آپاتے اسی لئے پاکستان کشمیر پر بھارت جیسا سٹینڈ نہیں لے سکا۔ انشاءاللہ ہماری زندگی ہی میں یہ فارمولا ہمارے سامنے عملی شکل میں آجائے گا اور یہی کشمیر کا بہترین سیاسی حل بھی ہے ورنہ بم بارود اور مار دھاڑ۔

ہم نے مزید عرض کی کہ اس موضوع پر ہمارے سمیت کئی اور بھی کافی عرصے سے لکھ رہے ہیں جو آپکی نظر سے بھی گزرتا ہو گا۔ ہم نے یاد دلایا کہ جب ٹرمپ نے عمران کا ریڈ کارپٹ استقبال کیا اور باجوہ صاحب کو 21 توپوں کی سلامی دی تو اس سے قبل مودی کا بھی ایسے ہی استقبال کیا گیا تھا۔ ٹرمپ نے پہلے یہ فارمولا مودی سے منظور کرایا کیونکہ وہ جمہوری عوام کے سامنے زیادہ جوابدہ تھا۔ ہم تو خیر دیکھے سے سہم جاتے ہیں لیکن اس فارمولے کو چین نے بھی اپنے مفاد میں قبول کیا۔ امریکہ نے ثالثی کا جب کہا تو وہ حقیقتاً ثالثی کر چکا تھا۔

پاکستان اگر اس فارمولے کو تسلیم کرنے کا فوری اعلان کرتا تو پھر سوال اٹھے گا کہ اتنی بڑی فوج کی کیا ضرورت ہے اور یہی سوال بھارت پر بھی اٹھے گا

لہٰذا یہ ضروری تھا کہ ابھی دو چار برس دونوں ممالک حالت جنگ میں رہیں اور پھر آہستہ آہستہ فوجی اخراجات کم کریں۔ یہ مت بھولیں کہ ضروری نہیں اسلام مولویوں کے ذریعے پھیلے یا دنیا میں امن منڈیلا اور اردگان کے توسط سے آئے۔ ہمارے خطے کا امن باجوہ، مودی اور ٹرمپ کے ذریعے ہی اگر آرہا ہے تو اسے شخصیت پرستی سے بالاتر ہو کر خوش آمدید کہنا چاہئیے۔

(2)

پچھلے کچھ عرصے سے میرے لکھے گئے کالمز محفوظ رکھنے کے لئے ڈرافٹ سے نکال کر یہاں منتقل کئے جا رہے ہیں۔

او کون لوگ او تسی 🙏

کالم 335 از ڈاکٹر سلطان محمود

13 جولائی 2020

A message from a very small CPEC consultant, Dr Sultan Mahmood, out of hundreds of total consultants, hundreds of contractors and thousands of other vendors out of 37 countries.

سی پیک کے ایک بہت ہی چھوٹے کنسلٹنٹ ڈاکٹر سلطان محمود کا پیغام، 37 ممالک میں سے سینکڑوں کنسلٹنٹس، سینکڑوں کنٹریکٹرز اور ہزاروں دیگر دکانداروں میں سے۔

اور کبھی مشرف سے جوڑ ہمارا ملک ہی شاید واحد ملک ہو گا جس میں سی پیک کبھی نواز، کبھی زرداری کر زوردار بحث کی جاتی ہے۔ او بھائی کون او تسی

یہ سارا منصوبہ ہی چین نے بنایا ہے پیسہ بھی وہی لگا رہا ہے کنٹرول بھی سارا اسی کے ہاتھ میں ہے اور اس نے ہر ملک کے طاقتور عناصر کے ساتھ براہ

راست معاہدے کئے ہیں اور ہمارے ملک میں گارنٹی فوج نے دی ہوئی ہے۔ جس میں کسی بھی سیاستدان کا ذرہ برابر بھی کوئی کردار نہیں۔ ہاں اس منصوبے کو سست کرنے کی سازشیں ہمارے کئی سیاستدان ضرور کرتے رہتے ہیں۔

سی پیک ون بیلٹ ون روڈ OBOR جیسے عظیم منصوبے کا ایک چھوٹا سا سلائس ہے۔ عرض کرتا چلوں کہ سارے منصوبے میں بھارت اور ملائشیا جیسے بڑے ممالک بھی شامل ہیں۔ چین نے اپنی سرحد کے ساتھ لگنے والے 14 ممالک کے بشمول کل 37 ممالک کو دنیا کے اس عظیم ترین منصوبے کا حصہ بنایا ہے یہ دیکھے بغیر کہ کس ملک میں کس کی حکومت تھی یا ہے یا ہو گی۔ صرف آپکی یادداشت کے لئے عرض کر دوں کہ اس منصوبے کا ماسٹر مائنڈ چینی صدر لی پنگ شی ہے۔ اس کے اس وژن کو پاکستان کے ساتھ شروع کرانے سے لے کر اب تک ہماری چار حکومتیں بدل چکی ہیں اور تکمیل تک نجانے کتنی مزید بدل جائیں گی۔ نیز 37 ممالک میں کئی حکومتیں آتی جاتی رہیں گی جن کی پرواہ کئے بغیر چین اپنے منصوبے کو پایہ تکمیل تک

پہنچا کر چھوڑے گا۔

مجھے افسوس ہے کہ ہمارے دانشوروں کی اتنی محدود سوچ (ٹنل وژن) کیوں ہے کہ وہ پارٹی بازی کے نکتہ نگاہ سے بھلے سوچتے پھریں مگر سی پیک کو اپنی

پسندیدہ سیاسی شخصیات کے ساتھ نتھی کرنے کی بحث میں الجھ کر اصل حقائق سے کوسوں دور کیوں رہتے ہیں؟ معافی کا طلبگار ہوں۔

فرقہ پرستی کی جاہلانہ آگ

کالم XXX از ڈاکٹر سلطان محمود

10 مئی 2020

ہمارے ایک دوست کہتے میری فرینڈ لسٹ میں جتنے بھی معاویہ کے پیروکار ہیں مجھے انفرینڈ کر دیں۔

شکریہ 🙏

یہ اچانک ابھی پتہ چلا ہے آپکو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے سیاسی طرز سلوک پر تو ہم اختلاف کر سکتے ہیں مگر بحیثیت جید صحابی ان کی توہین نہیں کر سکتے۔ بلکہ کیا ہمارا منہ اور کیا مسور کی دال۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کندھوں پر غار حرا چھوڑ کے آنے والے اور کاتب وحی جیسے اوصاف والے

عظیم صحابی کے بارے میں بات کرنے سے قبل ہمیں اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھنا چاہیئے کہ کہیں ہم کسی فرقے کے پروپیگنڈے کا شکار تو نہیں ہو گئے؟ کہیں ہم جھوٹ تو نہیں پھیلا رہے؟ کہیں ہم مسلمانوں کے درمیان عین رمضان المکرم میں نفرتیں تو نہیں بانٹ رہے؟ کل کو اللہ کو جان دینی ہے محترمہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی انشاء اللہ ملاقات کرنی ہے۔ اگر محبوب خدا نے بھانپ لیا کہ ہم دنیا میں ان کے صحابہ پر لعن طعن کرتے تھے تو کہاں منہ چھپائیں گے اس کڑے وقت میں؟

مانا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ عظیم ترین صحابیوں میں سے تھے اور اولاد فاطمہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد پیاری تھی مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما

سیریز ہشتم: طنز و مزاح

ہوں یا کوئی ان سے بھی نچلے درجے کا صحابی، کسی کی بھی خلیفہ راشد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خود بھی اہانت نہیں کی اور کسی کو کرنے بھی نہیں دی تو

آخر کون لوگ ہیں ہم اہل ایمان میں نفرتیں بانٹنے والے۔ ہمارا ایمان شخصیات کے ارد گرد کیوں گھومنے لگ گیا ہے؟ ہماری باگیں کیا یہودیوں کے ہاتھ میں آ گئی ہیں؟ جو ہمیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے مارنا چاہتے ہیں۔ اور کیا ہم اس قدر احمق اور رذیل ہو گئے ہیں کہ دینی علم میں غرق ہوئے بغیر ہی اپنے ہم مذہب اکابرین کی توہین پر اتر آئے ہیں۔

جب دنیا میں مسلم کی آپس کی سر پھٹول پر غیر مسلم ہنسیں گے تو اس وقت آسمانوں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، امام

عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہما وغیرہ ہمیں قطعاً محبت سے نہیں دیکھ رہے ہونگے۔ اس کا یقین کر لیں۔ محض یزید کی غیر انسانی حرکات کو بہانہ بنا کر یہودیوں نے جو ہمیں تفرقے اور لعن طعن پر بھڑکایا ہے اس میں آج کی تاریخ تک یہودی جیت رہا ہے ہم جیسے احمقوں کے ادھورے علم کی وجہ سے۔ وہ نبی اور وہ صحابہ جنہوں نے رذیل ترین دشمنوں کو طاقتور ہونے کے باوجود معاف کر دیا تو کیا ہم ان کی امت ہیں؟ مجھے تو لگتا ہے کہ ہم ہندو مودی کی امت بنتے جا رہے ہیں۔ امام عالی مقام کے ساتھ جو ظلم ہوا وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انکے چچازاد کا کلیجہ ہندہ کے چبانے سے بھی بڑا واقعہ تھا؟ تو کیا ہمارے نبی جن کی ہم شاید اتباع ہی چھوڑ چکے ہیں انہوں نے کبھی اس کو ہلکی سی گالی بھی دی ہو نعوذ باللہ یا فتح کے بعد بدلہ ہی لیا ہو؟ کہیں ہم انجانے میں ایرانی محکوم سردار یزدگرد کے کہے پر عمل تو نہیں کر رہے جس نے گرفتاری کے بعد قسم کھائی تھی کہ "ان مسلمانوں

سے قرآن چھین کر دکھاؤں گا جس نے ہمارا ہزاروں سال پرانا آتش کدہ بجھایا ہے"؟۔ ہم کس طرح کے مسلمان ہیں مجھے تو سخت مایوسی ہے۔

محترمہ ان گزارشات کے بعد کہ جس میں صرف فرقوں سے نفرت ہی میرے ایمان کا حصہ ہے، آپ بہت شوق سے ہمیں خود اپنی دوستانہ فہرست سے خارج کر دیں تو ہمیں اطمینان رہے گا کہ اللہ، رسول کا حق پر مبنی حقیقی پیغام ہم نے اتحاد بین المسلمین کے جذبے سے دوسروں تک پہنچا دیا۔ اب آگے کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اس کی مرضی۔ اور اگر اسلامی احکامات کا آپکو ذرا بھی پتہ ہے تو اپنی تفرقانہ اور نفرت بھری تحریر ڈیلیٹ کر دیں۔

پاکستان میں نفاذ شریعت اک دھوکا ہے

کالم 328 از ڈاکٹر سلطان محمود

20 جون 2020

ایک صاحب ادراک فرماتے ہیں کہ سُننے میں آیا ہے کہ عمران خان کی خواہش پر پنجاب میں ڈگری لینے کے لیے قُرآن کے ترجمہ کو بطورِ نصاب پڑھنا لازمی کر دیا گیا ہے، اِس ضمن میں ایک سوال دماغ میں اُمڈ رہا ہے کہ قُرآن کے تو بیسیوں تراجم دستیاب ہیں، جن میں اکثریت اختلافی ہے۔ یہاں کس کا ترجمہ پڑھایا جائے گا؟ اور یہ فیصلہ کس بنیاد پر کیا جائے گا کہ وہی مخصوص ترجمہ ہی متفقہ علیہ ترجمہ ہے؟

ان صاحب کے سوال کے جواب میں ہمارے تاریخ پاکستان کے علم کے مطابق اس فیصلے سے فرقہ واریت میں شدت آئے گی۔ وجہ تو آپ سمجھتے ہی ہیں کہ قرآن کے الفاظ پر تو مسلمانوں کے کسی فرقہ میں بھی اختلاف رائے نہیں۔ سارا کشت وخون ہوتا ہی تراجم کے باعث ہے۔ ہمارا گمان ہے کہ کسی فرقہ پرست نے موقع اچھا جانا ہے کہ وزیر اعظم اس وقت فرقہ بریلویت سے متاثر ہیں لہٰذا اسی بنیاد پر ملک میں مذہبی شدت پسندی کو ہوا دیکر عوام کی توجہ حکومتی ناکامیوں سے ہٹا دی جائے۔

ہمارے مذکورہ دوست نے ہماری وضاحت سے اتفاق کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہی بات تو عام عوام کو سمجھ نہیں آ رہی۔ ہم نے عرض کیا کہ اس طرح کے ڈرامے قرارداد مقاصد سے چل رہے ہیں کہ ملک پر مذہبی گرفت اس طریقے سے مضبوط کی جائے کہ اولاً اصل قران نافذ نہ کرنا پڑے جس کا ہمارے ہاں کسی کو پتہ بھی نہیں کہ قران دراصل چاہتا کیا ہے اور قران کے صاحبان ادراک خواہش

بھی نہیں رکھتے تا کہ کہیں فرقہ بندی کی بنیاد پر انکی بنی بنائی جاگیر منہدم نہ ہو جائے۔ دوم قرارداد مقاصد کے بل پر ملک بھی نظریاتی کہلاتا رہے اور کسی کی نظر مطالعہ پاکستان سے باہر بھی نہ دیکھ پائے کہ نئی مملکت امریکن خواہش پر بننے جارہی تھی جس نے ایشیا کی تین عظیم طاقتوں بھارت، چین اور ایران کے بیچ ہمیشہ فوجی بھروسے پر امریکی پالیسیوں کا نفاذ کرنا ہے۔ ثالثاً اس طرح کے اعلانات کا یہ بھی مقصد ہے کہ جس طرح امریکہ نے پاکستان کے ذریعے ارد گرد کے ممالک کو نچانا ہے ویسے ہی مذہبی انتہاپسندی کے ذریعے ملکی حالات سے عوام کے تدبر کو فاصلے پر رکھ کر سیاسی مداری بھی عوام خو نچا سکیں۔ لہٰذا سیاستدانوں کی کٹھ پتلیوں کی اس طرح کی آنیاں جانیاں لگائی جاتی رہیں تا کہ مثبت سیاست کا ادارہ کبھی بھی مضبوط نہ ہو سکے۔

اِن تمام بنیادی سوالات کی بنیاد پر اب پالیسی سطح کا سوال یہ بنتا ہے کہ اس قران تراجم والی پالیسی کو اپنانے کے لیے ان تمام امور اور انکے نتیجے میں پیدا ہونے والے امور کا تفصیلی جائزہ لیا بھی گیا ہے یا محض نام نہاد مسلمانیت، سطحی علم اور خواہش کی بنیاد پر اس انتہائی حساس معاملے کو بالکل اُسی طرح دوام وجوازِ اقتدار کا ذریعہ بنانے کے لیے لیا گیا ہے جیسا کہ ماضی کے چند حکمران مثلاً ضیاء الحق ایسا کر چکے ہیں اور ایسی تمام پالیسیز کا قوم کو عملی فائدہ صفر بٹا صفر ہے، بلکہ قوم ایسی پالیسیز کی بنیاد پر مزید فکری و اخلاقی انتشار کا شکار ہوئی۔

از ڈاکٹر سلطان محمود

محترم زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم قرآن کا پیغام نہ جان کر جتنے فرقوں میں تقسیم ہیں اس کا ترجمہ جان کر اس سے تین چار گنا زیادہ فرقوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ اگر ہم عقل سلیم سے کام لیں تو قرانی آیات، حروف بلکہ اعراب تک میں کسی مسلمان کو کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف

صرف وہاں سے شروع ہوتا ہے جب ہم ایک ہی آیت کے مختلف تراجم کرتے ہیں۔ اس وقت تمام کے تمام فرقے ترجمے کی بنیاد پر تقسیم ہیں اور حکومت کے موجودہ قانون سے ہم مزید تقسیم ہوتے چلے جائیں گے کیونکہ ہمارے ہاں عربی سمجھنے والے دن بدن کم ہو رہے ہیں۔

قرآن کے اختلافی تراجم کے بعد احادیث کے تراجم کا نمبر آتا ہے جو دہرا نقصان دہ معاملہ ہے۔ اول حدیث کی صحت کا اور دوم اس کے ترجمے کی صحت کا۔ ہر فرقہ اپنے ترجمے کو سینے سے لگائے دوسرے کے لئے کافر بنا کھڑا ہے۔ میرا سوال عقلی و منطقی ہے کی امت مسلمہ تو ایک طرف کیا ہم صرف پاکستانی ہی کسی ترجمے پر ایک قوم کی طرح متفق ہو سکتے ہیں؟ میرا ہی جواب ہے کہ کسی بھی صورت میں نہیں۔ اگر آپ کا جواب مجھ سے مختلف ہے تو منطق، حالات حاضرہ اور زمینی حقائق کی روشنی میں مجھے مطمئن کیجیئے۔

ہم اتنے کوتاہ عقل ہو گئے ہیں کہ لٹھ لے کے ہر اس شخص کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو عقل کی بات بتائے۔ گو کہ اصولی طور پر ترجمے والی بات درست ہے مگر متفق علیہ ترجمے والی۔ پچھلے 1400 سالوں سے تو شیعہ اور سنی صرف ایک زکوٰۃ کے معاملے میں ایک نہیں ہو سکے اب مزید کتنے سروں کو کٹانا ہو گا۔ اگر تراجم سے مزید سر کاٹنا پڑے تو پھر اعتزاز احسن کی بات درست ہے۔

سیاسی ایجادات

کالم۔۔۔۔از ڈاکٹر سلطان محمود

مورخہ 13 جون 2020

ہمیں تو ہر حکمران سے ہی نیا سبق ملا۔ جیسے عمران سے یوٹرن، زرداری سے مل جل کر کھاؤ۔ ان دونوں کی تفصیلات سے ذرا پہلے ملک کے سب سے بڑے سائنسدان نواز شریف کی سیاسی ایجادات کا ذکر کریں:

1۔ ہارس ٹریڈنگ،

2۔ کم پلیٹلیٹس،

3۔ ہیر کلینک سے ہارٹ سرجری،

4۔ ہیلی کاپٹر سے ناشتہ منگوانا،

5۔ پی آئی اے کا پورا جہاز بیچ دینا،

6۔ 59 صندوق سمیت ملک سے فرار،

7۔ ڈرائیور کیساتھ بیٹی بیاہنا،

8۔ نواسی ہندو سے بیاہنا،

9۔ فیکٹری میں راء کے ایجنٹس چھپانا،

10۔ کھاتا ہے تو لگاتا بھی ہے،

11۔ قوم کو 130 ارب کے قرض کی دلدل میں پھنسا کر غیر ممالک میں جائیداد بنانا،

12۔ قطر سے خط منگوا کر اپنی باندی عدالت سے ریلیف لینا،

13۔ آرمی چیف کا جہاز دشمن ملک میں اتروانے کی کوشش کرنا،

14۔ زندگی کے کسی لمحے سچ نہ بولنا،

15۔ وزیر اعظم ہو کر بھارت میں سرمایہ کاری کرنا،

16۔ بیٹے کی ملازمت کرنا،

17۔ 'ہر چیز برائے فروخت' والا کلچر فروغ دینا،

20۔ اپنے گماشتوں کو سر کلر ڈیٹ سے کھربوں دینا،

21۔ زمینوں پر قبضہ،

22۔ دس لاکھ فی کس کے عوض جہاز بھر بھر بندے باہر بھجوانا۔

وعلی ھذا القیاس۔۔۔

Amjad Hussain Warraich

Dr sb reality you point out but on three point I not agree one is about high jacking aeroplane and second is about ladies of Sharif

family should not fair to discuss publicly. As Muslims we have moral values should not forget.Over all excellent opinion about our political history.

امجد حسین وڑائچ

ڈاکٹر صاحب آپ حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن تین نکات پر میں متفق نہیں ہوں ایک ہائی جیکنگ ہوائی جہاز کے بارے میں اور دوسرا شریف خاندان کی خواتین کے بارے میں عوامی سطح پر بات کرنا مناسب نہیں۔ بحیثیت مسلمان ہماری اخلاقی اقدار کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اپنی سیاسی تاریخ کے بارے میں تمام عمدہ رائے۔

از ڈاکٹر سلطان محمود

وڑائچ صاحب شکریہ آپ کے خیالات مقدم ہیں۔ یہ خواتین والی بات مجھے اس لئے ہضم نہیں ہوتی کیونکہ ہم مرد بعض اوقات جان بوجھ کر اپنی خواتین کو خود ذلیل کراتے ہیں۔ مثال کے طور پر لائن لمبی ہو تو اپنی بہن بیٹی کو آگے کر دیتے ہیں۔ چالان کا ڈر ہو تو بیوی یا ماں کو ساتھ بٹھا لیتے ہیں۔ کئی بار واردات کرتے وقت بھی خاتون کو ساتھ شامل کر لیتے ہیں۔ میرا آپ جسے پڑھے لکھے شخص سے سوال ہے کہ اسی مائنڈ سیٹ سے اگر ہمارا سیاستدان مرتضی بھٹو کی بجائے خود بینظیر کو آگے لے آئے یا حسین نواز کے ہوتے ہوئے مریم کو آگے کر دے تو کیا ہمیں ان خواتین کا پھر بھی احترام کرنا چاہیئے جن کو ان کے باپ بچے بچے سے ذلیل کرانے پر خود تیار بیٹھے ہوں صرف اقتدار کی ہوس میں؟ یہ درست ہے کہ ہمیں پھر بھی احترام کرنا چاہیئے مگر لائن میں لگی عورت یا گینگ میں شامل

عورت کے جسم کو اگر کوئی جان بوجھ کے نازیبا ہاتھ لگا دے یا برے الفاظ سنا دے تو اس پر اگر ہم شور کریں تو شاید ہم سے بڑا پھر کوئی منافق ہی نہ ہو۔ 🙏

اگلا کالم اعزازی ڈگریوں اور اعزازی سرٹیفیکیٹس پر ہو گا۔

اعزازی ڈگریاں اور اعزازی سرٹیفیکیٹس

ایک دوست پوچھتے ہیں کہ یونیورسٹیوں کے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری ایوارڈ کرنے کا اختیار بھی ہوتا ہے یا نہیں اس پر میں کنفیوز ہوں۔ وضاحت ضروری ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس کو کوئی قانونی حیثیت بھی ہے یا بالکل نہیں؟ ہم نے عرض کیا ہے کہ یہ اعزازی ڈاکٹریٹ کا ایک باقاعدہ قانون ہوتا ہے مگر ہر یونیورسٹی اسے کسی سربرآوردہ شخصیت کو دینے سے قبل اپنی سنڈیکیٹ سے خصوصی منظوری لیتی ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وصول کنندہ اپنے آپ کو نہ تو ڈاکٹر لکھ سکتا ہے اور نہ اس ڈگری کے بل پر نوکری کے لئے درخواست دے سکتا ہے۔ کچھ دو نمبر پرائیویٹ یونیورسٹیوں نے اسے آمدن کا ذریعہ بنایا ہوا ہے اور دلچسپی رکھنے والے دو نمبر لوگوں سے باقاعدہ رقم وصول کی جاتی ہے۔ اسی طرح امریکہ میں بیشمار ایک کمرے والی ایسی یونیورسٹیز موجود ہیں جو ایک سو ڈالر سے لے کر ڈھائی تین ہزار ڈالر میں باقاعدہ پی ایچ ڈی کی ڈگری جاری کر دیتی ہیں۔ یہ تمام ڈگریاں آنریری سمیت ایچ ای سی تسلیم نہیں کرتی۔ سری لنکا کی ایک ایسی یونیورسٹی بھی ہے جو 800 ڈالر میں تھیسیس اور ڈگری باقاعدہ کولمبو میں کانووکیشن منعقد کر کے جاری کرتی ہے۔ ایگزیکٹ اسکینڈل ابھی کل کی بات ہے جس نے ہزاروں چھوٹی بڑی ڈگریاں جاری کر کے کروڑوں ڈالر کمائے۔ ان ڈگریوں کا اصل ڈگری سے وہی تعلق ہے جو ایک طوائف کا قانونی بیوی سے ہوتا ہے۔ 😋

غلام ربانی

مرحوم اقبال بلہڑ پرائمری سکول میں میرے ٹیچر تھے۔ مزے کی بات یہ تھی اس گورنمنٹ سکول میں سب اساتذہ اسی یونیورسٹی سے سند یافتہ تھے اور بھی مزے کی بات یہ تھی ساتھ والے سکول میں موصوف کی اہلیہ ہیڈ ماسٹر تھی اور اس سے بھی بڑھ کر مزے کی بات یہ تھی کہ جب اقبال پکڑا جاتا تھا تو گھر میں دولت اور راشن کی ریل پیل ہو جاتی افسران بالا بالآ ان کے گھر حاضری کے حاضر ہوتے اور ان کی بیوی سے بطور خاص اپنا نام بتاتے کہ ملاقات کے جائیں تو کہیں تفتیش میں ان کا نام نہ بتادیں۔ بطور ایک طالب علم کے ان سے میں نے یہ سیکھا۔ مندے کی نا نکاتے جد کد مندا ہو۔

ہمارا غیر جانبدارانہ مزاج

کالم 327 از ڈاکٹر سلطان محمود XXXX

20 جون 2020

ہمارے ایک محترم دوست فرماتے ہیں کہ سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد اصولوں کے پابند وزیر اعظم کو مستعفی ہو جانا چاہیئے۔ اور فروغ نسیم، جو الطاف اور مشرف کا بھی وکیل رہا ہے، کو تو وکالت بھی چھوڑ دینی چاہیئے۔ ہمارے یہ دوست مانتے نہیں کہ نون لیگ کے حامی ہیں اور بغض عمران میں کافی

متشدد ہیں مگر انکی غیر جانداری ان کی تحریر سے ہی واضح ہے۔ ہم نے جان کی امان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے لیکن ملکی مفادات کے تناظر میں سوال کیا ہے کہ کیا پھر عمران وغیرہ کو نواز شریف کے پیسے سے بنی کرپٹ اور بے انصاف عدلیہ سے شکست مان لینی چاہیئے؟ اگر ہم غیر جانبداری سے غور کریں تو پتہ چلے کہ نواز شریف نے ہمیشہ اقتدار میں رہنے کے لئے نیچے سے اوپر تک ہر طاقتور کو خریدا جس میں عدلیہ بھی شامل تھی۔ فائز عیسی کیس میں بھی اس نے اسکی فیملی کے نام بیرون ملک رشوت کے طور پر جائداد بانٹی اور اسے ایک غیر متحرک این جی او سے براہ راست بلوچستان کا چیف جسٹس لگا دیا۔ نواز شریف کے بھرتی شدہ پٹواریوں کو میں نے خود اسسٹنٹ کمشنر بنتے دیکھا ہے۔ پھر ایسے پٹواریوں کا تو پورا خاندان ہی بک جاتا ہے اس پارٹی کے ہاتھوں۔ نواز نے انہی حربوں سے پوری سول بیوروکریسی خرید ڈالی اور وھاں نیچے سے اوپر تک اپنے سہولت کار بھرتی کئے۔ یہی کام محکمہ مال، ریلوے، پی آئی اے اور کم و بیش ہر ادارے کیساتھ کیا۔ فرعون کی طرح صرف آئی ایس

آئی اس کی دستبرد سے بچ گئی اور پھر مکافات عمل کے قدرتی اصول کے تحت وہی اسے لے بھی بیٹھی۔

عمران کی کامیابی میں یہی بکاؤ عناصر اور عوامل رکاوٹ ہیں جنہیں وہ اپنی شہرت کو داؤ پر لگانے جیسی بھاری قیمت ادا کر کے آہستہ آہستہ دور کر رہا ہے۔ اس لئے بہت ضروری ہے کہ عمران اگلا الیکشن بھی جیتے اور پاکستان کی جڑوں میں بیٹھنے والے ہر اندرونی و بیرونی مافیا کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکے چاہے وہ پی ٹی آئی کا ہی حصہ بنے بیٹھے ہوں۔

ماحولیاتی آلودگی

کاپی میاں وقارالاسلام برائے کالم

26جون2020

ہم میں سے اکثر نے شاید یہ بات سنی ہو گی کہ اگر کوئی گندے پانی میں پتھر مارتا ہے تو کیچڑ اس کے اپنے اور واپس آتا ہے۔ حیرانی ہوتی ہے کہ ہم نے اپنے ماحول کو کس کس طرح سے زہر آلودہ کیا، طرح طرح کے جوہڑ اپنے ارد گرد بنا لیے، جو نظر آتے بھی ہیں اور نہیں بھی اور پھر ہر جوہڑ میں پتھر مارے اور آج ہمارے وجود اندر اور باہر سے ماحولیاتی آلودگی سے بری طرح خراب ہو رہے ہیں۔

ہم نے اپنا باہر اس قدر گندا کر لیا ہے کہ یہ اٹھتی ہوئی غلاظت ہمارے وجود کو اندر سے کھوکھلا کر رہی ہے۔ ہم نے نہ تو پانی کو پینے کے قابل چھوڑا اور

نہ ہی ہوا کو سانس لینے کے قابل چھوڑا۔

سنا تھا کہ کتا بھی اپنی جگہ صاف کر کے بیٹھتا ہے مگر آج کا انسان اس بات سے معذور ہے کہ اپنے آپ کو ماحولیاتی آلودگی سے محفوظ رکھ سکے۔ انسان کی

پھیلائی ہوئی غلاظت سے اس کا اپنا تو بیڑا غرق ہو ہی رہا ہے ساتھ ساتھ کئی قسم کے جانور اور پرندے یا تو نقل مکانی کر رہے ہیں یا پھر ان کی نسل ہی

ختم ہو رہی ہے۔ قدرت چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ اس کا قدرتی حُسن خطرے میں ہے۔ اور آج کا انسان کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر منہ سے اور ناک سے غلاظت کو اپنے اندر جمع کرتا جا رہا

ہے۔ ہم نے غلطی کہاں کی جب دیہات شہروں میں بدل رہے تھے ہم نے شہروں کو سیمنٹ کے جنگلوں میں بدل

دیا۔ شہروں میں درختوں کے وجود سے شہروں کی فضا اس قابل تو ضرور تھی کہ کسی کو سانس لینے میں مشکل نہیں ہوتی تھی۔ اور پھر یوں ہوا کہ ہم نے ایسے لیڈر چنے جنہوں نے درختوں کا قتلِ عام کیا اور ہم سے صاف فضا میں سانس لینے کا حق بھی چھین لیا۔

سیاست اور سرمایہ کاری

کالم 336 از ڈاکٹر سلطان محمود

12 جولائی 2020

پنجاب حکومت کا ایک زبردست منصوبہ

کاش اس پر عملدرآمد بھی ہو جائے تو کمال ہو جائے۔ پانچ ہزار ارب کی سرمایہ کاری متوقع۔

ن لیگ کی ہر گورنمنٹ نے راوی کنارے سیاحتی و رہائشی پروجیکٹ کا اعلان کیا لیکن کبھی عمل درامد نہ ہو سکا۔

اب دیکھیں پی ٹی آئی گورنمنٹ اسے پایائے تکمیل تک پہنچا پاتی ہے۔ اگر ایسا ہو گیا۔ تو یہ ملکی معیشت کی بہتری کیلئے ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر جائے گا، کیونکہ معیشت کا پہیہ چلانے کیلیے ایسے پروجیکٹس بہت مؤثر ہوتے ہیں۔

از ڈاکٹر سلطان محمود

یہ نئے لاہور کا منصوبہ شہباز شریف سے بھی پہلے پرویز الٰہی نے بنایا تھا۔ لاہور رنگ روڈ کا بیرونی لوپ بھی اس سے متصل تھا۔ رنگ روڈ کے آس پاس کی سینکڑوں ایکڑ اراضی سابق میئر لاہور میاں عامر نے خرید لی۔ جب پرویز الٰہی کو پتہ چلا کہ میاں عامر کافی ساری زمین خرید چکا ہے تو انہوں نے مونس الٰہی کو چانس دینے کے لئے رنگ روڈ کا لوپ چھوٹا کر کے میاں عامر کو باہر نکال دیا۔ یہیں سے دونوں میں پھوٹ پڑی۔ اس کے بعد ان کا استاد شہباز آیا تو منصوبہ دوبارہ شروع کرنے سے پہلے حمزہ

اور اس کے ساتھیوں نے مل کر ڈیڑھ لاکھ کنال زمین بتی چوک سے ریڈیو پاکستان 2 تک دریا کے دونوں جانب خرید لی۔ اس پر ریور راوی فرنٹ نے غریب کسانوں کی دریائی زمین واگزار کرانے کے لئے بھرپور احتجاج کیا۔ بدنامی کے خوف سے اور معاملہ ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر شہباز نے یہ منصوبہ کسی اور وقت پر رکھ کر شیلف کر دیا۔ اب پھر اصل کاریگر دوبارہ برسر اقتدار آئے ہیں تو اس منصوبے کی فائلوں سے مٹی جھاڑی جا رہی ہے۔

اس ناول منصوبے میں ترقیاتی کام کرنے کے لئے ہماری کمپنی نیسپاک بھی شامل تھی۔ جس نے ابتدائی فزیبلٹی بنائی مگر کسانوں سے عظیم زیادتی دیکھتے ہوئے ہمارے پراجیکٹ مینجر اللہ لوک شیخ سلیم الگ ہو گئے اور وہ ریور راوی فرنٹ این جی او سے مل گئے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک اور این جی او لاہور بچاؤ تحریک بھی میدان میں آ گئی جس کا میں اب بھی رکن ہوں۔ اس طرح راوی کنارے ڈیڑھ لاکھ ایکڑ حمزہ کی دستبرد سے بچ گئی۔

اگر یہ منصوبہ بنا تو لاہور خوبصورت ہو جائے گا مگر راوی کنارے تمام غریب کسان مارے جائیں گے۔ اس نئے شہر کو ڈیفنس اور بحریہ ٹاون کی طرز پر آباد کرنے کا منصوبہ ہے جس میں کسی غریب کو ایک گز زمین بھی نہیں ملنی۔ ہاں البتہ حمزہ اینڈ کمپنی لاہور کو لندن اور راوی کو دریائے ٹیمز ضرور بنا دینگے۔ اس وقت راوی میں سال بھر صرف گندہ پانی آتا ہے سوائے مون سون کے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے اس مصنوعی شہر کے دریا میں دو نہریں گرا کر برج اور کشتیاں چلانے کا منصوبہ بھی اسی کا حصہ ہے۔ جو استنبول، دبئی اور لندن کی طرز پر نیز دریائے ڈینیوب جیسی خوبصورتی کا منظر پیش کرینگے۔ اس شہر کے بستے ہی شمالی لاہور، جنوبی شیخوپورہ اور گوجرانوالہ کے ادھر والے حصے سے غریب یوں غائب ہو جائیں گے جیسے آج کے ڈیفنس سے پرانے گاؤں غائب ہیں۔ یہ نہیں کہ

غریب امیر ہو جائیں گے بلکہ غریب اپنی زمین کی قیمت دھونس سے تھوڑے پیسے میں مجبوراً بیچ کر دربدر ہو جائیں گے۔ یہ سیاستدان جب حکومت میں آنے کے لئے اپنی ماؤں بہنوں کا سودا کرنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں تو درپردہ ان کو ایسے ہی لالچ ہوتے ہیں۔

اعظم احمد

واہ، آپ کے پاس تو مکمل ہسٹری ہے باقی جو بھی ہے لیکن اتنی بڑی سرمای یہ کاری یقیناً معیشت کیلیے بہت سود مند ہو گی۔

از ڈاکٹر سلطان محمود

تو پھر کیوں نہ غریبوں کو بیچ کر امیروں کا غلام بنا دیا جائے 1850ء والے امریکی معاشرے کی طرز پر؟ امیروں کو مزید امیر بنانے کے لئے ایسے پندرہ بیس نئے شہر تمام بڑے شہروں سے متصل بنا کر ملک ریاض کو سٹیٹ کا بادشاہ بنانے کا اعلان کر دیا جائے۔ اس طرح معیشت میں بڑی سرمایہ کاری آ جائے گی۔

اعظم احمد

ارے بھائی جب سرمایہ گردش میں آتا ہے تو سب کا بھلا ہوتا ہے۔۔ ایک تعمیراتی انڈسٹری کے چلنے سے کم از کم ستر دوسری انڈسٹریز بھی چلتی ہیں۔

از ڈاکٹر سلطان محمود

بھائی جان غیر ترقیاتی سیکٹرز میں سرمایہ کاری منفی اکنامکس کہلاتی ہے۔ اس پمبل پوسے میں پھنسنے کی بجائے مثبت اکنامکس پر عمل بھی تو ہو سکتا ہے یعنی انڈسٹریل سیکٹر کو فعال کیا جائے۔ پہلے شہر کیا دشمن ملک کے ہیں کہ جہاں لگانے کے لئے دھیلہ نہیں اور ہم چلے ہیں نئے شہر بسانے اور وہ بھی زرعی زمین پر۔ معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ آپکا بھائی اس سبجیکٹ پر عبور رکھتا ہے فی الحال اسی کی بات مان لیں۔ ورنہ پورا ماڈل بنالیں ہم ریویو کر لیں گے۔

اعظم احمد

بجا فرمایا، آپ کے نالج کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

میاں ذوالقرنین

اس منصوبے کا تو علم نہیں لیکن یہ علم ہے کہ ایل ڈی اے کے جتنے منصوبے اب تک بنے ہیں وہاں جس سے بھی زمین لی جاتی ہے اگر وہ چاہے تو پیمنٹ لے لے اور اگر چاہے تو exemption پلاٹ لے لے۔ exemption پلاٹ اصل زمین کا ایک تہائی ہوتا ہے یعنی جس کی تین کنال زمین ایکوائیر کی جاتی ہے اسے اس کے بدلے ایک کنال فلی ڈیویلپڈ پلاٹ اس سکیم میں مل جاتا ہے۔ تین کنال زرعی یا بنجر جو بھی جگہ ہو اس کے بدلے ایک بہترین رہائشی سکیم میں ایک کنال کا پلاٹ بہت منافع کا سودا ہے۔ بہت سے غریب زمینداروں کی قسمت اسی قسم کی سکیموں سے سنورتی دیکھی ہے۔ لہٰذا یہ واویلا غلط ہے کہ زمینوں کے مالکان کو نقصان ہو گا۔ اور معیشت کا پہیہ ایسے منصوبوں سے چلتا ہے۔ پاکستان میں بے گھر افراد کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ ایسی نئی سکیموں میں جگہ سستی اور مناسب قیمت پر ہوتی ہے لہٰذا گھروں کی ضرورت بھی پوری ہو گی اور کنسٹرکشن انڈسٹری سے منسلک درجنوں انڈسٹریز بھی چلیں گی۔ یہ منصوبہ اگر واقعی بن جائے تو بہترین منصوبہ ہے۔

اعظم احمد

اور یہ جو بھائی بار بار بات کر رہے ہیں کی غریب غائب ہو جائیں گے کیونکہ DHA یا بحریہ کی طرح کی سکیم ہو گی یہ بھی غلط ہے۔ پہلی بات، آپ بحریہ اور DHA کو آپس میں کیسے ملا سکتے ہیں جبکہ DHA امیروں کی سکیم ہے اور بحریہ غریب اور متوسط طبقے کی سکیم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت بحریہ آرچرڈ رائے ونڈ روڈ لاہور میں پلاٹ کی قیمت ساڑھے تین سے ساڑھے چار لاکھ روپیہ مرلہ چل رہی ہے جبکہ لاہور کے کسی بھی مناسب محلے میں جگہ تقریباً پندرہ لاکھ روپے مرلہ ہے۔ لہٰذا جو غریب لاہور کے کسی عام سے محلے میں پانچ مرلہ جگہ نہیں خرید سکتا وہ بحریہ آرچرڈ میں دس مرلے جگہ بھی با آسانی خرید سکتا ہے۔ اور جو لائف سٹائل بحریہ میں ہے اس کا لاہور کے محلوں اور سکیموں میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور سرکاری سکیمیں بحریہ سے بھی سستی ہوتی ہیں جیسے کہ LDA سٹی جب لانچ کی گئی تو کنال غالباً بیالیس لاکھ اور دس مرلہ جگہ پچیس لاکھ کی تھی۔ لہٰذا اس دریا کنارے نئی سکیم کا ہر لحاظ سے فائدہ غریب اور متوسط طبقے کو ہی ہو گا۔ جن کے پاس پیسہ ہے وہ تو ہمیشہ سے کینٹ، DHA اور ماڈل ٹاؤن جیسی مہنگی سکیموں میں رہائش پسند کرتے ہیں۔

از ڈاکٹر سلطان محمود

گھر ضرور بننے چاہئیں مگر زرعی زمین پر کیوں؟ دریا کے کنارے کیوں؟ جبکہ آدھے پاکستان میں فالتو زمین پڑی ہے۔

میاں ذوالقرنین

اصولی طور پر اس بات سے سو فیصد اتفاق ہے کہ زرعی زمینوں پر سکیمیں نہیں بننی چاہئیں۔ لیکن اگر دیکھیں تو یہ دریا کنارے والی زمین زیادہ تر کچے کی زمینیں ہیں جہاں سال میں ایک آدھ مرتبہ سیلاب بھی آتا ہے اور مہینوں تک جوہڑوں اور نشیبی جگہوں پر پانی بھرا رہتا ہے۔ کبھی ٹھوکر نیاز بیگ سے موٹروے کی طرف جائیں تو دریا سے پہلے آنے والی زمینیں دیکھیں یا کبھی یادگار سے رنگ روڈ پر داخل ہوں اور جی ٹی روڈ تک سفر کریں اور دریا والی سائیڈ کا جائزہ لیتے رہیں تو آپ کو اس طرح کھیت لہلہاتے نظر نہیں آئیں گے جیسے باقی زرعی زمینوں میں نظر آتے ہیں۔ یہ دریا کنارے والی زمین ویسی نہیں ہے جیسی آپ کو لاہور کے دیگر اطراف نظر آئیں گی۔ میرے خیال میں تو یہ شہر شروع کر کے لاہور کے گرد و نواح میں دیگر کسی بھی سکیم پر پابندی لگا دینی چاہیے۔ اس دریا کنارے والی سکیم کی نسبت وہ زمین کہیں زیادہ قیمتی زرعی زمین ہے جس پر LDA سٹی یا DHA کے نئے فیز یا لیک سٹی اور بحریہ آرچرڈ و دیگر سکیمیں بن رہی ہیں۔

از ڈاکٹر سلطان محمود

آپکا وژن درست سمت میں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ کچے کی زمین رہائش کے قابل نہیں رہتی گہرائی تک پلپلی مٹی کے سبب۔ ہاں اس کو درخت، جنگلات، فش فارم و دیگر زراعت کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ یا پھر عرصہ دراز سفیدے کے درخت زیر زمین پانی چوس کر سطح کم از کم دو سو فٹ تک لے جائیں۔ بہر حال میری ماحولیاتی رپورٹ میں کچھ دیگر تجاویز بھی شامل تھیں۔

جاوید نواز امریکہ

یہ کہنا کہ 1970 تک مالی ہوس نہیں تھا تاریخ کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ مالی کرپشن 1949 میں اس وقت شروع ہو گئی تھی جب Rehabilitation کے نام سے ایک محکمہ بنایا گیا۔ اس

زمانے میں نہ عرب تھے اور نہ ہی ارب۔ اس لئے ہزاروں اور لاکھوں کی بات ہوتی تھی۔ اس دور میں انڈسٹریل لائیسنس سیاستدانوں اور جرنیلوں کو دیئے گیے۔ فارمولا بہت آسان تھا لائسنس لاؤ اور 50 فیصد کے حصہ دار بن جاؤ۔ تاریخ کی بڑی کرپشن جنرل ایوب خان کے دور میں ہوئی۔ کبھی ذہن ساتھ دے تو یاد کریں گندھارہ انڈسٹریز کیا تھی اور جرنل حبیب اللہ (گوہر ایوب کا سسر) کون تھا، کیا آپ کو معلوم ہے بورے والا ٹیکسٹائل، لارنس پور ولن اور 10 بڑی انڈسٹریز جو احمد داؤد کو سفید کاغذ پر دے دی گیئں وہ کس کی ملکیت تھیں۔ پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا فراڈ PTCL کے اربوں کے اثاثے لاکھوں میں امارات کے شیخوں کو بیچنا تھا، یہ کام جنرل مشرف نے کیا۔ اگر کوئی سولین کرتا تو سٹریٹیجک اثاثے بیچنے پر غدار کہلاتا۔ کیا آپ کو اندازہ ہے کہ پاکستان کا پورا موصلات کا نظام UAE کے کنٹرول میں ہے۔ KESC ایک اور بڑا عالمی فراڈ تھا۔ جو جنرل مشرف کے دست مبارک سے سرانجام پایا۔ جنرل مشرف آج دبئ میں اسی بد دیانتی کی بنا پر عیش کر رہا ہے اور افواج پاکستان کا سابق چیف ہونے کے ناطے تحفظ میں ہے۔ جنرل مشرف نے سٹیل مل کو اس وقت بیچنے کی کوشش کی جب اس کا سالانہ منافع 16 ارب روپے تھا۔ آپ نے اپنے استاد راشد حجازی کا ذکر کیا ہے۔ وہ میرے ایک محبوب اور معصوم دوست ہیں۔ کبھی ان کو واشنگٹن ساتھ لے جاؤں گا تو ان کو چھوٹے تالاب کے باہر ایک بڑا سمندر نظر آئے گا۔ جس کی ہر نکر پر ایک سابق پاکستانی جرنیل، اور سرمایہ دار سیاست دان کا گھر ہماری غربت کی کہانی سنا رہا ہے۔

پاکستان کو لوٹنے کا طریقہ نجکاری بھی ہے جو آج بھی جاری ہے۔ پاکستان کی نج کاری کی وزارت نے کل 2229 قومی ادارے مجموعی طور پر 648 بلین روپے میں فروخت کئے مختلف ادوار میں 172 قومی مالی ادارے فروخت کر دیئے۔ جن میں 33 بنک اور بشمول حبیب بنک، مسلم کمرشل بنک، الائیڈ بنک، یونائیٹڈ بنک، الفلاح بنک اور حبیب کریڈٹ ایکسچینج، نیشنل بنک (10 فیصد)، اٹک

ریفائنری، پاکستان آئل فیلڈز،، 14 انرجی یونٹ بشمول کراچی الیکٹرک سپلائی، ماڑی گیس، سوئی سدرن گیس کمپنی، نیشنل پاور کنسٹرکشن، 4 فون کمپنیاں بشمول پی ٹی سی ایل، کیرئر ٹیلی فون انڈسٹری، 16 سیمنٹ پلانٹ بشمول میپل لیف، غریب والہ، ڈی جی سیمنٹ، کوہاٹ سیمنٹ، مستحکم سیمنٹ، 7 کار / ٹریکٹر بنانے والے کارخانے بشمول سوزوکی۔ ملت ٹریکٹر، غازی ٹریکٹر۔ 16 کیمیکل پلانٹ بشمول اتحاد کیمیکل، راوی انجینیرنگ، سوات سریمکس، 7 بڑے انجینیرنگ پلانٹ بشمول انڈس سٹیل، پاکستان سوچ گیر، کراچی پائیپ، 7 فرٹیلائزر پلانٹس بشمول پاک سعودی، پاک عرب، پاک امریکن، ہزارہ فاسفیٹ 23 گھی ملیں بشمول وزیر اعلیٰ انڈسٹریز، سورج گھی، کوہنور ائل، پنجاب بناسپتی گھی مل، 8 رائس ملیں بشمول حافظ آباد، سرانوالی، ایمن آباد، شیخوپورہ رائس مل، 14 روٹی پلانٹ بشمول گلبرگ لاہور، ہیڈ آفس گلبرگ 3۔ لاہور، اسلام آباد، مین ملتان روڈ، گلشن اقبال کراچی۔ 4 ٹیکسٹایل ملیں بشمول بولان، قائد آباد، لسبیلہ ٹیکسٹائل مل۔ 5 بڑی انجنیرنگ کمپنیاں بشمول ریپبلک موٹرز، نیشنل ٹیوب ویل کنسٹرکشن۔ 7 اخبار بشمول روزنامہ مشرق، امروز، پاکستان ٹائمز۔ اور 4 بڑے تاریخی ہوٹل بشمول لاہور فلیٹیز، سیسل ہوٹل، ڈین ہوٹل اور مرکزی حکومت کا مہمان خانہ۔ میں ملک سے باہر رہ کر پاکستان کی معیشت کو بڑی سکرین پر دیکھتا ہوں جہاں معلوم ہوتا ہے کہ تمام حکمران کرپشن میں مہارت رکھتے ہیں کچھ کو بدنام کرنا مطلوب ہے اور باقی قومی ہیرو ہیں۔

مجھے پاکستان سے محبت بھی بے پناہ ہے۔ میرے والد MLA تھے۔ 1956-57 میں سیاست سے الگ ہو گئے۔ سید مودودی، چوہدری خلیق الزمان، میاں عبدالباری، مولوی فرید، علامہ ارشد۔ اللہ

بچایو اخوند اور بہت سے سیاست دانوں سے ذاتی تعلقات تھے۔ راشد حجازی کے محترم والد بھی انکے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ میں نے تمام حکمرانوں بشمول عمران خان کو بہت قریب سے دیکھا ہے ۔ ایک وقت میں پاکستان میں حکمرانوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ فرقہ پرستی کیوں، کب اور کیسے شروع کی۔ میں اس کا شاہد ہوں۔ میری آپ جیسے نوجوانوں سے ایک ہی التجا ہے۔ کہ اگر ملک کو بچانا اور غریب کو عزت کے ساتھ زندہ رکھنا ہے تو ماضی کی نفرت اور حال کے عشق سے باہر نکلیں۔ آنے والے کل کے لئے منصوبہ بندی کریں۔ یاد رکھیں اب ملک فتح نہیں کئے جائیں گے۔ ہندوستان پاکستان کو فتح کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنائے گا۔ ہمارے اصحاب اقتدار، ہندوستان اور باقی دشمن ہمیں اندر سے معاشی بدحالی کے ذریعے تباہ کرنا چاہیں گے۔ کبھی وقت ملے تو سوچیں۔ پاکستان کی تاریخی اعتبار سے ایکسپورٹ 9 بلین اور امپورٹ 10 بلین ہوا کرتی تھی۔ جنرل مشرف ایکسپورٹ کو 10 بلین کرنے کراچی تشریف لے گئے تھے اور خود کنٹینر اٹھایا تھا۔ پھر کیا ہوا کہ اچانک امپورٹ 40 بلین ہو گئیں اور ایکسپورٹ 24 پر ہی رکی رہیں۔ (یہ 1 بلین کا فرق 16 بلین کیسے ہو گیا جبکہ تیل کا حصہ 3 اور 4 بلین ہی تھا۔)

اس وقت میری توجہ۔ پارلیمانی اور صدارتی سے ہٹ کر ایک جمہوری فلاحی مملکت کا خاکہ تیار کرنا ہے، جس پر اپ سب احباب جماعتی بٹوارے سے الگ ہو کر پاکستان اور ہماری آئندہ نسل کے محفوظ مستقبل کے لئے غور کریں۔

==========

دھوکے باز قوتوں کا رونا دھونا

کالم 337 از ڈاکٹر سلطان محمود

15 جولائی 2020

حکومت نے بھاشا ڈیم پر کام شروع کر دیا ہے۔ اس کے لئے بھی ہمیں چین کے کردار کو سراہنا پڑے گا۔ نون لیگی دور تک بھارت اس علاقے کو متنازعہ بنا رہا تھا اور ہمارے اعصاب شل کر رہا تھا جنکی حوصلہ افزائی اندر سے ہمارے سیاستدان بھی کر رہے تھے۔ مگر اب لداخ میں ٹھکائی سے بھارت اپنے دعوے کو بھول کے شاہراہ ریشم سے کافی پیچھے ہٹ گیا ہے۔ اب الحمدللہ دریائے سندھ پر مجوزہ ہمارے تمام ڈیمز بھی محفوظ ہو گئے ہیں۔

بھارت کے سیاسی دعوے اور فوجی سطح پر پیچھے ہٹنے سے ہمارے جو مجوزہ ملٹی پرپز ڈیمز خطرے سے باہر نکل گئے ہیں ان میں بنجی ڈیم، بھاشا ڈیم اور داسو

ڈیم شامل ہیں جو کل ملا کر لگ بھگ چودہ ہزار میگا واٹ بجلی بنانے کا پوٹینشل، بیس لاکھ ایکڑ بنجر زمین کو سیراب کرنے کی صلاحیت، کروڑوں ڈالر سالانہ کی سیاحت کے مواقع، لاکھوں من دریائی مچھلی کی پیداوار نیز جنگلی حیات میں اضافہ کے علاوہ جو اضافی فائدہ پہنچائیں گے وہ جنگلات کی ظالمانہ کٹائی کو روکنے میں حکومت کی گورنس میں انتظامی صلاحیت ہو گی انشاءاللہ۔

علاوہ ازیں اس وقت تین سو سے زائد چھوٹے ڈیمز پر صوبہ کے پی کی حکومت "سمال ڈیمز آرگنائزیشن" کے نام سے بھی دوبارہ فعال ہوئی ہے جس کا صرف بجلی بنانے کا پوٹینشل کئی ہزار

میگاواٹ ہے۔ اگر اللہ نے عمران کو کچھ سال دے دیئے تو ہماری حکومتی مشینری بھی ایماندار اور فعال ہو جائے گی۔

آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں ایک لاکھ میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے جسے سابقہ حکومتیں نظر انداز کرتے کرتے بالآخر بھارت کی گود میں

پھینکنے پر آچکی تھیں۔ ان علاقوں میں جا کر، بشمول گوادر، جب میں نے اپنی آنکھوں سے یہ حقائق جانے تو یقین کریں مجھے زرداری، نواز شریف اور جنرل مشرف سے حقیقی نفرت ہو گئی۔

سندھ طاس معاہدہ

کالم 338 از ڈاکٹر سلطان محمود

17 جولائی 2020

Amjad Hussain Warraich

Dr sb rivers Kis ideal govt nay India ko farkhootkiaythay.Dt sb I

surprised man like you wisdom and celebre who know ground realities

still in mood to support this disable govt

از ڈاکٹر سلطان محمود

سندھ طاس معاہدے کی تفصیل میں جائیں اور آج کے حالات دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ ہمارا ایک دریا بچا بھی اس معاہدے کے باعث ہی ہے۔ ورنہ بھارت 1960 ہی میں شروعات کر کے اس وقت دریائے سندھ تک کا رخ موڑ چکا ہوتا۔ معذرت کے ساتھ دریا فروخت کرنے کا کہہ دینا ایک سیاسی نا پختگی کی دلیل ہے۔ یہ دنیا کا غالباً پہلا ایسا معاہدہ ہے جو پانی کی اہمیت کے پیش نظر جنگوں کو روکنے کا باعث بنا ہوا ہے۔

نہرو اور ایوب نے عالمی بنک کے دباو پر اس معاہدے پر بادل ناخواستہ دستخط کئے۔ نہرو مستقبل میں پانی کی اہمیت سے واقف تھا جبکہ ایوب الجھن کا شکار

تھا۔ اس معاہدے کے وقت ایوب کے بعض مشیر جن میں سے دو اب بھی زندہ ہیں، ڈاکٹر صدیقی اور آغا۔ ان سے حقیقت کا پتہ کریں۔ میری دونوں سے ملاقات رہتی ہے اس لئے شاید میں سندھ طاس معاہدے کو عام لوگوں سے زیادہ سمجھ سکا ہوں۔

نہرو اس لئے دستخط نہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ بھارت مستقبل میں، کشمیر بھی لے کر، پاکستان کو تمام پانیوں سے محروم کر سکتا تھا جبکہ ایوب اس معاہدے

کو سیاسی سوجھ بوجھ نہ ہونے کے باعث غیر ضروری سمجھ بیٹھا تھا۔ یہ امریکی صدر روزویلٹ اور ورلڈ بنک کے ڈیوڈ لیلین تھال کی پاکستان کو آئندہ سو برس زندہ رکھنے کی کوشش کا ایک حصہ تھا کیونکہ امریکہ نے کل کلاں پاکستان کے ذریعے روس توڑنا تھا۔

پاکستان کو انشاءاللہ ہمیشہ قائم رکھنے کی ایک نشانی یہ ہے کہ یہ بنا نجی غیر مذہبی رہنماء کے ہاتھوں، پروان چڑھا زیادہ تر غیر مسلم امریکہ کے ہاتھوں اور اب اس میں امن کا کریڈٹ بھی کشمیر کا مسئلہ حل ہونے کی بنا پر غیر مسلم ٹرمپ اور ہندو مودی کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ گوادر بھی عیسائی آسٹر یلین بیگم فیروز خان نون کے ہاتھوں پاکستان کا حصہ بنا، جو بعد میں مسلمان ہو کر خاتون اول بھی بنیں۔ اس ملک خداداد کو جب بھی نقصان پہنچا اپنوں کے ہاتھوں پہنچا اور، خاکم بدہن، پہنچے گا بھی انہی کے ہاتھوں۔ زیادہ تر پاکستانی انجینیرز نے آبی معاہدے کی مخالفت کی کیونکہ وہ حضرات، معذرت سے، آبی مستقبل کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے۔ مگر کے پی اور سندھ کے سیاستدان دشمن کے پیسے پر مخالفت کرتے رہے۔

جب1960 میں اس معاہدے کے دوران ایوب کو لیلین تھال نے مستقبل کی آبی کمی اور اس کے اثرات سے آگاہ کیاتو وہ "محب وطن "جرنیل ڈیمز بنانے کے جانب متوجہ ہوااور منگلہ تربیلہ وغیرہ شروع کر دیئے اور کالاباغ کا بیڑہ بھی اٹھالیاجو1952 سے ہی زیر بحث تھا۔ اگلی کہانی آپکو پتہ ہے کہ بھارت نے کس طرح ہمارے سیاستدانوں، بھٹو سمیت، اور انجینیئرز کو رشوت دے کر اس منصوبے کے خلاف کیا۔

اسی بھارتی پیسے کا کمال ہے کہ پھر کسی سیاستدان اور فوجی نے کسی بھی ڈیم پر توجہ نہ دی۔ اب عمران نے ایوب کے بعد اس آبی منصوبہ بندی کی حمایت کی ہے جسے کوئی اور نہ کر سکا۔

اس قومی کہانی میں ازاں بعد محب وطن انجینئرز اور آبی ماہرین بھی میدان میں کود پڑے اور انہوں نے لگ بھگ 400 چھوٹے بڑے ڈیمز اور بیراجز کی سکیمیں بنائیں مگر بھٹو، ضیاء، مشرف، نواز اور زرداری انہیں پس پشت ڈالتے رہے بلکہ زرداری ان میں سے وہ بدترین حکمران تھا جس نی صدارت سنبھالتے ہی کالاباغ ایشو کو ہمیشہ کے لئے دفن کرنے کا اعلان کر دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج سب سے زیادہ سندھ برباد ہے۔

انتہائی اہم معلومات۔

سندھ طاس

بعض اوقات ہم سنتے ہیں کہ ایوب خان نے پاکستان کے دریا ہندوستان کو بیچ دیئے۔ سرائیکی وسیب کا پانی بیچ دیا گیا مگر ذیل کا مضمون تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہا ہے۔ مضمون پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ فرمایئے۔

ڈیوڈ ای لیلین تھال (David E. Lilienthal) ایک عجیب کردار تھا' وہ ہارورڈ یونیورسٹی کا لاء گریجویٹ تھا' وکیل تھا لیکن وہ دنیا میں کوئی تاریخی کام کرنا چاہتا تھا۔

امریکا 1940ء کی دہائی میں خوفناک مالیاتی بحران کا شکار تھا' صدر روزویلٹ نے معیشت کا پہیہ چلانے کے لیے پورے ملک میں میگا پراجیکٹس شروع کر دیے' لیلین تھال صدر کا دوست تھا' صدر نے اسے امریکا میں ڈیمز بنانے کی ذمے داری دے دی' لیلین تھال نے دو شرائط پیش کیں اور منصوبہ شروع کر دیا' پہلی شرط فیصلوں کی آزادی تھی اور دوسری وہ صرف اور صرف صدر کے سامنے جواب دہ تھا' ڈیمز پراجیکٹ کے لیے ٹینیسی ویلی (Tennessee Vellay) کا انتخاب کیا گیا' یہ وادی امریکا کی سولہویں بڑی ریاست ٹینیسی میں واقع ہے اور یہ ہمارے علاقے کا لاباغ سے ملتی جلتی ہے۔

لیلین تھال ٹینیسی ویلی اتھارٹی کا چیئرمین بن گیا' لیلین تھال نے دریائے ٹینیسی پر درجنوں ڈیمز بنائے' ڈیموں کی تعمیر کے دوران اسے محسوس ہوا جوہری توانائی بجلی حاصل کرنے کا سستا اور محفوظ ترین طریقہ ہے' یہ جوہری توانائی کا منصوبہ لے کر صدر کے پاس گیا اور صدر ٹرومین نے اٹامک

انرجی کمیشن بنا کر اسے اس کا سربراہ بنا دیا' لیلین تھال نے امریکا میں جوہری توانائی کے ذریعے بجلی پیدا کرنا شروع کر دی یوں وہ اٹامک انرجی اور جدید ڈیمز کا بانی کہلانے لگا۔

پاکستان اس دور میں ایک نیا اور جدید ملک بن کر ابھر رہا تھا' بھارت نے پاکستان کا پانی بند کر دیا تھا اور ملک شروع ہی میں مسائل کا شکار ہو گیا تھا' امریکا پاکستان کو کامیاب' ترقی یافتہ اور مضبوط دیکھنا چاہتا تھا' لیلین تھال 1950ء کی دہائی میں سرکاری افسروں کو لیکچر دینے پاکستان آیا اور پاکستانی قوم کے جذبے' ایمانداری اور جغرافیائی خوبصورتیوں کا فین ہو گیا' اس نے پاکستان کو پانی اور بجلی دونوں میں خود مختار بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ امریکی اشرافیہ میں بہت پاپولر تھا' ورلڈ بینک کا صدر یوجین رابرٹ بلیک اس کا ذاتی دوست تھا' وہ یوجین کو پاکستان لے آیا' ملک میں اس زمانے میں ملک فیروز خان نون وزیراعظم تھے' وزیراعظم نے لیلین تھال کے مشورے پر ٹینیسی ویلی اتھارٹی کی طرز پر پاکستان میں واپڈا (واٹر اینڈ پاور ڈویلپمنٹ اتھارٹی) بنا دیا' واپڈا آگے چل کر دنیا کی مشہور ترین اتھارٹی بنی اور دنیا کے بیسیوں ملکوں نے اس کو کاپی کیا' امریکا اور یورپ 1971ء تک اس کی مثالیں دیتا تھا۔

پاکستان میں 1958ء میں مارشل لاء لگا اور جنرل ایوب خان صدر بن گئے' بھارت بار بار پاکستان کا پانی روک لیتا تھا' حکومت بھارت کے ساتھ پانی کی تقسیم کا معاہدہ کرنا چاہتی تھی' ہم چاہتے تھے آدھا پانی بھارت استعمال کرے اور آدھا ہم استعمال کرتے رہیں لیکن ورلڈ بینک کے صدر یوجین رابرٹ بلیک اور لیلین تھال کی رائے مختلف تھی' ان کا کہنا تھا بھارت اپنے وعدے کی پاس داری نہیں کرے گا' یہ پاکستان کو پانی پر روز بلیک میل کرے گا چنانچہ پاکستان مسئلے کا مستقل حل تلاش کرے۔

ڈیم بنائے' دریائے سندھ کے پانی کو پورے ملک میں تقسیم کرے اور آزاد اور خود مختار زندگی گزارے' صدر ایوب یہ دلیل نہیں مان رہے تھے' ورلڈ بینک کے صدر نے آخر میں کہا" آپ پھر بھارت کے ساتھ طویل جنگ کی منصوبہ بندی کر لیں کیونکہ پانی کا مسئلہ جنگ کے بغیر حل نہیں ہو سکے گا" صدر ایوب نے سوچا اور انھیں یوجین رابرٹ کی بات میں وزن محسوس ہوا اور یوں عالمی بینک نے 1960ء میں بھارت کی کنپٹی پر بندوق رکھ کر سندھ طاس معاہدہ کروا دیا۔

بھارت آج بھی سندھ طاس کو نہرو کی سیاسی غلطی قرار دیتا ہے اور یہ اسے 58 سال سے تبدیل کرانے کے لیے سر توڑ کوششیں کر رہا ہے' سندھ طاس معاہدے کے بعد پاکستان نے تین کام کرنا تھے' دھڑا دھڑ ڈیم بنانے تھے' بجلی پیدا کرنی تھی اور بھارت کے حصے آنے والے تین دریاؤں بیاس' راوی اور ستلج کے زیر کاشت علاقوں تک نہروں کے ذریعے دریائے سندھ کا پانی پہنچانا تھا' پاکستان اس وقت ٹیکنالوجی میں پسماندہ ترین ملک تھا' ہمارے پاس گدھے' بیل گاڑیاں اور ہتھ ریڑھیاں سب سے بڑی ٹیکنالوجی تھیں۔

ہم ان سے ڈیم تو دور نہر تک نہیں بنا سکتے تھے' ملک میں اس وقت غلام اسحاق خان اور غلام فاروق دو بڑے بیوروکریٹس تھے' صدر ایوب نے یہ کام ان دونوں کو سونپ دیا' یہ دونوں کمال انسان تھے' آپ آج واہ فیکٹری سے لے کر پی آئی اے اور واپڈا سے لے کر ایٹمی پروگرام تک ملک کا کوئی بڑا منصوبہ نکال کر دیکھ لیجیے آپ کو اس میں ان دونوں کا ہاتھ ملے گا' اللہ تعالیٰ نے 1958ء سے 1971ء تک اس ملک پر نوازشات کے دروازے کھول رکھے تھے۔

ملک کو جتنے ایماندار اور وژنری بیوروکریٹس' سیاستدان اور تاجر اس دور میں ملے وہ دوبارہ نصیب نہیں ہوئے' اس دور کے بیوروکریٹس ریاست کے لیے ہر فیصلہ اللہ کا حکم سمجھ کر کرتے تھے' آپ

اس دور کی ایمبیسیوں کی فہرست نکال کر دیکھ لیں' نیویارک کا روزویلٹ ہوٹل ہو یا پھر امریکا' لندن' فرانس اور روم کے سفارت خانے ہوں آپ عمارتیں دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں' آپ پاکستان کے اداروں کی تاریخ بھی نکال کر دیکھ لیجیے' ہر ادارہ وژنری تھا اور ہر وژنری ادارے کے پیچھے کوئی نہ کوئی غلام اسحاق خان یا غلام فاروق جیسا بیوروکریٹ تھا۔

صدر ایوب خان نے غلام فاروق اور غلام اسحاق خان کو ڈیمز بنانے کا حکم دیا اور یہ دونوں جت گئے' ملک کے تمام اداروں سے انجینئرز واپڈا میں اکٹھے کیے گئے اور کام شروع ہو گیا لیکن یہ حقیقت ہے ایسے منصوبے پاکستان جیسے ملکوں کے بس کی بات نہیں ہوتے چنانچہ غلام فاروق امریکا گئے' ورلڈ بینک کے صدر یوجین رابرٹ سے ڈیم ڈیزائن کرنے والی دس بڑی کمپنیوں کی فہرست لی اور پھر صدر سے پوچھا ان میں سے کون سی کمپنی کا سی ای او امریکی صدر آئزن ہاور کے قریب ہے۔

ورلڈ بینک کے صدر نے قہقہہ لگا کر تیسری فرم پر انگلی رکھ دی' وہ فرم Harza انجینئرنگ تھی' فرم کا سی ای او صدر آئزن ہاور کے ساتھ گالف کھیلتا تھا' غلام فاروق نے سی ای او کے ساتھ ملاقات کی اور پہلی میٹنگ میں فرم کو منگلا ڈیم کی ڈیزائننگ کا کام دے دیا' آپ ملاحظہ کیجیے یہ فیصلہ ایک شخص نے امریکا میں بیٹھ کر ایک میٹنگ میں کیا اور ملک کے کسی ادارے' کسی اتھارٹی نے اس سے یہ نہیں پوچھا تم نے پہلی دو کمپنیاں چھوڑ کر یہ کام تیسری کمپنی کو کیوں دیا اور کیا اس کے لیے پیپر ارولز فالو کیے گئے؟ جی نہیں' یہ علتیں اس وقت موجود نہیں تھیں' کیوں؟ کیونکہ اس دور میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کوئی بے ایمان اور نالائق افسر کسی اعلیٰ عہدے تک پہنچ جائے۔

ہمارے اس پاکستان میں فیصلہ ساز کرسیوں پر صرف اور صرف ایماندار اور باصلاحیت لوگ ہوتے تھے چنانچہ پوری ریاست کا خیال تھا غلام فاروق نے جو بھی فیصلہ کیا وہ درست ہو گا اور اس میں بے

ایمانی کا شائبہ تک نہیں ہو گا' میں آج دل سے سمجھتا ہوں اگر اس زمانے میں نیب' ایف آئی اے' پبلک اکاؤنٹس کمیٹی اور پلاننگ کمیشن جیسے ادارے ہوتے تو پاکستان میں آج منگلا ڈیم ہوتا اور نہ ہی تربیلا اور نہ ہی ہم ایٹمی طاقت ہوتے اور آپ اگر آج بھی ان جیسے بڑے منصوبے بنانا اور مکمل کرنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو ملک کے تمام ترقیاتی منصوبوں کو احتساب اور روک ٹوک سے بالاتر کرنا ہو گا' آپ کو اٹامک انرجی کمیشن کی طرح اداروں کو خود مختاری دینا ہو گی ورنہ ہم اگلے پچاس سال تک ملک میں کوئی بڑا منصوبہ نہیں بنا سکیں گے۔

ہم ڈیم کی طرف واپس آتے ہیں' غلام فاروق مرحوم نے ہارزا کا انتخاب اس کے سی ای او کے صدر آئزن ہاور کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے کیا' امریکا منگلا ڈیم میں پاکستان کا معاون تھا اور یہ منصوبہ امریکی صدر کے تعاون کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ ڈیزائن میں جہاں مشکل آتی تھی' کمپنی امریکی صدر کے ساتھ بات کر کے وہ مشکل دور کرا لیتی تھی' غلام فاروق اور اسحاق خان نے ہارزا کے ساتھ یہ معاہدہ بھی کیا تھا کمپنی 270 امریکی انجینئرز کو پاکستان لائے گی۔

امریکا کا ہر انجینئر ڈیم پر کام کے دوران دو پاکستانی انجینئرز کو ٹرینڈ کرے گا' یہ معاہدہ بھی ہو گیا یوں ہارزا نے پاکستان کے پانچ سو انجینئرز ٹرینڈ کیے' پاکستان نے 1962ء میں منگلا کا انٹرنیشنل کانٹریکٹ جاری کیا' یہ اس دور میں دنیا کا سب سے بڑا سول انجینئرنگ کانٹریکٹ تھا' پوری دنیا حیران تھی پاکستان کہاں ہے اور یہ اتنا بڑا پراجیکٹ کیسے شروع کر رہا ہے؟ پاکستان کے پاس منصوبے کی کل لاگت کا صرف 15 فیصد تھا' ہمیں 17 ملکوں نے 80 فیصد رقم کے برابر گرانٹ دی۔

پانچ فیصد ورلڈ بینک نے ڈالا اور منگلا ڈیم شروع ہو گیا' امریکا نے ڈیم کے لیے منگلا میں ائیر پورٹ بنایا' امریکا سے انجینئرز کا پورا پورا جہاز منگلا آتا تھا' واپڈا نے منصوبے کی پڑتال کے لیے اپنا ہوائی

جہاز خرید لیا' دو سال بعد تربیلا ڈیم پر بھی کام شروع ہو گیا' یہ منگلا سے دوگنا بڑا تھا' یہ منصوبہ اتنا بڑا تھا کہ تین ملکوں کی کمپنیوں نے مل کر یہ ٹھیکہ لیا اور امریکا دنیا کی سب سے بڑی انجینئرنگ یونیورسٹی ایم آئی ٹی کے طالب علموں کو جہازوں میں بھر کر تربیلا لاتا تھا اور وہ طالب علم پندرہ پندرہ دن سائٹ پر رہتے تھے' تربیلا ڈیم اس دور کا اہرام مصر تھا' پوری دنیا میں اس کے بارے میں مضامین بھی چھپے اور دنیا کی بڑی انجینئرنگ یونیورسٹیوں نے اس پر تھیسس بھی کیے' منگلا اور تربیلا دونوں ڈیم اپنی مدت سے کم میں مکمل ہوئے اور دنیا پاکستان کے جذبے' شفافیت اور قوت فیصلہ کی معترف ہو گئی۔

ورلڈ بینک نے پاکستان کو منگلا' کالا باغ اور تربیلا تین ڈیم بنا کر دینے تھے' کالا باغ نسبتاً آسان تھا چنانچہ واپڈا نے فیصلہ کیا ہم امریکی انجینئرز سے منگلا اور تربیلا بنوا لیتے ہیں' ہمارے انجینئرز اس دوران ٹرینڈ ہو جائیں گے اور ہم کالا باغ خود بنا لیں گے اور یوں یہ ہمیں سستا بھی پڑے گا اور ہمارے انجینئرز بھی ٹرینڈ ہو جائیں گے اور یہ ہماری وہ غلطی تھی جس کا تاوان قوم آج تک ادا کر رہی ہے' ہم آج تک اپنی نالائقی کے زخم چاٹ رہے ہیں' پاکستان کیا تھا اور یہ کیا ہو گیا' ہم کس بلندی سے کس پستی تک آ گئے؟ آپ سوچیں گے تو شرمندہ ہو جائیں گے۔

ازدواجی زندگی میں لاتعلقی کا خوف

کالم 338/339 از ڈاکٹر سلطان محمود / ریپیٹ نمبر

8 جولائی 2020

انگلینڈ میں پریکٹس کرنے والی ایک تجربہ کار ڈاکٹر صاحبہ نے میاں بیوی کی کچھ عرصے بعد ایک دوسرے میں عدم دلچسپی کے اچھوتے عنوان کو چھیڑا ہے اور فرماتے ہیں کہ اگر دونوں کی ساری عادات و خصوصیات پر غور کریں تو سب سے اہم یہ ہے کہ میاں اور بیوی رشتے کو بیڈ روم سے نکل کر جینا سیکھیں۔ کچن، کھانے کی ٹیبل پر، گھر کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہوئے۔ گھر کے لاؤنج میں وقت گزاریں، باتیں کریں۔ اپنے بچوں کے بچپن کے سنہرے لمحات کو دل سے انجوائے کریں۔ کوالٹی ٹائم پر زور دیں تو توجہ کی کمی اور لاتعلقی کا خوف خود ہی ڈر کر گھر سے باہر نکل جائے گا۔

اس سے مجھے وہ نفسیات دان یاد آ گئے جو ہر مریض سے کہتے تھے کہ یاد رکھنا دوائی کھاتے وقت بندر کا خیال دل میں نہیں لانا۔ بالفاظ دیگر کچھ عوامل عملی طور پر بالکل ناممکن ہیں۔ یورپ نے ہم سے دو چار سو برس زیادہ ترقی کی ہے تو یہ ضرور دیکھیں کہ انہوں نے اس کا کیا حل نکالا ہے؟ یا پھر جب مسلمان ترقی کے عروج پر تھے تو ان کے پاس کونسا حل تھا۔ یورپ نے مختلف وقتوں میں لائف پارٹنر بدلتے رہنے کا حل پیش کیا ہے جس سے وہ نکاح کا رواج آہستہ آہستہ ختم کرتے جا رہے ہیں۔ مگر ایسا کرنے سے ان کے معاشرے میں حرام کی اولاد بڑھنے کے ساتھ ساتھ آخری عمر میں مرد عورت تنہا ہی رہ جاتے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے ترقی کے دور میں اس کا حل ایک سے زائد شادیاں تجویز کیا تھا دونوں مرد اور عورت کے لئے، جس کا واحد سائیڈ ایفیکٹ کثیر الاولادی تھی۔ ہم پاکستانی

بد قسمتی سے ہندو کلچر سے پیچھا نہیں چھڑا پائے لہٰذا اس کا سائیڈ ایفیکٹ بھگتتے رہتے ہیں یعنی ایک چھت تلے دو اجنبی بن جاتے ہیں اور عمریں گزار دیتے ہیں۔ دنیا بھر میں عورتوں کی تعداد مردوں سے بڑھتے دیکھ کر اور 25 سے 45 سالہ بن بیاہی یا مطلقین عورتوں کی پُر آشوب زندگی کے دکھ دیکھ کر میرے نزدیک اس عالمی نفسیاتی مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ مرد کو اپنی پہلی شادی

ہی کے وقت سے بیک وقت دو لڑکیوں سے شادی کرنی چاہئیے مگر بچوں کی تعداد چین کے سابقہ کامیاب فارمولے کے مطابق دونوں سے صرف ایک ایک بچہ۔ اس فارمولے کو میں بارہا بار پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ اس پر غور فرما کر بحث کیجئے۔

درختو درختی

کالم 341 از ڈاکٹر سلطان محمود

27 جولائی 20

دنیا کے سرسبز ممالک میں فی آدمی کے حصے میں آنے والے درختوں کی تعداد یہ ہے: کینیڈا میں 10263 'گرین لینڈ میں 4964، آسٹریلیا 3266، امریکہ 699، فرانس 203، ایتھوپیا 143، چین 130، برطانیہ 47 اور مصر میں ایک درخت فی آدمی ہے۔ مگر ہمارا پیارا پاکستان کہاں ہے؟ ہمیں تو لگتا ہے کہ یہاں الٹ معاملہ ہو گا۔ یعنی فی کس درخت کی بجائے فی درخت بندے لکھنے پڑیں گے جو شاید فی درخت دو چار بندے ہوں گے ہاں بلین ٹری منصوبہ اگر اپنی روح کے مطابق کامیاب ہو گیا تو ہم پانچ درخت فی کس کے حساب سے مصر سے بہتر ہو جائیں گے۔ ویسے چار نفوس والے گھرانے کے حصے میں دو درخت آ جائیں تو اس کی سالانہ آکسیجن کی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ یہی درخت خطرناک کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی انسانی پیداوار کو لکڑی میں منتقل کر سکتے ہیں۔

از ڈاکٹر سلطان محمود۔ ماہر غذائی تحفظ (غذا + ماحولیات)

Among highly populous countries, India (population, 1.267 billion) has a tree population of only 35 billion, leading to just 28 trees per person. Compared to Brazil which has 301 billion trees (1,494 per person), Canada 318 billion (8,953 per person), and China 139 billion (102 trees per person).

بہت زیادہ آبادی والے ممالک میں، ہندوستان (آبادی، 1.267 بلین) میں درختوں کی آبادی صرف 35 بلین ہے، جس کی وجہ سے فی شخص صرف 28 درخت ہیں۔ برازیل کے مقابلے جس میں 301 بلین درخت (1,494 فی شخص)، کینیڈا میں 318 بلین (8,953 فی شخص) اور چین میں 139 بلین (فی شخص 102 درخت) ہیں۔

امجد وڑائچ

For your next generation keep environment green and clean. One man one tree.

اپنی آنے والی نسل کے لیے ماحول کو سرسبز اور صاف رکھیں۔ ایک آدمی ایک درخت۔

از ڈاکٹر سلطان محمود

امجد صاحب اس وقت بھی زمین پر 400 درخت فی کس سے زائد موجود ہیں جو ہمیں سورج کی حدت سے بچائے کھڑے ہیں بلکہ کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کر کے آکسیجن دے رہے ہیں۔ مسئلہ ان درختوں کی دولت اور علم کی طرح یونیفارم تقسیم کا ہے۔ مثلاً دنیا بھر میں اگر شہروں میں آبادی 40 فیصد لگالیں تو درخت محض 20 فیصد ہونگے۔ یعنی 60 فیصد دیہاتی و جنگلی علاقوں میں 80 فیصد درخت موجود ہیں۔ اس زاویے سے دیکھیں تو شہری علاقے میں بسنے والے ہر شخص کے لئے دو ڈھائی تناور زندہ درخت ضروری ہیں جو فی کس سالانہ دس نئے درخت اگانے سے حاصل ہوں گے (70 فیصد موت کے حساب سے)۔ اگر اس حساب کو دس سالہ ٹارگٹ پر تقسیم کر لیں تب جا کر ایک درخت ایک شہری بنتے ہیں۔ دیہاتی علاقوں میں درخت نہ بھی لگائیں تو خیر ہے۔

Amjad Hussain Warraich

Sultan Mahmood sb you are educating people about environment. We all should stand with you and contribute some thing special for our future generation. Unfortunately our govt never focus on plantation trees is rainy and spring Season. N.G.o.s and govt should launch compagain in this regard in your leadership and should facilitate formers.students Imam of mosque and peer can also play vital role .

PUBLISHED IN WRITERS CAFE

امجد حسین وڑائچ

سلطان محمود صاحب آپ لوگوں کو ماحولیات سے آگاہ کر رہے ہیں۔ ہم سب کو آپ کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے اور اپنی آنے والی نسل کے لیے کچھ خاص حصہ ڈالنا چاہیے۔ بد قسمتی سے ہماری حکومت نے کبھی بھی درخت لگانے پر توجہ نہیں دی بارش اور بہار کا موسم ہے۔ این جی او اور حکومت کو اس سلسلے میں آپ کی قیادت میں مہم کا آغاز کرنا چاہئے اور سابق طلباء کو سہولت فراہم کرنی چاہئے۔ مسجد کے امام اور پیر صاحب بھی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

رائٹرز کیفے میں شائع ہوا۔

ہم بھی کتنے بے وقوف تھے

کالم 347 از ڈاکٹر سلطان محمود

22 اگست 2020

یہ وہ تھیسز ہیں جن پر ہم دن رات کام کرتے تھے اور یونیورسٹی سے منظوری پر خوشی سے دیوانے ہوئے پھرتے تھے۔ کچھ ساتھیوں کو شاید اس انجام کا پتہ تھا اس لئے وہ چپکے سے چوری شدہ مواد سے مقالہ مکمل کرتے یا کسی سے لکھوا لیتے اور پروفیسر کو "خوش" کر کے ڈگری لے کر پتلی گلی سے نکل جاتے۔

مالک کون وزیر اعظم یا جنرل؟

احمد علی کاظمی لکھتے ہیں

دو ہزار سترہ میں ایس سی او (پاکستان آرمی کے زیر انتظام ٹیلی کام ادارہ) نے پی ٹی اے کو ملک بھر میں موبائل سروسز کے لائسنس کے لئے درخواست دی اور سالانہ لائسنس فیس سے استثنا بھی مانگا۔ موبائل کمپنیز نے پی ٹی اے کو خبر دار کیا کہ اگر کسی سرکاری ادارے کو ایسا لائسنس دیا گیا تو یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہو گی اور موبائل کمپنیز متعلقہ عالمی ثالثی اداروں میں دعویٰ کریں گی۔ بھاری بھر کم جرمانوں اور ملک سے غیر ملکی انویسٹمنٹ کے انخلا سے ڈرتے ہوئے پی ٹی اے نے مختلف جائز قانونی اعتراضات کی بنا پر ایس سی او کی درخواست پر لائسنس جاری نہیں کیا۔

اس وقت کے چیئر مین پی ٹی اے، ممبر پی ٹی اے اور تین ایم ڈی، دو سال سے ای سی ایل لسٹ پر ہیں اور ان کے خلاف نیب کی انکوائری چل رہی ہے۔ تب کے ڈی جی ایس سی او میجر جنرل عظیم باجوہ آج پی ٹی اے چیئر مین ہیں۔

وسطی ایشیائی ریاستوں، ایران اور روس سے گیس اور تیل کے معاہدوں کی تکمیل کے لئے حکومت پاکستان نے دو ہزار پندرہ-سولہ میں ملک بھر میں پائپ لائنز کا جال بچھانے کا منصوبہ بنایا۔ یہ تقریباً ستر ارب روپے کا منصوبہ تھا۔ مقصد تیز ترین ترسیل اور ٹرکوں ٹرالوں کے ذریعے تیل ترسیل سے جان چھڑانا تھا۔ اس مقصد کے لئے قائم شدہ کمپنی آئی ایس جی ایس، جس کی شئیر ہولڈر حکومت پاکستان ہے، نے او گرا کو پائپ لائن بچھانے کی درخواست دی۔ ایک درخواست پاک آرمی کی فرنٹئیر آئل کمپنی نے بھی دی۔ وفاقی حکومت نے ای سی سی کی میٹنگ میں او گرا کو آئی ایس جی

ایس کو لائسنس جاری کرنے کی ہدایت کی۔ تاہم اوگرا کے لائسنس جاری کرنے سے پہلے حکومت ختم ہوگئی اور موجودہ حکومت آتے ہی اوگرا نے وہی لائسنس فرنٹئیر آئل کمپنی کو جاری کر دیا۔

دوہزار سولہ میں جی ایچ کیو نے وزیر اعظم ہاؤس کو سی پیک پر ایک اتھارٹی قائم کرنے کی تجویز دی جس میں آرمی کی اعلیٰ قیادت بھی ہو۔ حکومت نے یہ

تجویز مسترد کرتے ہوئے کہا کہ وزارت پلاننگ (احسن اقبال جس کے وزیر تھے) کے ہوتے ہوئے ایسی کسی تجویز کی ضرورت نہیں۔ موجودہ حکومت نے سی پیک اتھارٹی قائم کی اور جنرل رعاصم باجوہ کو اس کا سربراہ بنایا۔ آج حکومت نے اسی قانون میں مزید ترامیم تجویز کی ہیں جن کی رو سے وزارت پلاننگ کا کردار سی پیک سے ختم ہو جائے گا اور سی پیک اتھارٹی ہی اس منصوبے کا مکمل کنٹرول سنبھال لے گی۔ احسن اقبال نیب انکوائری بھگت رہے ہیں۔

پاک قطر ایل این جی معاہدے پر عملدرآمد کے لئے پاکستان کے پاس ایل این جی پلانٹ نہیں تھا۔ اگر ایک سال میں یہ پلانٹ نہ بنایا جاتا تو پاکستان کو

بھاری نقصان ہوتا۔ شاہد خاقان عباسی نے وزیر توانائی کی حیثیت سے معاملے میں خصوصی دلچسپی لی۔ ٹینڈر ایشو کیے۔ اینگرو کے کنسورشیم کو ٹھیکہ دیا اور

فوجی فرٹیلائزر اور ایف ڈبلیو او کا ٹینڈر مسترد کر دیا۔ اینگرو نے ایک سال سے بھی کم عرصے میں یہ پلانٹ مکمل کر دیا۔

اینگرو کے سی ای او، شاہد خاقان عباسی اور اوگرا کے متعلقہ افسران کے خلاف نیب ریفرینسز فائل ہو چکے ہیں اور یہ تمام لوگ کئی مہینے اسی مقدمے میں جیل رہ کر آ چکے ہیں۔

یہ نئے پاکستان کی چند جھلکیاں ہیں۔ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ یہ پی ٹی آئی کی حکومت ہے۔ عمران خان کی حیثیت جنرل مشرف کے زیر سایہ وزیر اعظم شوکت عزیز سے زیادہ نہیں۔

جعلی اور اصلی دودھ میں فرق

کالم 357 از ڈاکٹر سلطان محمود

14 اکتوبر 2020

دکھائی دینے میں دونوں دودھ ایک جیسے لگتے ہیں۔ مگر ایک من جعلی دودھ میں دو کلو تیسرے درجے کا چین سے درآمد شدہ جانوروں کو کھلانے والا خشک دودھ، ایک کلو گھٹیا کوکنگ آئل اور 36 کلو پانی ہوتا ہے۔ ان کو بڑے مکسر میں ڈال کر اس میں ایک کلو کے برابر کپڑے دھونے والا سرف اور فصلوں والی کھاد ڈالی جاتی ہے۔ پہچان یہ ہے کہ ابالنے کے بعد دودھ سے کھاد کی بو آئے گی نیز دیگچی کی تہہ میں ہلکا سا تیل کا نشان نظر آئے گا۔

اس کے علاوہ اصلی دودھ کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے اس میں بال صفا پاؤڈر، ڈنٹونک پاؤڈر، ہائیڈروجن پر آکسائیڈ اور سرف ملائی جاتی ہے تاکہ دودھ پھٹ کر بھی تازہ محسوس ہو۔ اس کی نشانی ہے کہ اس کی بنی چائے سے کھاد کی بو آئے گی نیز پھٹے ہوئے دودھ میں بھی پھٹیاں نہیں بنیں گی۔

دودھ کی بغیر ابالے اور 30 ڈگری درجہء حرارت پر عمر چھ گھنٹے ہے۔ دودھ کی پیداوار کے علاقے سے صارف تک پہنچنے میں عموماً بارہ سے اٹھارہ گھنٹے لگتے ہیں تو اگر ہر دودھی کے پاس ٹھنڈی گاڑیاں یعنی چلر نہ ہوں تو پھر ہر ترسیل کنندہ تازہ دودھ میں برف کا استعمال کرے گا جو کہ عموماً غیر صحت مند پانی سے بنتی ہے نیز بالوں کو بلیچ کرنے والی ہائیڈروجن پر آکسائیڈ کا استعمال بھی کرے گا تاکہ دودھ کو بارہ سے اٹھارہ گھنٹے پھٹنے سے بچایا جا سکے۔

گائے بھینس کو روزانہ آکسیٹوسین کا ٹیکہ لگا کر دودھ حاصل کرنے سے آہستہ آہستہ جانور میں حوانے کی سوزش یعنی میسٹائٹس کی بیماری لگ جاتی ہے جس سے تھن اندر سے گلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ باہر تک گلاؤ ظاہر ہونے دودھ میں پیپ آتی رہے گی جسے جانور کی درد سے بیچینی سے گوالا محسوس کر لیتا ہے مگر دودھ دھوتا اور بیچتا رہتا ہے۔ جب تھن اندر سے زیادہ گل جاتا ہے تو بسا اوقات لوتھڑے بھی دودھ کے ساتھ نکل آتے ہیں جنہیں گوالا دودھ کی بالٹی سے نکال پھینکتا ہے مگر پیپ اور جراثیم دودھ کے اندر رہ کر اسے ناپاک اور ناصاف بنا دیتے ہیں۔ مگر دودھ ابالنے سے یہ جراثیم مر جاتے ہیں۔ ابھی ہم جانور کی تکلیف کی تفصیل بیان نہیں کر رہے جو کہ ظلم عظیم کے زمرے میں آتا ہو گا۔

تو کیا ڈبے والا دودھ استعمال کریں؟ یہ ایک الگ موضوع ہے اور اس میں بھی دو نمبری عام ہے۔ اس پر ہمارے کئی عدد تفصیلی مضامین ماہنامہ "قومی صحت" میں غالباً پندرہ برس قبل چھپ چکے ہیں۔ جنہیں ہم نے اپنی حالیہ چھپنے والی کتاب "غذائی صحت" میں بھی شامل کر دیا ہے۔

23اکتوبر20

تبصرہ از ڈاکٹر سلطان محمود

گریجویٹ جامعہ زرعیہ

1976 تا1981 اس تجزیہ نگار کی بات بالکل ٹھیک ہے اور میرا بھی یہی تجربہ ہے۔ ایوب ریسرچ گو کہ ایک آزاد ادارہ ہے مگر اس کے کرتا دھرتا زرعی یونیورسٹی سے ہی گئے۔ ڈاکٹر امیر کے وقت سے میں اس جامعہ کی اچھائیوں برائیوں کا گواہ ہوں۔ گجر وائس چانسلر آیا تو گجر اعلیٰ پائے کے سائنسدان کہلائے، آرائیں آگیا تو ایسے ایسے بچے جمورے پروفیسر، چیئرمین اور ڈین بنے کہ جو آج ریٹائرمنٹ کے بعد بھی true کو ٹریو کہتے ہیں، جٹ وی سی آئے تو شیپاں گوٹاں والے پروفیسر بن بیٹھے۔ سبھی نے میرٹ کا قتل کہنا تو ایک طرف بلکہ قتل عام کیا۔ جو ذات برادری کا نہ ہوتا ان میں سے بہت کم کو لیکچرر شپ اور وظائف ملے صرف تجزیہ نگاروں اور نقادوں کا منہ بند کرنے کے لئے۔ اپنی برادری کی نزدیکی گوتوں میں ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی یوں بانٹیں گئیں کی جیسے ریوڑیاں۔ نیم چڑھے کریلے کی مانند دوسری مار اسے سیاستدان اساتذہ نے بخشی۔ اگر جماعت اسلامی کے ہو تو نوبل پرائز کے بھی حقدار ہو اور اگر نون لیگی ہو تو بیلدار کی سطح کا ملازم آٹھ سال وائس چانسلر بھی رہ سکتا ہے۔ وغیرہ۔

خیر بات نکلے گی تو دور تلک جائے گی۔ مختصراً عرض ہے کہ اس جامعہ نے اس ملک میں میرے سمیت جتنے نالائق پیدا کئے اس لحاظ سے اس کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں آجانا چاہیئے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ طالب علم بذات خود کبھی نالائق نہیں ہوتا دراصل اصل گنہگار استاد ہوتا ہے۔ اسکا

ثبوت دیکھنا ہو تو جامعہ زرعیہ کے ان طلباء کو دیکھیں جو اس پینڈو یونیورسٹی کو چھوڑ کر، یا سلیکٹ نہ ہو کر، اندرون و بیرون ملک پھیلے اور اپنی وہ قابلیت منوائی جسے

برادریوں اور سیاستوں کے "یدے" ہوئے اساتذہ نے ان کے وقتوں میں مسترد کر دیا تھا۔ یا پھر وہ خاموش اکثریت دیکھ لیں جو جامعہ سے چپکے سے ڈگری لے کر اپنے میدان عمل میں اتر گئے اور نجی اداروں کی مار کھاتے کھاتے سونے سے کندن بن گئے۔ ڈاکٹر صادق مرحوم اس لاٹ کی تازہ مثال ہیں۔ ذرا اندازہ لگائیں اور ستم بالائے ستم ظریفی دیکھیں کہ یہ جامعہ ابھی بھی پاکستان کی ممتاز جامعہ کہلاتی ہے اور بدستور نالائقوں کے سمندر میں اضافہ کرتی چلی جا رہی ہے۔ 🥹

مدارس کے اخراجات اور امداد

30 اکتوبر 20

مطربہ شیخ

مدارس کے اخراجات والی تحریر پر آپ احباب کی طرف سے تین مختلف رائے لکھی گئیں۔

مختلف فیس بک گروپس میں بھی تحریر لگائی گئی۔

تیس فیصد رائے تھی۔ بیرونی امداد۔

دس فیصد رائے۔ سرکاری امداد

بیس فیصد۔ مخیر حضرات اور ادارے

چالیس فیصد رائے۔ عوامی امداد

بیرونی امداد اگر ہوتی رہی تو سوال یہ ہے کہ ریاست کیوں امداد کے ساتھ رہی۔

اب یہاں ہم این جی اوز کو بھی لے لیتے ہیں۔

اگر بیرونی ایجنڈا اور ملک دشمن عناصر اپنے مقاصد کے لئے فنڈز دے رہے ہیں۔

تو ریاست کیوں لے رہی ہے، کیوں اس فنڈیا امداد کو روکا نہیں جاتا، اسحوالے سے ریاست پر تنقید و سوال بنتا ہے۔ اور جو پوچھتا ہے وہ غدار ہوتا ہے۔ چلیے دوسری رائے دیکھتے ہیں۔ سرکاری امداد اب

سرکار کے تحت جو مدارس ہیں، انکو چلنے دیتے ہیں، یہ ریاست کا فرض ہے کہ وہ دینی و دنیاوی دونوں اقسام کی تعلیم اپنے بچوں کو دے۔

تیسری رائے مخیر حضرات و ادارے۔

اس بارے میں میرا دوٹوک موقف یہ ہے کہ کاروباری حضرات ریاست کو ٹیکس دیں نہ کہ مدارس و فلاحی تنظیمیں اور دستر خوان بنا کر لوگوں کو کام چوری و کاہلی کی عادت ڈالیں۔

چوتھی رائے۔ عوامی امداد۔

عوامی امداد کا مستقبل یہ ہے کہ وبائی صورتحال کے باعث عالمی معیشت تیزی سے گر رہی ہے، اور اس گراوٹ کا اثر ہمارے ملک اور معیشت پر بھی ہو گا، بے تحاشا مہنگائی بڑھے گی اور ہم میں سے بہت سے لوگ سوچ سمجھ کر پیسے خرچ کریں گے تو پھر ان مدارس کا کیا ہو گا، ان میں موجود بچوں کا کیا ہو گا؟

تو ہمارے مخیر حضرات، ہمارے عوامی نمائندے یہ کیوں نہیں کرتے کہ صنعتوں کو فروغ دیا جائے جس طرح چین و ترکی میں دیا گیا ہے۔

امداد و فنڈز کو صنعتی مد میں استعمال کیا جائے اور زکوتہ و صدقات سے مستحقین کی بھوک و بیماریوں کا علاج کیا جائے۔

یہ تحریر جس جس کو مدارس و اسلام کے خلاف محسوس ہوئی، ان کی عقلوں کو سلام یہ بہت ہی بودا جواز ہے کہ اسلام کی آبیاری کو روکنے کے لئے ایسی

باتیں کی جاتی ہیں، اسلام عملی مذہب ہے، بار بار لکھتی ہوں اور پھر لکھ رہی ہوں۔ سورت المومنون کی پہلی دس آیات دینی معاملات کا نچوڑ ہیں اور بد قسمتی سے ہم انہی معاملات میں صفر ہیں تو کیا فائدہ ایسی تعلیم کا، چلیے دنیاوی تعلیم کی بھی بات کر لیتے ہیں کہ ہمارے پڑھے لکھے بھی ملک میں کوئی خاص

تبدیلی نہیں لا سکے ہیں۔ تو کیا فائدہ ہمارا اسلام اور مسلمانیت کا ڈھنڈورا پیٹنے کا، جب ہم معاملات میں ہی فیئر نہیں ہیں۔ تو سوچیئے، مکالمہ کیجئے اور حل نکالیے کہ ہم نے مستقبل اپنے بچوں کو معاشی بھوک سے، دہشت گردی سے اور ڈرون حملوں سے محفوظ رکھنا ہے۔

ڈاکٹر سلطان محمود

محترمہ ہمارے معاشرے کو مذہبی بلیک میلنگ کے لئے فرقے کی بنیاد پر استعمال کرنے کے لئے دو متحارب مسلم ممالک ایک کروڑ کے لگ بھگ معصوم پاکستانی بچوں کی ہمارے مولویوں کے ذریعے پرورش کر رہے ہیں۔ ان معصوموں میں مذہبی جذبات بھڑکا کر کسی بھی وقت شیعہ سنی مسئلہ کھڑا کر کے لامحدود آگ بھڑکائی جاسکتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ملکی سیکورٹی ایجنسیز ان معاملات سے پوری طرح آگاہ ہیں مگر ان کو بھی بد قسمتی سے وقتاً فوقتاً سیاسی جوڑ توڑ کے لئے انہیں مولویوں کو استعمال کرنا پڑتا ہے اس لئے وہ تخریبی مقاصد کے لئے دی گئی بیرونی فرقہ وارانہ فنڈنگ کو جان بوجھ کر نہیں روکتیں۔ میرے سروے کے مطابق پاکستان بیرونی فرقہ وارانہ آگ بھڑکانے والی مسلم طاقتیں چالیس فیصد سے زائد فنڈنگ کرتی ہیں اور انہوں نے ان مدارس کے سربراہوں کو ہماری سیاست میں بھی ملوث کر رکھا ہے۔ یہ کرایے کے گھوڑے ہمارے معاشرے کے امن کو کبھی بھی تہس نہس کر سکتا ہے۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

کالم 362 از ڈاکٹر سلطان محمود

30 اکتوبر 20

بائی دی وے، اگر دنیا سے کیش نوٹ اور سکے ختم ہو جائیں اور مائیکرو چپ کی شکل میں ایک چھوٹا سا کریڈٹ کارڈ ہمارے داہنے ہاتھ میں انگوٹھے کے ساتھ جلد میں فکس ہو جائے تو کئی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ ہماری صحت کے سارے ریکارڈ سے لیکر بنک بیلنس کی معلومات تک اس میں محفوظ ہوں گی۔ اشارے سے دروازے کھلیں اور بند ہوں گے۔ جہاں جائیں ہاتھ ملاتے ہی دونوں طرف کی مطلوبہ معلومات کا تبادلہ ہو جائے۔ جس کے جسم میں یہ ننھی سی چپ نہ لگی ہو اسے زندگی کی کوئی سہولت میسر نہ ہو۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج کل کریڈٹ کارڈ یا بنک اکاونٹ نہ رکھنے والوں کو کئی سہولتیں نہیں ملتیں۔

ہمارے ڈریا مزاحمت کی کہیں یہ وجہ تو نہیں کہ ہم نے نوٹوں اور سکوں کے تبادلے کی دنیا میں آنکھ کھولی تو اسی پر ایمان پکا کر لیا اور کبھی مڑ کے یہ بھی نہ دیکھا کہ ہم سے قبل کی دنیا میں تو بارٹر سسٹم رائج تھا یعنی چیز کے بدلے چیز۔ کبھی چمڑے، چاندی اور سونے کے بدلے تجارت چلتی تھی۔ اب اگر مائیکرو چپ کے ذریعے نظام چلے گا تو کیا قباحت ہو گی۔ یہ مائیکرو چپ فائیو جی سے کنٹرول ہو گی تو کیا قیامت آجائے گی۔ پہلے تھری جی سے فور جی میں جا کر کون سی قیامت آگئی تھی۔ بلکہ زندگی زیادہ آسان نہیں ہو گئی ہے کیا؟ مخالف تو ڈراتے ہی رہتے ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ جب بھٹو

نے پکی پکائی روٹی روشناس کرائی تو مخالفین نے کہا کہ اس کے اندر بچے روکنے کی دواڈال دی گئی ہے۔ تو بھائیو اور بہنو چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے یہ سب تو کرنا ہی پڑے گا کیونکہ نہ تو ہم محض بد دعاوں سے دشمن برباد کر سکتے ہیں اور نہ سائنس کو گالیاں دے کر اس کی رفتار روک سکتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ سو جوتے بھی کھائیں اور سو پیاز بھی۔

ایک ڈر جو ہماری نسل میں بیٹھا ہوا ہے کہ پھر ہمارا کوئی راز ہمارا نہ رہے گا اس سلسلے میں بتاتا چلوں کہ ہم صرف خام خیالی میں رہ رہے ہیں کہ ہمارے رازوں سے دشمن واقف نہیں۔ ہم ہمہ وقت مصنوعی سیاروں کی ایسی شعاؤں کی زد میں ہیں کہ نا صرف ہمیں خود کو اپنے سربستہ رازوں کا علم ہی نہیں بلکہ ترقی یافتہ ٹیکنالوجی والوں کی تو ان پر کب سے دسترس ہو چکی۔

اچھا ایک سوال پوچھتا ہوں۔ ہم اپنی الہامی کتابوں میں پڑھ چکے ہیں کہ یوم حساب میں ہمارے ہاتھ پاؤں بولیں گے۔ ذرا دماغ کو ہلا جلا کر سوچیں کہ یہ مائیکرو چپ وہی کچھ تو نہیں کرے گی ہمارے ساتھ ؟ کہ ہمارے بولے بنا لمحے لمحے کی داستان سناڈالے ؟ ہم اگر مذہبی و سائنسی تعصبات سے باہر نکل آئیں تو بتاؤں کہ علم کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ عقیدہ۔ تمام علوم کا مالک رب ہے۔ اب اگر وہ علم مسلمان کے ہاتھ سے منکشف ہو یا یہودی کے ہاتھ سے، مالک رب ہی رہے گا۔ فرق صرف یہ ہو گا کہ مذاہب و سائنس کی بے سود بحث کرنے والوں میں سے مذہب والے شکست کھا کر محکوم رہ جائیں گے اور سائنس والے علم ربی کے مالک بن کر حاکم ہو جائیں گے بلکہ ہو چکے ہیں۔ محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔

سردار وحید الرحمان عارف

ڈاکٹر صاحب ایک لمحے کے لئے سوچیے کہ آپ کی سوچ کہیں تصویر کا ایک ہی رخ تو ثابت نہیں ہو رہی۔ یہاں تفصیل میں جانے کا وقت نہیں سر دست کہتا چلوں کہ بے علم لوگوں کی حد تک تو آپ کی بات درست کہی جا سکتی ہے مگر جہاندیدہ لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد اس کی مخالفت میں ہے۔ آپ مسلمان ہیں اور پاکستان میں ہیں آپ دنیا کی ہر ترقی کو لبرل آنکھ سے نہیں بلکہ مسلم بلکہ اسلامی آنکھ سے دیکھیں۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا ہم جنس پرستی کو قانونی تحفظ دے چکی ہے اور دینے جا رہی ہے۔ کیا مسلمان اور پاکستانی بھی ایسا ہی سوچنا شروع کر دیں-اپنی بنیاد سے اس قدر دور نہ ہوں کہ دنیا کو اپنی فیض رسائیوں کا مدعی دینِ اسلام اپنی وسعتوں ہی کو شرمانے لگے۔

سردار وحید الرحمٰن عارف

ریٹائرڈ پاکستان نیوی

مرکزی صدر والٹن کینٹ ویلفیئر سوسائٹی

ڈاکٹر سلطان محمود

محترم مجھے بھی ذرا ان جہاندیدہ لوگوں سے ملا دیں تا کہ پتہ چلے کہ میری سوچ یکطرفہ ہے یا وہ کسی طرح کی کج علمی کا شکار ہیں۔ شکریہ۔

سردار وحید الرحمان عارف

ڈاکٹر عارف صدیقی مصنف۔ مقرر اور کارپوریٹ ٹرینر ہیں۔ انہیں یوٹیوب پر غور سے سنیے۔

آپ کی تحریر اپنے نکات میں دلائل کے لحاظ سے تشنگی کا شکار ہے۔

ڈاکٹر سلطان محمود

بلکہ میں عرض کرونگا کہ وہ ڈاکٹر صاحب میری تحریر کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر انہوں نے دماغی وسعت کا مظاہرہ کیا تو انشاءاللہ قائل ہو جائیں گے۔ اور اگر پھر بھی مطمئن نہ ہو پائے تو بالمشافعہ ملاقات کے بعد ہم ضرور ایک صفحے پر آجائیں گے۔

سردار وحید الرحمان

یہ آپ کی محبت ہے کہ آسانی سے یوٹیوب پر جانے کے بجائے مجھے آپ نے Labour Work پر لگا دیا۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی بھی ظاہر ہو رہی ہے۔ بہر حال اس وقت تو میں آپ کو پڑھ رہا ہوں۔ آپ کی تحریر میں یہ واضح نہیں ہے کہ G 5 کیا ہے اور اس سے کیوں مطمئن رہنا چاہیے۔ اپنی تحریر میں اس خالی جگہ کو پر کیجیے پھر بتایئے کہ اس میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ محض عمومی رائے کسی اگلی عمومی رائے کی کبھی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ جیسے ایک جھوٹ اگلے جھوٹ کی صداقت کا کبھی ثبوت نہیں بن سکتا۔

ڈاکٹر سلطان محمود

محترم 5 جی کی وضاحت اس لئے نہیں کی گئی کہ یہ ایک انتہائی مانوس ٹیکنالوجی ہے اور سبھی اس کے تبرکات و نقصانات سے آگاہ ہیں۔ یہ موجودہ دور کی انتہائی ترقی یافتہ وہ ٹیکنالوجی ہے جس سے مفر ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا اسے قبول کریں یا نہ کریں یہ اب ہمیں گھیرے ہی گھیرے۔ ہاں اس کے نقصانات سے حتی الامکان بچنے کے لئے اقدامات کئے جاسکتے ہیں۔ دیگر رے میں نے اپنی تحریر میں

اسے محض استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے لہٰذا میری سمجھ کے مطابق اس استعارے کی وجہ سے خالی جگہ بنتی نہیں۔

اللہ رسول سے پھسل کر بپا جانی تک

کالم 363 از ڈاکٹر سلطان محمود

یکم نومبر 2020

مسلمان حاضر و موجود بزرگان دین کی عقیدت میں پھسلتے پھسلتے اپنے مرکز سے یعنی غائب اللہ اور غیر موجود حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔ وہ مرکز جس میں ایک اللہ اور ایک رسول کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ ہری پیلی پگڑیاں، یہ ایک دوسرے سے جدا لباس، رنگ برنگ کے جبے، لمبی چھوٹی اذان، کلمات میں فرق، مذہبی تہواروں کا فرق، رسوم و رواج میں تبدیلی نے اللہ اور رسول کو بے حد پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اب جو مولوی سامنے بیٹھا ہے اس کی اہمیت صحابہ سے بھی بڑھ گئی ہے۔ یہ تفرقات غیر مسلم فلسفیوں نے بہت سوچ بچار کر کے وضع کئے جنہیں معلوم تھا کہ مسلمان قوم ہمیشہ جاہل اور ضدی رہے گی اور کبھی سائنسی علوم میں آگے نہیں بڑھے گی۔

پھر حضور کی وفات کے ڈھائی تین سو سال بعد ہمارے اندر وہ فقیہانِ حرم آ گئے جن کا بہانہ بنا کر مسلم امہ چار اماموں میں تقسیم ہو گئی اور یہاں تک

تفرقے میں کھوئی کہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز تک کی ادائیگی سے باغی ہو گئے بلکہ نکاح تک ٹوٹنے کی باتیں کرنے لگ گئے۔

پہلے پہل انگریز نے 1925ء میں ریلوے سٹیشنوں پر ایک ہی جگہ سے آنے والے پانی کے نل کی ٹونٹیاں پر مسلمان اور ہندو لکھ کر کیا اور اس طرح ہندو مسلم تفرقے کی بنیاد رکھی۔ پھر چند احمق مسلمانوں کو بھاری چندے دیکر بریلی، دیوبند، قادیان وغیرہ کے مسلم مدرسے کھلوائے اور یوں مسلمان آپس میں تقسیم کر دیئے گئے۔ سنی اور شیعہ کو تو حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے دور ہی سے ایرانی آتش پرست یزدگرد اور فلسطینی یہودی۔۔۔۔۔نے مل کر تقسیم کر دیا تھا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے دونوں مملکتیں فتح کرنے کے بعد ان زعماء کو بغیر اسلام قبول کئے مدینہ میں رہنے کی اجازت دیدی تھی۔ ایرانی قوم رضا شاہ پہلوی کے دور میں کلمہ گو ہو کر بھی عظیم آتش پرست سائرس اعظم کو ہیرو ماننے لگے گئی اور آپ کی طرح کہنے لگ گئی کہ محمد اور علی کے طفیل ہم مسلمان بنے مگر ہمیں اپنے عظیم بزرگوں پر بھی فخر ہے۔ مجھے 1976ء یا 77ء میں انکا ڈھائی ہزار سالہ جشن بھی یاد ہے جس میں پاکستان سمیت اکثر اسلامی ممالک کے سربراہوں نے شرکت کی اور ہمارے محکمہ ڈاک نے سائرس اعظم کا یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا۔ پھر انگریزوں نے صحرائے عرب کے ڈاکو کو ترکی توڑ کر شریف مکہ کو ہٹا کر شاہ سعود بنا دیا جس کی موجودہ نسل بڑے فخر سے آج بھی یقین رکھتی ہے کہ ہم ہزاروں سالوں سے عربی ہیں مگر صرف 1500 سال سے مسلمان ہیں۔ پھر عالم اسلام میں مشرق وسطی کی شیعہ سنی تحاریک کا اثر نمایاں ہے جنہوں نے آج بھی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی فرانسیسی قوم کی جانب سے توہین رسالت پر احتجاج تک نہیں کیا۔ پھر برصغیر کے جاہل مسلمان انگریز کے دیئے ہوئے سبق کے مطابق مزید فرقوں میں بٹتے چلے گئے۔ جس کی جدید شکل ان پیروکاروں کی ہے جن میں سے کوئی مولانا مودودی کو مانتا ہے تو کوئی غلام احمد پرویز کو، کوئی ڈاکٹر اسرار احمد کو تو کوئی غامدی صاحب کو، کسی کا ایمان الیاس قادری بپاجی کے ساتھ جڑ گیا ہے تو کوئی مبلغ دین مولانا الیاس کے ساتھ اور کسی کا قبلہ و کعبہ اعلیٰ حضرت امام خمینی ہیں۔ ان سب میں جو

بات مشترک ہے وہ تفرقہ ہے۔ اور سبھی اللہ اور رسول سے کافی دور ہٹ گئے ہوئے ہیں۔ سب اپنی تصدیق میں اپنی حدیثیں بیان کرتے ہیں اور قرآن کریم کی اپنی اپنی تشریحات میں الجھ گئے ہیں۔ اس تفرقے بازی کا اصل ہدف وحدت مسلم امہ ہے۔ اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ آج طاغوت ہم مسلم امہ پر چڑھ دوڑے تو ہم تفرقہ بازوں کو ایک ایک کر کے ذبح کر سکتا ہے۔

عورت کی نفسیات

کالم 366 از ڈاکٹر سلطان محمود

مورخہ 18 نومبر 20

کسی فلاسفر نے کہا ہے کہ عورت کی سب سے بڑی دشمن ذہانت ہوتی ہے۔ یہ اس کو کبھی خوش نہیں ہونے دیتی۔ تجزیہ کرنے کی قوت اس کو تباہ کر دیتی ہے۔ ہمیشہ خوش رہنے کے لئے تھوڑا بہت بے وقوف ہونا بہت ضروری ہے۔ عورت جب محبت کو بھی جانچنے اور پرکھنے لگتی ہے تو اس کی ذہانت کے سامنے مرد خود کو چھوٹا سمجھنے لگتا ہے جس سے اس کی مردانگی کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس کا حاکمانہ پندار مجروح ہو جاتا ہے مگر اس کے مقابلے میں ایک عام عورت مرد کو خاص ہونے کا یقین دلاتی ہے۔ عورت کو روٹھنے، منانے اور فرمائشیں کرنے کے عرصے میں مرد کو اپنے سپر مین ہونے کا یقین ہو جاتا ہے لہذا وہ ہتھیار پھینک کر عورت کو اون کر لیتا ہے۔ ایک عام سی عورت جیت جاتی ہے اور ساری زندگی مرد پر حکومت کرتی ہے۔ اس کی کمزوری ہی اس کی طاقت بن جاتی ہے۔ ذہین عورت کو یہ گر نہیں آتا لہذا وہ ہار جاتی ہے۔

اس فلاسفر کی بات میں خاصہ وزن ہے لیکن اس کی یہ بات شاید جزوی طور پر درست ہے کیونکہ ضروری نہیں کہ ایک عام ذہانت والی عورت ہمیشہ جیتے۔ ہاں جیت سکتی ہے اگر اپنے خیالوں میں احساس برتری کا شدید شکار نہ ہو اور نہ ہی انا پرست ہو۔

یہ بالکل درست ہے کہ ذہانت انسان کی دشمن ہے مگر یہ صرف عورت ہی نہیں مرد کی بھی اتنی ہی دشمن ہے کیونکہ یہ موئی ذہانت ایسے ایسے مطلب بھی نکال لیتی ہے جو کہنے والے کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔

پھر ذہانت ہر شخص کی perception کے مطابق اپنے پروٹوکولز بناتی ہے جس پر عمل نہ ہونے کی صورت میں وہ شخص خود سے تنہا ہو جاتا ہے۔ جسے فکری تنہائی کہتے ہیں۔

لہٰذا اپنے پروٹوکولز کی پوجا کر کے تنہا رہ جانے سے بہتر ہے کہ انسان اپنے اندر قربانی دینے کی عادت ڈالے، انا ء کم کرے اور دوسروں کی قدر اور نگہبانی کرے۔ مگر یہ کام نوجوانی ہی سے شروع کر دے تاکہ ادھیڑ عمری تک دوسروں کو اپنا گرویدہ بنالے۔ اور خود بھی خوش رہے اور دوسروں کو بھی خوش رہنے دے۔ ہر بات کا تجزیہ کرنے کی عادت بہت بری حرکت ہے۔ ہم چاہے جتنے بڑے ذہین ہوں لیکن اگر اپنے اندر نظر اندازی اور معاف کرنے کی عادت نہ ڈال سکیں تو پھر ہمیشہ پریشان ہی پھرتے رہیں گے۔

تم بے حد ذہین ہو میں جانتا ہوں اس لئے میں اپنے حالات و واقعات کی روشنی میں چاہوں گا کہ کم از کم تمہیں خوش رہنے کے گر بتادوں۔ چلو میں ناکام رہا تو کیا ہوا۔

کورونا کے لئے بھاپ لینے کے مشورے

کالم 390 از ڈاکٹر سلطان محمود

27 دسمبر 2020

کورونا کو مارنے کے لئے اکثر بھاپ لینے کا کہا جاتا ہے۔ بھاپ کا درجہ حرارت سو ڈگری سنٹی گریڈ تک ہوتا ہے۔ یہ تیزی سے نیچے گرتا تو ہے مگر بعض لوگ ابلتے پانی والے برتن کے اوپر سے بھاپ لینے کی کوشش کرتے ہیں جن کے نظام تنفس میں یہ ستر اسی ڈگری تک داخل ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ 42 ڈگری سنٹی گریڈ پر تو انسان کی موت واقع ہو سکتی ہے جیسا کہ اس درجہ پر مسلسل بخار سے ہو بھی جاتی ہے اور اگر نہ بھی ہو تو کورونا وائرس کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مارنے یا کمزور کرنے کے لئے ہمیں کم از کم 56 ڈگری سنٹی گریڈ بھاپ کی ضرورت ہو گی جبکہ اس گریڈ پر یا اوپر درجہ حرارت پر ہمارا سارا نظام تنفس جل سکتا ہے۔ اگر بیرونی طور پر جلے ہوئے شخص کا حال دیکھنا ہو تو کسی بھی برن یونٹ میں جا کر دیکھ لیں اور پھر وہیں سے اندرونی طور پر جلے شخص بارے معلومات بھی لے لیں۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ مانا گیا شفا بخش پانی پینے کا طریقہ مسلسل نیم گرم پانی پینا ہے۔ لہٰذا ہماری عرض ہے کہ کورونا کو بھاپ اور گرم پانی سے مارنے کی بجائے مستند معالجین کی رائے کے مطابق اس سے جان چھڑائیں۔ سوشل میڈیا نے ہر غیر مستند شخص کو بھی طبی مشورے دینے کی ناجائز صلاحیت عطا کر دی ہے۔

غذائی عدم تحفظ

کالم 391 از ڈاکٹر سلطان محمود

30 دسمبر 2020

نامیاتی غذاوں (آرگینک فوڈز) کے بارے ایک رپورٹ نظر سے گزری جو کافی حد تک درست تھی لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ پیش کر رہی تھی اور غالباً: اسے چھیڑا بھی یہودی کی مخالفت کی وجہ سے تھا بالفاظ دیگر مذہبی تعصب کی خاطر و گرنہ اس کا حقیقتاً "غذائی عدم تحفظ جیسے انسانیت سوز ظلم سے ہر گز تعلق نہیں تھا۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ ڈبہ بند غذائیں نہ لیں مگر آبادی کے بے تحاشہ بڑھتے ہوئے بوجھ کو اگر ہم کم کرنے کا کہیں تو کہیں ہمیں مولوی پکڑ لیتا ہے اور کہیں معاشرے کے دیگر عاقبت نااندیش لوگ ہمیں کفر کے درجات سے نواز دیتے ہیں۔ اس ضمن میں دوسرا ظلم جو ہم میں سے چند لوگ پیسے کی ہوس میں اندھے ہو کر پوری انسانیت کو غذائی عدم تحفظ کے اندھے گڑھے میں دھکیل کر ڈھاتے چلے جا رہے ہیں وہ ہیں زمین پر قبضہ کرنے، بیچنے اور آبادیاں بسانے والے بدمعاش گروہ یعنی لینڈ گریبنگ مافیا جو اپنی ناجائز سرگرمیوں سے پوری انسانیت کے قاتل بن رہے ہیں۔ ان میں ملک ریاض ٹائیکون سے لے کر گلی کی نکڑ پر بیٹھا معمولی سا پراپرٹی ڈیلر بھی برابری کا شامل ہے جو روز روشن میں نمازیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان قرآنی احکامات کی علی الاعلان نفی کرتے چلا جا رہا ہے جن میں زمین کی خرید و فروخت کو منع کیا گیا ہے

کیونکہ اللہ نے زمین انسانی خوراک و پوشاک اگلنے کے لئے بنائی تھی تاکہ اس کی انسان و حیوان سے لے کر پرند چرند تک کی مخلوق کبھی بھی بھوک کا شکار نہ ہو اور ننگی نہ رہے۔ میرے خیال کے مطابق اصل کافرین یہ زمینوں کے سودے کرنے اور کرانے والے ہیں۔ اب آتے ہیں تیسرے اس نکتے کی جانب کہ جو انسانیت کا اصل پیغام (چارٹر) ہے اور جسے نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمے، نماز، روزے، حج اور زکات کے سبق جتنا اہم قرار دیا اور لوگوں کو پابند بننے کا حکم صادر فرمادیا تھا یعنی "جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں"۔

اب ہمارے بھی کچھ سوال ہیں۔ کیا یہودی نے بغیر پلاننگ کے ہمیں زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے پر لگایا ہوا ہے اور قرآن چھڑایا ہوا ہے؟ کیا کسی مذہب نے ہمیں زمین بیچنے اور خریدنے پر مجبور کیا ہوا ہے تاکہ ہم زراعت کو اپنے ہاتھوں سے برباد کر کے بھوک ننگ میں اللہ کا نام لگادیں؟ یا کسی مغربی اور غیر مسلم "کافر" ملک نے ہمیں غذاؤں میں ملاوٹ پر مجبور کر رکھا ہے؟ ابھی ہم غذائی اجناس کی ذخیرہ اندوزی، ترسیل میں منافع خوری، قیمتوں کو من مرضی سے اوپر کرنے، بسیار خوری، عالمی فوڈ چینز کی بھرمار، چلتے ہوئے کھانا کھانے کی عادت یا کھانے کے دوران مطالعے، موبائل کے استعمال، ٹی وی دیکھنے یا کھڑے ہو کر کھانے جیسے "گھٹیا" سوال نہیں کرینگے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ نیم خواندہ عوام ان سوالات کا سامنہ کرنے کی بجائے ہمارے اوپر ہی چڑھ دوڑے گی۔

لاعلمی بھی اک نعمت

کالم 392 از ڈاکٹر سلطان محمود

5 جنوری 2021ء

آج کی تیس پینتیس برس والی نسل سوچتی ہے کہ ماسک لگانا بھی ایک عذاب ہے اور یہ بزرگ بھی کتنے وہمی ہیں۔ جو کورونا سے اتنا ڈر رہے ہیں۔ اگر وہ بزرگوں کے وقت کو دیکھ چکے ہوتے، پہلی اور دوسری جنگ عظیم دیکھتے، ویت نام اور سلطنت عثمانیہ کی جنگیں دیکھتے، جاپان پر گرتے ایٹم بم دیکھتے، سپینش فلو اور دنیا کی بدترین اقتصاد، زلزلوں، سیلابوں اور دیگر قدرتی تباہیوں کو بس ایک نظر ہی دیکھ چکے ہوتے اور پھر آج کے لمحے تک ان تمام تباہیوں سے بچتے بچاتے اپنے آپ کو اس کورونا کے دور میں زندہ بھی دیکھ رہے ہوتے تو یقین کریں رات سوتے بھی ماسک پہنے رکھتے، مصافحہ تو دور کی بات اپنے پیاروں تک کو گلے نہ لگاتے اور ہر وقت ہاتھ دھوتے نظر آتے۔ مسئلہ صرف علم اور لاعلمی کا ہے تبھی کہتے ہیں کہ لاعلمی بھی ایک نعمت ہے۔

کالم 393 از ڈاکٹر سلطان محمود۔

5 جنوری 2021ء

بھٹو زندہ ہے

کالم 394 از ڈاکٹر سلطان محمود

06 جنوری 2021ء

دنیا نیوز کے ایک اینکر پرسن نے بینظیر کے حالیہ یوم وفات پر گڑھی خدا بخش میں کئی سیاستدانوں کی بھٹو کے مزار پر ان کو تعریفی کلمات سے نوازتے ہوئے ایک تاریخ بیان کی ہے جس سے میری یادداشتوں میں دفن بے شمار واقعات تازہ ہو گئے ہیں۔ اس تاریخی تجزیے سے میں قائل ہو گیا ہوں کہ بھٹو واقعی ان لوگوں کے ہاتھوں زندہ ہو گیا ہے جن کے ہاتھوں مرا تھا۔ ہاں یہاں کمی صرف جماعت اسلامی کی محسوس کی گئی ہے جو بھٹو کو مارنے والوں میں صف اول میں موجود تو تھی مگر اپنے فیصلے اور خواہش پر آج بھی قائم ہے اور اسے دوبارہ زندہ کرنے پر راضی نہیں ہوئی۔ شاید اسے اپنے تین اکابرین کو ضیاء کی جانب سے دی گئی وزارتوں کا پاس تھا۔

میں نے بھٹو کی رعونیت بھی دیکھ رکھی ہے۔ نواز شریف کی جرنیلوں کے سامنے منمناہٹ بھی یاد ہے۔ بلکہ چند گھنٹے قبل آج ہی فیصل مسجد اسلام آباد کی سیاحت کے وقت یاد کر رہا تھا کہ اس "مرد مومن ضیاء الحق" نے اپنے منہ بولے ماموں میاں طفیل محمد مرحوم سمیت سیاستدانوں کو کتے سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں ان کے سامنے ہڈی پھینک دوں تو یہ میرے پیچھے پیچھے دم ہلاتے چلتے

آئیں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے ضیاء کے مزار کے جھروکوں سے اس کی قبر کی تصویر تو لی مگر اپنی افتادِ طبع کے باعث قبر پر فاتحہ پڑھنے کی توفیق نہ پا سکا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں جماعت کی تذلیل برداشت نہ کر سکا تھا بلکہ یہ ہے کہ ہمارے بے حیا ہی سہی مگر سیاستدانوں کی بھی کوئی عزت ہے اور انہیں ایک جرنیل نے کیوں گالی بکی۔

پھر مجھے اپنے قیام کوئٹہ کے وہ دن یاد آ رہے تھے جب بھٹو نے مینگل کی حکومت سمیٹی اور مری و مینگل ایریا پر بمباری کرا دی اور عطااللہ مینگل لندن اور خیر بخش مری افغانستان بھاگ گئے۔ نواب بگٹی کو گورنر راج لگا کر بلوچستان کا حاکم بنا دیا جس نے پھر بلوچستان سے پنجابیوں کو باہر نکال دیا ورنہ میں بولان میڈیکل کالج سے ڈاکٹر ہی بن کر نکلتا۔ غوث بخش رئیسانی کی وزارت بھی دیکھی اور کیا کیا دیکھا وہ فی الحال اس مضمون کا مدعا نہیں۔

بھٹو نے فوج کے ساتھ مل کر کیسی کیسی غیر جمہوری حرکتیں کیں اور کس کس غیر آئینی ہتھکنڈوں سے مجیب کو جھٹلایا اور محض اپنے اقتدار کی خاطر ملک دولخت ہونے دیا، نیپ سے اے این پی کا جنم کرایا، سردار اچکزئی کو بیچ بازار قتل کرایا، ڈاکٹر نذیر کو اپنے کلینک میں مروایا، اصغر خان جیسے بیشمار سیاستدانوں کو نظر بند رکھا، مگر مجھے وہ وقت بھی یاد آ رہا ہے جب ہم اسلامی جمیعت طلباء کے کارکنوں نے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور میں اپنے گھیرے میں وقت کے وزیر اعظم بھٹو کو جان کی امان پانے کے لئے سید مودودی کی ملاقات کی سہولت فراہم کی۔ مگر بھٹو کو مارنے کا فیصلہ دنیا کی وہ طاقت کر چکی تھی جس کے ایجنٹ کے طور پر ضیاء سوویت یونین سے بھڑ گیا تھا اور آٹھ ٹکڑے کر کے سانس لیا تھا۔ مجھے وہ بھی یاد آ رہا تھا کہ ضیاء کی موت کے تیسرے دن جب میں ڈاکٹریٹ کے لئے وارسا پولینڈ پہنچا تو جس جس کو پتہ چلتا گیا کہ میں پاکستانی ہوں مجھے سلوٹ مار کر خوش آمدید کہتے

ہوئے گنگنا تا کہ ہمیں بھی وہ راز بتاؤ کہ کیسے تمہارے جنرل ضیاء نے روس کو توڑ مروڑ کے رکھ دیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ مقتدرہ کا سلیکٹڈ بھٹو تب تک زندہ رہے گا جب تک ہمیں اصلی جمہوری رہنماء میسر نہیں آجاتا اور بد قسمتی سے ایسے بندہ خدا کا دور دور تک وجود نظر نہیں آتا۔

عالم اور کباڑیا

کالم 395 از ڈاکٹر سلطان محمود

08 جنوری 2021ء

کوئٹہ سے لاہور منتقل ہوا تو کرائے کا مکان ڈھونڈنے میں ایک مہینہ لگ گیا لہٰذا بھائی کی مہربانی سے فیملی اور سامان سمیت وہیں ٹک گیا۔ اپنا گھر چونکہ ذرا چھوٹا ملا تھا اس لئے ایک کیبنٹ میں کتابیں ٹھونس کر وہیں انہی کے غیر استعمال شدہ بالائی کمرے میں کوئی سال بھی رکھی رہیں۔ جونہی مرضی کا گھر ملا تو اپنی کتابیں اٹھالے آیا۔ بھائی نے مشورہ دیا کہ یہ کتابیں چونکہ پرانی ہو چکی ہیں نیز اب شاید آپ نے دوبارہ پڑھنی بھی نہیں تو انہیں کسی کباڑیئے کے ہاتھ بیچ دیں۔ ایک عملی انسان ہونے کے ناطے اس کے منطق سے بھرپور مشورے کے باوجود نجانے میرے جسم کے اندر کہیں ایک چھناکہ سا ہوا مگر میں خاموشی سے کتابیں گھر لے آیا۔ اور پھر شاید ہوا بھی یونہی کہ ان کتابوں کو محبت سے دیکھنے کے باوجود دوبارہ پڑھ نہ پایا لہٰذا امریکہ جاتے ہوئے انہیں اپنی مادر علمی کی لائبریری میں دیتا آیا۔ پھر دو برس بعد واپسی پر جب اسی لائبریری میں اپنی پرانی محبت دیکھنے گیا تو منکشف ہوا کہ جو آدھی بات میں نے اپنے بھائی کی نہیں مانی تھی اسے لائبریری کے کلرک نے پورا کر دیا ہوا ہے۔ کتاب واقعی کام کی چیز نکلی۔ اس نے کسی کی علمی پیاس بجھائی تو کسی کی شکمی بھوک۔

----------جاری----------

ادبی لائبریری فیصل آباد

کالم 396 از ڈاکٹر سلطان محمود

09 جنوری 21

میرے ماموں ظفر نظامی مرحوم کی ادبی لائبریری جو ان کے دوست اور ساتھی فاروق صاحب اب بھی جانفشانی سے چلا رہے ہیں۔ اس لائبریری کا ماموں نے آنہ لائبریری سے آج سے لگ بھگ ساٹھ ستر برس قبل آغاز کیا ہو گا جو فاروق صاحب نے نا صرف کھڑے کھڑے پڑھ چھوڑی بلکہ میں ان سے متفق تھا کہ ابن صفی نے اتنے جاسوسی ناول نہیں لکھے ہونگے جتنے ہم نے پڑھ رکھے تھے یعنی ایک ایک ناول کئی کئی بار۔ یہ اسی لائبریری کا اعجاز ہے کہ میری اردو زبان سے آشنائی اس قدر مضبوط بنیادوں پر استوار ہوئی ہے کہ جس کا تصور بھی آج کے بچے نہیں کر سکتے۔ انگریزی اور اردو سیکھنا اور لکھنا میرا جذبہ تھا جس کا اگلا معجزہ یہ ہوا کہ میرے نا صرف میٹرک اور ایف ایس سی میں ان دونوں مضامین میں برابر نمبر آتے رہے بلکہ آج بھی ان دونوں زبانوں میں میری پڑھنے، لکھنے، بولنے اور سمجھنے کی رفتار ایک جیسی ہے۔

آہ ڈاکٹر محمد حنیف چوہدری مرحوم

کالم از ڈاکٹر سلطان محمود

29 دسمبر 2019

ای کیپ کے سرپرست ڈاکٹر محمد حنیف چوہدری صاحب مورخہ 24 دسمبر 2019 کو اسی برس کی عمر میں ایک کامیاب ترین زندگی گزار کر اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

مرحوم کے لئے ان کے دفتر میں ایک تعزیتی ریفرنس منعقد ہوا جس میں انوائرنمنٹ ایسوسی ایشن آف پاکستان کے اراکین اور مرحوم کے ساتھیوں کی بھاری تعداد نے شرکت کی۔ مرحوم کے جن قریبی ساتھیوں نے شرکت کی ان میں پنجاب یونیورسٹی کے سابق ڈین فیکلٹی آف کیمیکل انجنیئرنگ پروفیسر ڈاکٹر ظفر اللہ شیخ اور پی سی ایس ائی آر کے ڈاکٹر محمد سرور شامل تھے۔ ای کیپ کی جانب سے صدر سید نہال اصغر، سیکریٹری جنرل محمد عظیم، سیکریٹری خزانہ ڈاکٹر سلطان محمود، سیکریٹری اطلاعات علیم بٹ، چیئرمین ٹیکنولیگل گروپ ایڈووکیٹ آصف علی سیال، رکن مجلس شوری ایڈووکیٹ یاسین ہاتف اور ان کے علاوہ بیشمار دیگر اراکین ای کیپ اور انکے بیٹوں اور دیگر اہل خانہ نے شرکت فرمائی۔

مرحوم کے ایصال ثواب کیلئے قرآن خوانی، دعائے خیر کے علاوہ سبھی نے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ جس کا مختصر خاکہ مندرجہ ذیل ہے۔

مرحوم ڈاکٹر محمد حنیف چوہدری 60 کی دہائی کے چیکوسلوواکیہ سے اولین پی ایچ ڈی تھے اور بیک وقت کیمیکل انجینئر، کیمیکل سائینٹسٹ اور کیمیکل ٹیکنالوجسٹ بھی تھے۔ آپ پی سی ایس آئی آر

کے ڈائیریکٹر جنرل رہ چکے ہیں اور اس کے علاوہ سابق صدر زرداری کی وزارت ماحولیات کے دور میں وزارت سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں ڈیپوٹیشن پر ڈائیریکٹر جنرل بھی رہے اور بیشمار عالمی فورم پر ماحولیات کے شعبے میں پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ آپ کی زندگی کا ماحولیات کیلئے اہم ترین کام PEQS یعنی پاکستان انوائرنمنٹ کوالٹی سٹینڈرڈز کی دستاویز کی تیاری تھی جو آج بھی محکمہ ماحولیات میں وفاقی اور تمام صوبائی حکومتوں کی سطح پر لاگو ہیں۔

ڈاکٹر محمد حنیف مرحوم کا ایک لینڈمارک کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ بیشمار ماحولیاتی تنظیموں کے رکن رہے اور ای کیپ کی بھی خوش قسمتی ہے کہ اس کی بنیاد بھی آپ ہی کے مبارک ہاتھوں سے 2017 میں لاہور میں رکھی گئی۔

ڈاکٹر مرحوم نے اپنی زندگی میں ماحولیات کے شعبہ میں جو گرانقدر خدمات سرانجام دیں ان میں ان کے عالمی سطح کے درجنوں تحقیقی مقالہ جات، نصف درجن کتب اور ان گنت عالمی و ملکی سائنس کانفرنسوں میں پڑھے گئے مقالہ جات شامل ہیں جو آج بھی نئی نسل کے لئے رہنما اصول مہیا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ملک کی پہلی ماحولیاتی لیبارٹری بھی لاہور میں قائم کی، اولین ماحولیاتی مشاورتی فرم قائم کی نیز انڈسٹریل سیکٹر میں سینکڑوں ماحولیاتی تجزیاتی رپورٹس مرتب کیں جن پر پاکستان بھر میں ان فیکٹریوں کو این او سی جاری ہوئے۔ علاوہ ازیں مرحوم نے بیشمار معاملات میں حکومت اور نجی سیکٹر کی بھی دستاویزی رہنمائی کی اور کئی مشکل مراحل پر انکی مدد میں پیش پیش رہے۔

آپ کے ہاتھوں سینکڑوں تربیت یافتہ پیشہ ور ماحولیاتی سائنسدان اور انجینئرز آج بھی بیشمار ماحولیاتی کمپنیوں نیز صوبائی و وفاقی اداروں میں کامیابی سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور اگر ایک

فقرے میں مرحوم ڈاکٹر محمد حنیف چوہدری صاحب کی زندگی کے کارناموں کو سمویا جائے تو بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ شعبہ ماحولیات کو پاکستان میں پروان چڑھانے والے وہ اولین آفتاب تھے جو پچاس برس سے زائد ملکی افق پر بلاشرکت غیرے جگمگاتے رہے۔

تمام حاضرین نے میڈیا کی اس بے حسی کو شدت سے محسوس کیا کہ ایسے نابغہ روزگار سائنسدان ساری زندگی گوشہ گمنامی میں گزار دیتے ہیں مگر شوبز کے معمولی سے کارکنوں کے نزلہ زکام کی خبریں سرخیوں میں رہتی ہیں۔ سبھی نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی کارناموں بھری زندگی میں روزنامہ سماء اور پاکستان کی دلچسپی اور کوریج کو سراہا اور حکومت وقت سے مطالبہ کیا کہ کم سے کم قومی نشریاتی اداروں میں ایسے سیل قائم کئے جائیں جو ایسے سائنسدانوں اور دیگر ہیروں کو تلاش کر کے انکی زندگی ہی میں لائم لائیٹ میں لائیں۔

اللہ ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔

طاق نسیاں

از ڈاکٹر سلطان محمود

13 جنوری 2020

عظیم المیہ ہے کہ جن غیر مسلم قوموں کو ترقی عزیز تھی انہوں نے قرآن کا احترام نہ کرنے کے باوجود اس کا ترجمہ کر کے سمجھا اور پھر عمل کر کے دنیا پر چھا گئے۔ ہم نے احترام کے طور پر کھولنا بھی اب گوارا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ جب ثواب کی نیت بنتی ہے تو بلا سمجھے تلاوت کر کے اسی کو یہ کلام سناتے ہیں جس نے یہ کتاب بھیجی ہے۔ جب سمجھیں گے نہیں تو عمل خاک کرینگے۔ اور پھر اسی کلام پاک کو سامنے رکھ کر ایسی ایسی دعائیں مانگتے ہیں جو روح سے خالی، عمل کے پیدل، عقل سے ماورا اور خود غرضی سے بھرپور ہوتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہماری دعائیں قبولیت کا درجہ حاصل نہیں کر پاتیں۔

دنیا کا ڈیڑھ ارب مسلمان روزانہ کھربوں دعائیں کرتا ہے جو حج، عمرے، سوشل میڈیا نیز ذاتی و اجتماعی طور پر کی جاتی ہیں۔ ان کھربوں دعاؤں میں امت مسلمہ کے لئے بھی ہر کوئی دعا مانگتا ہے۔ لیکن ان سب دعاوں کی نامقبولیت کا یہ عالم ہے کہ مسلمان روزانہ کی بنیاد پر تنزلی کا شکار ہے۔ نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ کہیں یہ وجہ تو نہیں، جیسا کی حدیث میں بھی ہے، کہ اگر کسی کے تن پر حرام کا لباس اور پیٹ میں حرام کا لقمہ ہے تو اس کی دعا ہر گز قبول نہ ہو گی۔ صرف اشارے کے طور پر سودی معیشت کا ذکر کرونگا۔

ہم میں سے ہر کوئی اپنے آپ کو اچھا مسلمان سمجھتا ہے۔ کیا اس خوش فہمی میں غرقاب رہنے کا کوئی جواز بھی ہے ہمارے پاس؟ کہیں یہ نہ ہو کہ قرآن پر عمل کرنے عالی غیر مسلم طاقتیں کل کلاں کلمہ بھی پڑھ کر کچھ مزید اسلامی عقائد اپنا کر مومن بن جائیں اور ہم بے عمل مسلمان لکیر ہی پیٹتے رہ جائیں۔

ڈگری کی بندش

کالم از ڈاکٹر سلطان محمود

5 فروری 2020

میرا اینیمل ہسبنڈری کا تیسرا بیچ تھا (ag -76) لہٰذا سوسائٹی آف اینیمل سائنسز (SAS) بنانے والوں میں سے ہونے کے ناطے (1979) اور پھر اسکا پہلے نائب صدر اور دوسرے صدر ہونے کی حیثیت سے شاید اس ڈگری کی بندش والے پر نفرت فیصلے کا میں سب سے زیادہ گواہ ہوں۔ یونیورسٹی آف وٹرنری اینڈ اینیمل سائنسز (UVAS) بنانے والے گروہ میں بھی میرا شمار ہوتا ہے۔ مگر نوکری کی خاطر بعد ازاں اینیمل ہیلتھ کے شعبے کو قبول کرنا پڑا جس میں مجھے مہارت ہی نہ تھی۔ میں نے نوکری کے ابتدائی ایام کو محکمہ لائیوسٹاک پنجاب میں جس طرح گزارا اور دونوں ڈگریوں کے انضمام کے وقت جو تجربات حاصل کئے وہ بھی ایک عہد ساز تجربہ ٹھہرا۔

اس وقت (1985-86) میں پانچ چھ بوڑھے شیطانوں نے یہ ڈگری ختم کرادی۔ اس میں خبیث اعظم پروفیسر منظور قریشی تھا دیگر عاقبت نااندیشوں اور غیر پیشہ ور ویٹس میں اسی کا بہنوئی ریپروڈکشن والا ڈاکٹر؟ مصطفی، منیر اکرم، ڈی جی ایکسٹینشن وہاب خان وغیرہ اور پھر ان کے گماشتے تھے۔ ویسے اینیمل ہسبنڈری والے پروفیسر ظہیر جیسے لوگوں کی عدم دلچسپی بھی ایک وجہ تھی جنکو پیشے سے زیادہ امریکہ میں پٹرول پمپ خریدنے کا شوق تھا۔ چھوٹے درجے کے چمچوں میں طلعت نصیر پاشا، ڈاکٹر انظار اور نواز سعید کی طرح کے تھرڈ ڈویژنر بھی تھے خیر۔ ان سب کو زرعی

یونیورسٹی اور سی وی ایس میں عہدوں کا لالچ تھا۔ شاید اس ویٹس مافیا کو بھی ویسا ہی عہدوں لالچ تھا جیسا یہ اینیمل ہسبنڈری کے اولین استادوں پر الزام لگاتے تھے۔ ان اولین اساتذہ میں سابق وی سی ڈاکٹر اسرار الحق، منظور الدین احمد، بخت بیدار خان، اکمل خان، راجہ اکرم، جمیل قریشی، رفیق چودہری، الطاف الرحمان برق، دونوں تصور حسین شاہ صاحبان اور ظہیر شیخ وغیرہ شامل تھے۔

ڈگری کا بند ہونا یا مخلوط ہونا بہر حال جو بھی کچھ ہوا انتہائی غیر پیشہ ورانہ ہوا اور اگر ویٹس گینگ کا سرغنہ منظور قریشی جیسا انتہائی متعصب، منفی سیاستدان اور سازشی (مگر قابل بھی) نہ ہوتا اور اسے بعد ازاں بگ برڈ والے ڈاکٹر یعقوب بھٹی گورنر خالد مقبول سے جوڑ نہ دیتے تو یہ ٹولہ اپنے ماتھے پہ یہ کلنک کا ٹیکہ نہ لگوا پاتا۔ منظور قریشی کی انہی حرکتوں کی وجہ سے اسے زرعی یونیورسٹی سے نکال بھی دیا گیا تھا اور اسے 8 برس یوگنڈا میں گزارنے پڑے۔ شاید یہ بھی ایک وجہ تھی کہ اس نے انتہائی غیر پیشہ ورانہ انداز میں اونٹ جیسا انتقام کسی اور سے نہیں لیا بلکہ اپنے مقدس پیشے ہی کی ریڑھ مار کے رکھ دی۔

گو کہ اینیمل ہسبنڈری کی الگ فیکلٹی بنا کر سیوں ہی کا جھگڑا رہا ہو گا اور پھر ڈگری کا بند ہونا انتقام ہی ہو گا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ لائیوسٹاک کے کل علوم میں 80 فیصد اینیمل پروڈکشن کا ہی کردار ہے اور علاج معالجے کا محض 20 فیصد۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں بھی ایسا ہی ہے۔ اس لئے منظور قریشی کی غیر پیشہ ورانہ مہم جوئی جلد ہی ریورس ہو گی اور اب حیوانی پیداوار اور طبی ڈسپلن عالمی معیار کے مطابق انشاء اللہ جلد ہی واپس ہو جائیں گے۔

نوٹ: کئی اساتذہ اچھا برا کردار ادا کر کے وفات پا چکے ہیں اللہ انکی مغفرت کرے اور انکے دنیاوی لالچ میں اٹھائے گئے اقدامات سے تعرض نہ کرے۔ اس تحریر سے اگر اساتذہ کی توہین کا پہلو نکلے تو

بھی معافی کا خواستگار ہوں کیوں کہ استاد علم کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ دنیاوی لالچ میں کچھ غیر پیشہ ورانہ حرکتیں کرتا بھی ہے تو ہمیں نفرت اس کے کردار سے ہے انسان سے نہیں۔

انسانی مزاج کا ایک ذاتی سروے

کالم از ڈاکٹر سلطان محمود

9مارچ2020

میری دس برس تک سوشل میڈیا پر موجودگی نے کچھ ایسے ذاتی تجربے اور نتیجے سے مجھے روشناس کیا ہے کہ میں انتھروپولوجی یا انسانی سلوک و برتاو کے علم پر مندرجہ ذیل نظریات کی وضاحت پر مجبور ہو گیا ہوں۔ پہلے تین واقعات اور ان سے حاصل شدہ شماریات بیان کرونگا اور پھر نتائج کی تزویراتی وضاحت ہو گی۔

میں نے ایک بار طنزیہ، طربیہ یا مزاحیہ پوسٹ کو شئیر کیا جس میں کسی کے بنائے گئے کلپ میں جگتوں کا ایک سیلاب تھا۔ اس پوسٹ کو پچھلے 81 دنوں میں 4لاکھ نوہزار لوگوں نے دیکھا، 20 ہزار نے شئیر کیا، 6600 نے لائیک اور 191 نے کمنٹس دیئے۔ اس سے قبل میری 2018 میں بنائی گئی شکر پڑیاں اسلام آباد پر بندر تماشے والی پوسٹ کوئی سال بھر بعد دنیا کا چکر کاٹ کر دوبارہ میرے ہی پاس آگئی جس کو عالمی سطح پر لگ بھگ 11 لاکھ لوگوں نے دیکھ رکھا تھا، لائیک اور حیرت وغصے والے ہزاروں ری ایکشنز کے علاوہ کوئی 40 ہزار نے شئیر کر رکھا تھا نیز لگ بھگ 20 زبانوں میں اس پر 4 ہزار سے زاید تبصرے بھی موجود تھے۔ اس لحاظ یہ دوسری پوسٹ میرے بنائے گئے کلپ یا طبع زاد پوسٹوں میں پچھلے دس برسوں میں پہلے نمبر کی پوسٹ تھی۔ علاوہ ازیں میری تیسرے نمبر پر آنے والی پوسٹ امریکہ کی جارحیت والی طبع زاد پوسٹ پچھلے تین ہفتوں سے دنیا

بھر میں گھوم رہی ہے جسے کسی کرم فرمانے کسی خفیہ ہاتھ کی فرمائش پر شاید انگریزی میں بھی ترجمہ کر دیا ہے جس سے امکان ہے کہ یہ بھی لگ بھگ لاکھوں نظروں سے گزرے گی۔

ان شماریات سے میں نے جو اندازہ لگایا ہے وہ یہ ہے کہ بندر تماشے والی پوسٹ پر تبصرے بتاتے ہیں کہ ترقی یافتہ یا مغربی دنیا کی نظر میں جانوروں پر ظلم ایک بہت بڑا جرم ہے۔ وضاحت کر دوں کہ یہاں حکومتوں نہیں بلکہ عوام کی بات کی جا رہی ہے۔ جگتوں والی پوسٹ پر عوام کا ردعمل بتاتا ہے کہ پاکستانیوں کی نظر میں پہلے نمبر پر طربیہ پیغامات ہوتے ہیں جبکہ تیسری پاپولر پوسٹ بتاتی ہے کہ پاکستانیوں کی نظر میں امریکہ سے نفرت دوسرے نمبر پر ہے۔

مندرجہ بالا شماریات سے اگر انسانی نفسیات کا جائزہ لیا جائے تو کچھ یوں نکلے گا:

1۔ مغربی اقوام کی عوام اپنی تربیت کے لحاظ سے خدا ترس ہے اور انسان ایک طرف حیوان پر بھی ظلم سے بلبلا اٹھتی ہے۔ میری اس وضاحت پر صرف وہ لوگ قلم اٹھائیں جن کا مغرب میں رہنے کا دس سال سے زاید تجربہ ہو۔ ورنہ سنی سنائی بات پر ہم دھیان نہ دینگے۔

2۔ پاکستانی عوام اپنے معروضی حالات کے باعث گھٹن کا شکار ہے۔ اس لئے ذرا سی بھی ہنسی خوشی کی متلاشی رہتی ہے۔ اور لطیفہ ہو یا جگت اس پر ہی خوش ہو کر تھوڑے وقت کے لئے اپنی کلفتیں پس پشت ڈال دینا چاہتی ہے۔

3۔ رہی بات ہماری اور باقی دنیا کی امریکہ سے نفرت کی تو وہ ہر جگہ کے عوام میں ایک جیسی ہے۔ اس نفرت کی وجہ وہاں پر جارحیت کی پالیسی کا اپنایا جانا ہے جس کا فیصلہ ابراہام لنکن کے دور میں ایک سروے کے بعد کیا گیا تھا کہ امریکہ کیسے دنیا کے لوگوں پر حکومت کر سکتا ہے؟ مذکورہ

سروے نے امریکن پالیسی میکرز کو دو ترجیحات بتائی تھیں۔ اول، اگر دلوں پر راج کرنا ہے تو نبیوں والا یعنی خیر والا طریق اپنانا ہو گا۔ اور دوم، اگر جسموں اور ذہنوں پر حکومت کرنی ہے تو تشدد، جارحیت اور ظلم کے ذریعے انسانوں کو ڈرا کر محکوم بنانا ہو گا۔ بہر حال خیر کا سلسلہ لمبا اور صبر آزما ہونے کے باعث ترک کر دیا گیا اور دوسری ترجیح آج تک جاری ہے جس سے انسانوں کی اکثریت امریکہ سے نفرت کے باوجود مجبوراً جھکی پڑی ہے۔

آپکی بالغانہ رائے کو خوش آمدید کہہ کر اسے عنقریب چھپنے والے سوشل پیپر کا حصہ بنایا جائے گا۔

اقبالؒ کا فلسفہ قدرتی ماحول

دبستان اقبال ایک بہت اعلیٰ پائے کا قومی سطح کا ادبی فورم ہے اور میری خوش قسمتی ہے کہ تیسری بار یہاں لیکچر دینے کے لئے منتخب کیا گیا ہوں۔ احباب ضرور تشریف لائیں چائے وغیرہ سے تواضع بھی ہو گی۔ چونکہ ہال میں 50 افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے اس لئے جو 10 دوست جمعہ تک آنا کنفرم کر دینگے ان کے لئے جگہ رکھوانے کی کوشش کرونگا مگر پھر بھی 5 بجے تک پہنچنا ہو گا۔

اس لیکچر میں میرے مضمون ماحولیات کی نسبت سے مشرق کے شاعر فطرت اور فلاسفر حضرت علامہ اقبالؒ کے فلسفہ قدرت کی روشنی میں وضاحت پیش کی جائیگی اس لئے موضوع میں تھوڑی سی تبدیلی کی گئی ہے جو یوں ہو گا "اقبال کا فلسفہ قدرتی ماحول"۔

میں کہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ پولینڈ سے ڈاکٹریٹ کرنے کے دوران فلاسفی کا مضمون لازمی طور پر بحیثیت معاون لینا ہوتا تھا۔ مجھے استاد صاحب نے ایشیائی ہونے کے ناطے رابندر ناتھ ٹیگور کو منتخب کرنے کا کہا مگر میں نے اقبالؒ کا انتخاب کیا۔ اس نے دو روز بعد بلایا اور عالمی فلاسفرز کی فہرست میں میرے روحانی استاد کے نام کی موجودگی کی وجہ سے مجھے اجازت دیدی۔ اس دوران وہ اقبال کو خاصہ پڑھ چکا تھا اور اس کے الفاظ تھے کہ "اقبال بہت مشکل پسند لگتے ہیں کیونکہ انہوں نے ذریعہ اظہار شاعری کا چنا ہے حالانکہ ریاست پر ان کا فلسفہ ہیگل اور نطشے سے بہتر اور قدرت نگاری پر جان کیٹس، ورڈزورتھ اور شیکسپیئر کے پائے کا ہے"۔ بہر حال میرے پروفیسر کی نظر میں پاکستان کا قد بہت بلند ہوا۔ پھر سفارتخانے نے لٹریچر اکٹھا کرنے میں مدد دی، سفیر پاکستان انعام اللہ حقانی میری

پریزنٹیشن میں تشریف لائے اور یوں میں 52 ممالک کے سینکڑوں سکالرز میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے ساتھ ساتھ ایک امتیازی ڈگری کا بھی حقدار ٹھہرا۔

میں نے چونکہ ماحولیات کے مضامین وہیں یورپ سے ہی پڑھنا شروع کر دیئے تھے اس لئے اقبالؒ کو فلاسفر کے علاوہ قدرت کا ترجمان بھی پایا اور سچ پوچھیں تو بہت سارا قرآن سمجھ میں آنا شروع ہو گیا۔ اس کے بعد سے اقبالؒ کو محض شاعر کہنا یا سمجھنا کم از کم مجھے بہت ہیچ لگتا ہے۔

میرے آنے والے لیکچر میں انشاء اللہ ماحولیات کے تمام شعبہ جات مثلاً طبعی ماحول، حیاتیاتی ماحول اور سماجی ماحول پر استاد المحترم کی شاعرانہ دلالت پیش کی جائے گی جو میری جانب سے ایک حقیر سا نذرانہ ہو گا۔

چار بیویاں

12 دسمبر 20

یہی کچھ اسلام بھی کہتا ہے جہاں اچھی نیت کے ساتھ حلال کاموں کی قطعاً ممانعت نہیں اور نہ کسی بھی مزید شادی کی پابندی ہے۔ اگر ہم ہر پانچ برس بعد نئی شادی کر لیں تو شریعت میں ایسی کوئی پابندی نہیں۔

اس کا طریقہ اگر یہ اختیار کر لیں کہ پہلے پندرہ بیس برس ایک ہی بیوی رکھیں پھر دوسری، تیسری اور چوتھی پانچ پانچ برس بعد لاتے جائیں۔ اس طرح 35 برس تک آپ جوان رہیں گے۔ بعد ازاں اگر ضرورت محسوس ہو تو تقویٰ اختیار کر کے بقیہ زندگی سابقہ بیویوں پر ہی گزر بسر کریں۔ ہاں اگر اتفاق سے کوئی بیوی چھوڑ جائے تو مزید ایک کی گنجائش نکل آئے گی۔

اگر ایسا نہ ہو سکے تو بھی کم از کم دو بیویاں رکھیں مگر کوشش کر کے فیملی پلاننگ یوں کریں کہ ہر پانچ برس بعد ہی بچہ پیدا ہو۔ ایک نیا بچہ بھی ماں باپ کو پھر سے جوان بنا دیتا ہے۔ آخری بچہ 65 سال کی عمر میں بھی ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

یہ سب تجاویز عین اسلام ہیں کیونکہ نیت اور تقویٰ بنیادی شرط ہے۔ اس طرح مرد و عورت حرام کاریوں سے بھی بچے رہیں گے۔ صرف ایک بیوی رکھنا بلکہ غیر اسلامی و ہندووانہ رسم ہے جس کا توڑ نہ کرنا بھی گناہ ہے۔ اس ہندووانہ رسم نے ہمارے معاشرے میں کنواری بیٹھی عورتوں میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے جو اسلام سے روگردانی کے باعث سب مردوں بلکہ پورے معاشرے کے لئے گناہ ہے۔ نیز اگر وہ غیر شادی شدہ لڑکیاں زناء کا شکار ہو جائیں تو ساری امت پر گناہ لازم ہو جائے گا

کیونکہ ہم مرد اس صورتحال کے ذمے دار گنے جائیں گے۔ یا جو عورت دوسری تیسری یا چوتھی عورت کا راستہ روکے گی وہ بھی جہنمی شمار ہو گی۔

اب یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ عورت پھر ایک ہی خاوند تک کیوں محدود رہے؟

اسلامی احکامات کے مطابق عورت صرف ایک وقت میں ایک خاوند کے حق میں بیٹھے گی لیکن اگر اسے مردوں کی طرح کی کوئی خواہش ابھرے تو وہ بھی اپنے خاوند کو چھوڑ کر شرعی تقاضے پورے کرتے ہوئے دوسرے کے نکاح میں جاسکتی ہے۔

ایک اہم نقطہ کبھی نظر انداز نہ کریں اور وہ ہے بلوغت تک پہنچنے کے بعد زیادہ وقت لڑکے لڑکی کو بغیر شادی کے نہ رہنے دیں۔ ایسی حالت میں جتنے زناء

ہونگے وہ لڑکے لڑکی کے ساتھ ساتھ والدین کے نام بھی لکھے جائیں گے۔ بدقسمتی سے برصغیر پاک وہند میں اسلام کو درست طریقے سے سمجھا یا ہی نہیں

گیا کیونکہ ہم جنت کے لالچ میں مسلمان ہوتے چلے گئے یا ہندو مت میں نچلی ذات سے اوپر اٹھنے کی خاطر اسلام لانے پر مائل ہوئے مگر اپنے رہن سہن کو ہندووانہ ہی رہنے دیا۔ ایسی صورت میں برصغیر کے لوگوں کا جنت میں داخلہ ناممکن سا لگتا ہے ماسوائے کہ اللہ سبحان تعالی ہمیں اپنی رحمت میں لپیٹ کر جنت بھیج دے تو اور بات ہے۔ ورنہ اعمال میں ہم یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی گرے پڑے ہیں۔

یہ میرا ذاتی نقطہ نگاہ ہے جو سترہ معاشروں میں کام کرنے کے بعد بنا ہے اس میں صرف قرآنی علوم کے ماہرین کا تبصرہ ہی میں سننا پسند کروں گا اور شاید

فیس بکی دانشوروں کا جواب بھی نہ دوں۔ اس لئے سطحی علم رکھنے والوں سے پیشگی معذرت۔

ڈاکٹر سلطان محمود

تھے تو وہ آباء تمہارے ہی مگر؟

اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ جیسے کسی قوم کو احساس تحفظ میں رکھنے کی خاطر انہیں یقین دلا دیا جاتا ہے کہ ان کے محافظ یعنی فوج دنیا کی

بہترین فوج ہے یا پاک وہند میں ذات پات کے تصور کو جلا بخشنے کے لئے ان کے بزرگ ان کو بچپن سے ہی اپنی بہادری اور غیرت کے خود ساختہ قصے کہانیاں سنا کر غرور کے درجے پر پہنچا دیتے ہیں۔ ایسے ہی بحیثیت مجموعی مذاہب کے اندر بھی کاروباری ذہنیت والے مقلدین اپنے خود ساختہ قصے گھڑ کر ان کی تاویلیں اپنی الہامی کتابوں تک میں ڈھونڈ لیتے ہیں یا اپنے انبیاء وغیرہ سے منسوب کر لیتے ہیں۔ اگر تھوڑا آگے چلیں تو ہر مذہب کے اندر دیگر کاروباری طبقے اپنے مفادات کی خاطر فرقے گھڑ لیتے ہیں اور اسی مذہب کی وسیع مارکیٹ کے اندر رہتے ہوئے اپنے الگ سے پلازے تعمیر کر لیتے ہیں نیز یہی تاجر پیش ہمذہبی عناصر وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کو چیلنج بھی کرتے رہتے ہیں۔ جو جتنا ذہین ہو گا اتنا ہی بہتر فرقہ بنالے گا۔ لیکن کھوج لگائیں تو بنیاد محض جھوٹ پہ کھڑی ہو گی۔

یہ انسانی مسابقت اس کی حیوانی فطرت کی عکاس ہے۔ انسان لاکھوں برس جنگلی رہا اور یہ لڑائیاں اور تفرقے حیوانوں ہی سے سیکھ کر جب تمدنی دور میں داخل ہوا تو بھی اس کی جبلت میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" والا تخیل جاگزیں رہا۔ ذہین وفطین انسان جونہی اپنی دماغی طاقت کو استعمال میں لاتا ہے تو عضلاتی طاقت ہی کی طرز پر دوسرے کو اسی طرح پچھاڑنے کی کوشش کرتا ہے جیسے اس کے آباؤ اجداد جنگل میں ایک دوسرے کو یا مقابل جانوروں کو پچھاڑا کرتے تھے۔ فرق صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کچھ انسان اپنی طاقت کا لوہا تہذیب وشائستگی سے منواتے ہیں جیسے آسمانی

مذاہب کی ابتدا کرنے والوں نے منوایا یا پھر دھونس دھاندلی سے منواتے ہیں جیسے ہمارے ہاں حال ہی میں کچھ فرقوں کے علماء نے اپنی بدزبانی اور ڈنڈا برداری سے ثبوت دیا ہے یا ہماری ایک قومی سیاسی جماعت نے تشدد سے دیا ہے۔ شائستگی اعلیٰ علوم کے حامل اختیار کرتے ہیں اور اپنی سوچ کو آئندہ نسلوں پر چھوڑ جاتے ہیں مگر خود ہمیشہ قربانیاں ہی دیتے دیتے اس جہان سے چلے جاتے ہیں جبکہ تشدد کا راستہ بھی اہل علم ہی اختیار کرتے ہیں مگر وہ اپنی قربانیوں کا صلہ فوری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ جھوٹ اور دھونس انسانی جبلت کی ہی ایک شکل ہے۔

ڈاکٹر سلطان محمود

گوشت کھانے کے طبی مسائل

سوال: سلطان سر جب بھی میں گوشت کو دیکھوں مجھے کھائے بغیر ہی متلی کی کیفیت ہونے لگتی ہے؟ ایسا کیوں ہے؟

محترم یہ مرض نہیں بلکہ باطنی ابکائی اور اکتاہٹ ہے جو non exposure کے باعث رونما ہوتا ہے۔ آپ بآسانی ایٹینیمل سلاٹر کے خلاف تحریک کا حصہ بن سکتے ہیں۔

ذرا تفصیل سے بتائیں۔ میں اسی وجہ سے قربانی سے بھی کنی کترا جاتا ہوں۔ کئی دعوتوں میں خالی کوک پر گذارا کرنا پڑتا ہے۔

لوگ اس کو نفسیاتی مرض سمجھتے ہیں مگر اس کی عموماً دو وجوہات ہوتی ہیں۔ پہلی کا تعلق ہمارے دماغ کے smell center سے ہے۔ جہاں بدبو اور خوشبو انسان اپنے exposure کے مطابق محسوس کرتا ہے مثال کے طور پر قصائی کو ابکائی دور کی بات گوشت اور خون کی بدبو کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ کسی کا oversensitive یا بے حد رحم دل ہونا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ خون دیکھ کر بے ہوش بھی ہو جاتے ہیں۔

اگر آپ میں یہ علامات موجود ہیں تو اس مسئلے کو حل کرنے کی بجائے آپ جانوروں کے ذبیحہ کو روکنے کی عالمی تحریک کا حصہ بن جائیں۔ مذہبی نکتہ نگاہ سے ہٹ کر جانور کو ذبح کرنے سے روکیں گو کہ مذہب میں ذبح کرنے کی اجازت ہے۔

یہاں میں ایک حدیث بیان کر دوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گائے میں دو غذائیں ہیں ایک میں شفا اور دوسری میں وبا ہے۔ دودھ مکمل غذا ہے اور صحت کے لحاظ سے انتہائی کارآمد جبکہ سرخ گوشت پر جتنی بھی سائنسی تحقیق ہوئی ہے سب کی سب بیماریوں کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

جانور کو ذبح کرنے کے خلاف تین سوچیں ہیں۔ ایک ہندووں والی یعنی مکمل ممانعت، دوسری مغربی یعنی ترحم کا پہلو اور تیسری سائنسی ہے جس کو جھٹلانا فی الحال موجودہ مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں۔ چونکہ مسلم سوچ ذبیحہ کے حق میں ہے مگر اس میں اللہ رسول کے احکامات سے زیادہ ہماری زبان پر لگا گوشت کا چسکہ ہے۔ لہٰذا ہم چاہیں تو ذبیحہ کو حلال سمجھنے کے باوجود طبی نکتہ نگاہ سے اسے چھوڑ دیں۔

میری گفتگو کو سائنس کی نظر سے دیکھیئے اور حال ہی میں قادیانی کے قتل پر متوازن سوچ کی بناء پر فتووں سے بچا کر رکھیئے۔

میں کوشش کرونگا کہ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ سے اخذ شدہ سرخ گوشت پر کچھ مضامین کسی جگہ شئیر کر دوں جن میں پچھلے 36 برس سے سرخ اور سفید گوشت پر عالمی سائنسی تحقیقات کی روشنی میں گوشت کی افادیت اور مسائل اجاگر کئے گئے ہیں۔

طالب دعا ڈاکٹر سلطان محمود

قدرتی دولت کا ظالمانہ استعمال

از ڈاکٹر سلطان محمود، مشیر غذائی تحفظ

گلوبل فٹ پرنٹ نیٹ ورک کی تحقیق کے مطابق انسان نے اپنے قدرتی ذرائع یعنی پانی، مٹی اور صاف ہوا کے سن 2017 کے لئے مختص ذخائر کو محض شروع کے ہی چند دنوں میں استعمال کر لیا ہے۔ اس عمل کو اوور شوٹ یا بے دریغ، بے رحم ظالمانہ یا غیر متوازن استعمال کہتے ہیں جو کہ کرہء ارض میں 1970 سے جاری ہے۔ اب باقی سال میں ہم آئندہ نسلوں کے حق پر ڈاکہ ڈالیں گے۔

بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی انسان کے لیے پیدا کردہ کل دولت کو انسان انتہائی بیدردی سے پچھلے 47 برسوں سے استعمال کرتا چلا آرہا ہے اور آئندہ آنے والی نسلوں کی حق تلفی کر رہا ہے۔ اس کی تین وجوھات ہیں۔ اول آبادی میں ضرورت سے زائد اضافہ، دوم طاقتور کا لوٹ کھسوٹ سے امیر بن جانا اور سوم آئندہ آنے والی نسلوں کے حقوق سے بے حسی۔

اگر ہمیں وقت کے فضول استعمال، گندی سیاست، سوشل میڈیا پر دانشوری، علمی غربت وغیرہ سے فرصت مل جائے تو آیئے سوچیں کہ کرنا کیا ہے؟ اور آنے والی نسلوں کو ان کا حق کیسے منتقل کرنا ہے؟

اصلی دانشوروں سے تجاویز مطلوب ہیں۔

بھٹو اور جمہوریت

مونا رضا

مونا معذرت کیساتھ عرض ہے کہ میں نے بھٹو کو پیپلز پارٹی بنانے سے لے کر پھانسی کے تختے پر جھولنے تک دیکھا ہے براہ راست اسی طرح جیسے آپ عمران کو دیکھ رہی ہیں۔ نیز شاہ ولی اللہ سے لے کر سی آئی اے کے ذریعے بھٹو کو کابینہ میں لئے جانے تک کی تاریخ بغور پڑھی ہے۔ اپنوں کی بھی لکھی ہوئی اور ہندووں اور گوروں کی بھی۔

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ بھٹو واقعی عظیم رہنماء ہوتا قائد اعظم کے بعد اگر امریکی پالیسی کی راہ نہ ہموار کرتا۔ اس نے نا صرف اس ملک کی تاریخ بنائی اور فوجی و امریکی معاملات پہچان کرا تنی دور نکل گیا کہ پھر اسے پھانسی دیئے بغیر چارہ ہی نہ تھا۔

ایوب کو فوجی جمہوریت سکھانے والا بھٹو ہی تھا۔ سیاستدانوں پر ایبڈو لگوانے والا بھی بھٹو تھا۔ ایوب کو کشمیر ایڈونچر میں پھنسانے والا بھی بھٹو، ایوب کی ناکامی پر اس کو ڈیڈی کے لقب کو چھیننے والا بھی بھٹو، اسی ڈیڈی کے خلاف تحریک چلانے والا بھی بھٹو، محترمہ فاطمہ جناح کے خلاف ایوب کو سپورٹ کرنے والا بھی بھٹو، یہی "عظیم لیڈر" بھٹو، سیاستدان ہو کر فوجی عہدہ قبول کرنے والا بھی بھٹو، ہزاروں کی کرپشن کو اربوں تک پہنچانے والا بھی بھٹو، اخلاقی قدروں کی پامالی میں پہل کرنے والا بھی بھٹو، ایوب کی بے شمار صنعتی ترقی کے غبارے سے امریکی اشارے پر ہوا نکالنے والا بھی بھٹو، عوام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاہل رکھنے کے لئے تعلیم کو قومیانے والا بھی بھٹو، دس سے زائد اہم سیاستدانوں کو قتل کرانے والا بھی بھٹو۔

خیر بھٹو پر میں 15 سے شاید زائد تحقیقی مضامین چھپوا چکا ہوں اس چیلنج کے ساتھ کہ میرے تاریخی حوالے غلط ثابت کرنے والے اور اس سے نتائج اخذ کرنے میں غلطی پکڑنے والے کو منہ مانگا انعام دونگا۔

اب آئیں اس کی خوبیوں کی جانب۔ جب اسے ہنری کسنجر نے سزا کی دھمکی دی اور اس نے دیکھا کہ فوج اور سی آئی اے کی حمایت میں کچھ آگے ہی نکل گیا ہے اور بے شمار رازوں کا امین بن گیا ہے اور اب بچ بھی نہ پائے گا اور اس کے پاس حکومت میں رہنے کا وقت بہت کم رہ گیا ہے تو اس نے جلد از جلد مندرجہ ذیل اچھے اقدامات کئے مگر قدرت کی طرف سے بھی نقارہ بج چکا تھا اور اسے ہٹا دیا گیا ایک اور سی آئی اے کے ایجنٹ ضیاء الحق کے ذریعے:

- 1972 ہی سے جو اسلامی دنیا کو اکٹھا کر چکا تھا ان میں سے لیبیا سے پیسہ لیکر جلد از جلد ایٹمی پروگرام مکمل کرنے کی کوشش کی مگر ضیاء کو 17 جرنیل ریٹائر کر کے جو چیف آف آرمی سٹاف بن چکا تھا اس نے اسکی اس کوشش کو اندر رکھاتے رکوا دیا۔ مگر بنیادی سارا کام اور انتظام بھٹو ہی نے کیا۔
- متفقہ آئین دے گیا۔
- عوام میں جمہوری شعور جگا گیا۔
- مزدوروں اور ہاریوں کو حقوق کی جنگ لڑنا سکھا گیا۔
- لاکھوں بے روزگاروں کو گلف، یورپ اور امریکہ میں کھپا دیا۔
- شراب پر پابندی۔
- احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینا۔
- باقی آپ کے سوالوں کے جوابوں کے انتظار تک کے لئے۔۔۔ اگر آپ نے چاہا تو؟

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی؟

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن 15 کھرب 67 ارب کی کرپشن کو 270 ارب تک لے آیا ہے

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن کرنٹ اکاؤنٹ خسارہ 85 فیصد کم کر دیا ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن تجارتی خسارہ 37 ارب ڈالر سے کم ہو کر 23 ارب ڈالر رہ گیا ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن 5000 ارب روپے قرض واپس کر چکا ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن بلومبرگ، موڈیز اور ورلڈ بنک معاشی استحکام کی تعریفیں کر رہے ہیں۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن منی لانڈرنگ کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی

لیکن کورونا وائرس کے باوجود برآمدات میں اضافہ ہوا ہے

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی

لیکن ڈیڑھ دھائی کے بعد کسان کی حالت بہتر ہونا شروع ہو چکی ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن کنسٹرکشن انڈسٹری کیلئیے تاریخ کا سب سے بڑا منصوبہ لایا جارہا ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن 60 سال کے بعد بڑے ڈیموں کی تعمیر ہو رہی ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن 60 سال کے بعد نہری نظام کو بہتر کیا جارہا ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن دو کھرب پینتالیس ارب ناداروں / انتہائی غریب طبقے میں بانٹ دیئے ہیں۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن آٹھ کروڑ افراد کو صحت کارڈ کے ذریعے مفت علاج کی سہولت دی ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن لاکھوں نوجوانوں کو سستے قرضے دیئے جارہے ہیں۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن مائیکرو فنانسنگ کو گاؤں گاؤں لے کر جایا جارہا ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن خارجہ حکمت عملی ایسی زبردست کہ کھیل کا پانسہ ہی پلٹ دیا ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن شوگر مافیا عدالت میں جاجا کر چھپ رہا ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن بجلی مافیا کے خلاف بھی انکوائری و تحقیقات جاری ہیں۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن اربوں ڈالر کی بیرونی سرمایہ کاری ملک میں آرہی ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن کورونا وائرس کے باوجود سٹاک ایکسچینج میں تیزی کا رجحان جاری ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن سیاحت پاکستان کی بڑی انڈسٹری بنتی جارہی ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن جنوبی پنجاب کو وہ حق دے دیا جو کوئی اور نہیں دے سکا تھا۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن فاٹا کو وہ حق دے دیا جو کوئی اور نہیں دے سکا تھا۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن اینٹ سے اینٹ بجانے والا بستر مرگ پر پڑا ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن شیروانی کا ٹوٹا بٹن بھی نا دینے والا لندن مفرور ہو چکا ہے۔

عمران خان سے حکومت نہیں سنبھالی جارہی۔

لیکن ہر حکومت کیلئے ناگزیر سیاسی مولانا تنہائی کی زندگی کاٹ رہا ہے۔

میں اس سے چار گنا مزید لکھ سکتا ہوں لیکن یہ حاسدین اور بغض رکھنے والوں کا منہ بند کرنے کیلئے بہت کافی ہو گا۔۔ کبھی غور کیجئے گا جب یہ حکومت پر تنقید کر رہے ہوتے ہیں تو یہ تنقید کی بجائے طنز، تمسخر اور ٹھٹھہ اڑا رہے ہوتے ہیں تا کہ ان کے بغض، عناد اور حسد کو کچھ ٹھنڈ پڑ سکے۔۔ یہ

چاہتے ہوئے بھی تعمیری تنقید نہیں کر سکتے کیونکہ ان کو ایشوز پر بات کرنے کس نہ تو علم ہے اور نا ہی ان میں تجزیہ کرنے کی اہلیت موجود ہے۔

سارا دن ٹی وی پر بیٹھا ایک مخصوص طبقہ زہر اگلتا رہتا ہے کیونکہ انکی عیاشیاں عمران خان نے آ کر بند کروادی ہیں۔۔جب مجیب الرحمان شامی، سلیم صافی اور حامد میر جیسے قلم فروشوں سے کام نہیں بنتا تو کبھی اینکرز کا اور کبھی ناچنے گانے والوں کا سہارا لے کر سوشل میڈیا پر حکومت کے خلاف پول کرواتے ہیں لیکن سوائے شرمندگی کے کچھ اور حاصل نہیں ہوتا۔

عمران خان اللہ پر ایمان رکھنے والا نیک نیت بندہ ہے جس نے اپنے بیوی بچوں کیلئے لندن امریکہ میں جائیدادیں نہیں بنانی۔ یہ چیختے چلاتے رہیں گے، فضول تنقید اور بے بنیاد پراپیگنڈے کا استعمال کرتے رہیں گے۔

کیا آپ کو پتا ہے؟

1۔ آپ کی دونوں بھنوؤں کی درمیانی جگہ کو گلابیلا Glabella کہتے ہیں۔

2۔ بارش کے بعد جو مٹی سے خوشبو اٹھتی ہے اس کو پیچی کور Petrichor کہتے ہیں۔

3۔ آپ کے جوتوں کے تسموں کے آخر پر جو پلاسٹک یا میٹل کی کوٹنگ ہوتی ہے اس کو ایگلٹ Aglet کہتے ہیں۔

4 ۔ آپ کے پیٹ میں کبھی کبھار جو گڑ گڑ کی آواز آتی ہے اس کو ویمبل Wamble کہتے ہیں۔

5۔ نئے پیدا ہونے والے بچے کی آواز یا چیخ کو ویجیٹس Vagitus کہتے ہیں۔

6 ۔ کانٹے یعنی فورک کے تیز نوکیلے سروں کو ٹائینز Tines کہتے ہیں۔

7۔ پیزا کے ڈبے میں چھوٹا سا پلاسٹک ٹیبل ہوتا ہے، وہ باکس ٹینٹ Box tent کہتے ہیں۔

8 ۔ آنے والے پرسوں کو اورمارو Overmorrow کہلاتا ہے۔

9 ۔ آپ کی ہاتھ یا پاؤں کی چھوٹی انگلی کو مینیمس Minimus کہلاتی ہے۔

10۔ صبح سویرے نیند سے بیدار ہونے میں جو مشکل پیش آتی ہے وہ ڈائسینیا Dysania کہتے ہیں۔

11 ۔ آپ کی نتھنوں کی درمیانی جگہ کو لومیلا ناسی Columella nasi کہلاتی ہے۔

12۔ جو لکھائی پڑھی نہ جائے اسے گرِفونج Griffonage کہلاتی ہے۔

13۔ انگریزی حروف آئی i اور جے j کے اوپر جو نقطہ ہوتا ہے اسے ٹِٹل Tittle کہتے ہیں۔

14 ۔ جب آپ بہت زیادہ کھا یا پی لیتے ہیں تو بھاری پن محسوس کرتے ہیں، ایسی صورت حال کو کریپولینس Crapulence کہتے ہیں۔

15 ۔ جوتے کی دکانوں پر آپ کے پاؤں کی پیمائش کے لیے یے جو آلہ استعمال کیا جاتا ہے وہ برینا ک ڈیوائس Brannock Device کہلاتا ہے۔

کچھ دیسی مغالطے

از ڈاکٹر سلطان محمود

کوئی 20 برس قبل "غلط العام" کے نام سے میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ایسی ہی 100 غلط فہمیاں، ان کی وجوہات اور تدارک پیش کیا تھا۔ ان میں سے "غذائی غلط فہمیاں" کے نام سے ماہنامہ "قومی صحت" نے کھانے پینے بارے تمام نکات چن کر تین اقساط میں چھاپ دیئے تھے۔ باقی میری مختلف کتابوں میں موجود ہیں۔

غذائی مغالطے

صحت بارے مغالطے

مذہبی مغالطے

عمومی مغالطے

1۔ بار بار شیو کرنے سے، یا الٹی سیدھی شیو کرنے سے بال موٹے گھنے اگتے ہیں۔

2۔ زکام سردی لگنے سے یا کھٹی چیزیں کھانے سے ہوتا ہے۔

3۔ کٹھا زیادہ کھانے سے نسوانی حسن میں اضافہ ہوتا ہے اور مردانہ کمزوری ہو جاتی ہے۔

4۔ مچھلی کھا کر دودھ پینے سے پھلبہری ہو جاتی ہے۔

5۔ احتلام زیادہ ہونے سے جسمانی اور جنسی صحت خراب ہوتی ہے نیز احتلام عورتوں کو نہیں ہوتا۔

6۔ انسان کے ڈھانچے میں دم کی ہڈی نہیں ہوتی۔

7۔ انسان چاند پر نہیں پہنچ سکتا۔

8۔ عورت کی عقل اور دانت کم ہوتے ہے۔

9۔ اچار ہاضمے کے لئے اچھا ہوتا ہے۔

10۔ دیسی مرغ اور انڈہ ولایتی سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔

11۔ دیسی گھی صحت کے لئے اچھا ہوتا ہے۔

12۔ کرلا یا چھپکلی جس کے دانت دیکھ لے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

13۔ منڈیر پر کوا بولے تو مہمان آتے ہیں۔

14۔ دائیں ہتھیلی پر خارش ہو تو پیسہ ملتا ہے اور بائیں پر ہو تو نکلتا ہے۔

15۔ بدھ کم سدھ اور منگل کو پڑیں سنگل۔ یعنی منگل کو شروع ہونے والے کاموں میں ناکامی ہو جاتی ہے۔

16۔ جو کسی پیر کے ہاتھ پہ بیعت نہ ہو اسے قبر جگہ نہیں دیتی۔

17۔ جس گھر میں سیہہ (چوہے کی طرح کاریگے والا جانور) ہو وہ کرماں والا یعنی خوش قسمت ہوتا ہے۔

18۔ اللہ میاں کی گائے (ایک کالے رنگ کا چھوٹا کیڑا) کو مارنا نہیں چاہئیے۔

19۔ دوائی گر کر ضائع ہو جائے تو شفا مل جاتی ہے۔

20۔ بہو وغیرہ کے گھر داخلے پر دروازے پر تیل ڈالنے سے برکت پڑتی ہے۔

21۔ جہیز میں تالے نہیں دینے چاہئیں۔

22۔ دلہن کو قرآن کے سائے میں رخصت کرنا چاہیئے۔

23۔ گھر میں کتا رکھنا گناہ مگر بلی رکھنا برکت ہے۔

24۔ آم اور چائے اکٹھے نہیں لینے چاہئیں۔

25۔ ڈکار ہاضمے کی علامت ہے۔ (لہٰذا خوب بآواز بلند لینے کے بعد الحمدللہ بھی کہنا چاہیئے)

26۔ کھانے کے دوران پانی نہیں پینا چاہیئے۔

27۔ کالی بلی رستہ کاٹ دے تو کام نہیں ہوتا۔

28۔ رشتہ کرنے سے قبل استخارہ کر لینا چاہیئے۔

29۔ بری نظر لگ جانا برحق ہے۔

30۔ کالے اللہ دے پیارے تے گورے گونہہ دے بورے۔

31۔ اللہ نے غریبوں کے لئے دنیا میں مصیبت اور آخرت میں جنت رکھی ہے۔

32۔ بیمار شخص کے گناہ دنیا ہی میں جھڑ جاتے ہیں۔

33۔ سائیں اور سوالی کو ضرور کچھ دینا چاہئیے۔

34۔ ہر شخص کے خواب سچے ہوتے ہیں لہٰذا جو نظر آئے اس کی تعبیر لینی چاہئیے۔

35۔ انسان کو جن، چڑیل اور چھلیدے نظر بھی آتے ہیں اور تنگ بھی کر سکتے ہیں۔

36۔ شام کے وقت درخت کے نیچے یا قبرستان میں پیشاب کرنے سے جن چمٹ جاتے ہیں۔

37۔ سانس لے کر پانی نہ پینے سے پانی جگر میں چلا جاتا ہے۔

38۔ چوہیا کے بچے کو نہیں مارنا چاہئیے۔

39۔ کالی آندھی قتل یا کسی خوفناک حادثے کی علامت ہے۔

40۔ عورت کو سارے کپڑے اتار کر نہیں نہانا چاہئیے ورنہ جن چمٹ جاتے ہیں۔

41۔ انسان کے جسم کا جو حصہ کمزور ہو اسے بکرے وغیرہ کا وہی حصہ کھا کر صحت ملتی ہے۔

42۔ تین، تیرہ اور تئیس نیز آٹھ، اٹھارہ اور اٹھائیس کو شادی بیاہ نہیں کرنا چاہئیے۔

43۔ اندام نہانی دیکھنے سے انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ یا ہمبستری کے وقت روشنی نہیں کرنی چاہئیے۔

44۔ بیوی کا دودھ پینے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ اور بیوی ماں کا درجہ حاصل کر جاتی ہے۔

45۔ بچے کے ناخن پر کالا پینٹ لگا کر صوفی کو چور کی شکل نظر آجاتی ہے۔

46۔ کتے کو پاخانہ کرتے دیکھ کر اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں زور سے کھینچنے سے اس کا پاخانہ رک جاتا ہے۔

47۔ چاند یا سورج گرہن کو حاملہ عورت دیکھ لے تو حمل گر جاتا ہے یا بچہ معذور پیدا ہوتا ہے۔

48۔ آن لائین استخارہ

49۔ قدرتی آفات میں بے وقت کی اذانیں دینا۔

50۔ جادو، ٹونے ٹوٹکے اور منت کے طور پر بچہ مزار کو دینا، سائیں بنا دینا، گڑیا میں سوئیاں چبھونا، تعویز ڈالنا، خون کا چھڑکاو، دوسرے کے بچے کی جان لینا، ریچھ کا سانس لگوانا، تالاب یا قبرستان میں راتوں کو کھڑے ہو کر چلہ کاٹنا وغیرہ۔

51۔ کھانے کے برتنوں کو چاٹنے سے شادی پر بارش اور آندھی آتی ہے۔

52۔ جھاڑو پر پاؤں پڑ جائے تو اس پر تین بار تھوکنا۔

53۔ گزر گاہ یا دروازے میں بیٹھنے سے کام برا ہونا۔

54۔ خالی قینچی چلانے یا کاغذ کاٹنے سے برکت ختم۔

55۔ چھینکتے وقت آنکھیں کھلی رکھنے سے ڈیلے باہر آجاتے ہیں۔

56۔ دو لوگوں کے درمیان میں لیموں کاٹنے سے ان دونوں کی دشمنی ہو جاتی ہے۔

57۔ جوتا الٹا پڑا ہو تو سمجھو قیامت آئی کہ آئی۔

58۔ اگر کسی کو جھاڑو سے ماریں تو وہ سوکھ کر کانٹا ہو جائے گا۔

59۔ جنہے لہور نئیں تکیا او جمیا ای نئیں۔

60۔ کھانے کے بعد چائے پینے سے روٹی ہضم ہوتی ہے۔

61۔ کھانا ہضم اور پیٹ کی گیس دور کرنے کے لئے سیون اپ میں نمک ڈال کر پینا۔

62۔ انگریزی دوائیاں گرم ہوتی ہیں۔

63۔ ٹنڈ کروانے سے بال گرنے بند ہو جاتے ہیں اور گھنے بھی اگتے ہیں۔

64۔ کنوارے اور کھسرے کا جنازہ جائز نہیں۔

شکریہ اور جان کی امان کچھ مذہبی اعتقادات پر اندیشہ نقص امن کی وجہ سے کچھ نہیں لکھا۔

ملک معراج خالد

مورخہ 18 مارچ 20

اللہ نے دودھ فروش کو نوازا۔۔۔تو اس کی گردن میں سریا آ گیا۔۔۔!

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے ڈائریکٹر ملک معراج خالد تھے۔ وائس چانسلر ہی کہہ لیجیے۔ میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم اے انگریزی کے دوسرے سمسٹر کا طالب علم تھا۔ یونیورسٹی نے فیسوں میں دو سو فیصد اضافہ کر دیا۔ میں نے ملک معراج خالد کے خلاف ایک مقامی روزنامے میں کالم لکھ دیا۔ میں نے لکھا کہ ایک دودھ بیچنے والا ڈائریکٹر بن جاتا ہے تو اس کی گردن میں سریا آ جاتا ہے اور وہ اپنا ماضی بھول جاتا ہے۔ یاد نہیں اور کیا کچھ لکھا لیکن وہ بہت ہی نا معقول تحریر تھی۔

اگلے روز میں کلاس میں پہنچا تو ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ جناب ایس ایم رؤوف صاحب نے مجھے اپنے دفتر میں بلا کر کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ تمہیں ڈائریکٹر صاحب نے طلب کیا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے جب میں ان کے کمرے سے نکل کر جا رہا تھا تو انہوں نے غصے سے کہا: جنٹل مین گو اینڈ فیس دی میوزک۔

خیر میں ڈائریکٹر آفس کی جانب چل پڑا اور راستے میں یہی سوچتا رہا کہ یہ تو طے ہے آج یونیورسٹی میں میرا آخری دن ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آج یونیورسٹی سے نکالا جاؤں گا تو گھر والوں سے کیا بہانہ بناؤں گا کہ کیوں نکالا گیا۔

وہاں پہنچا تو ڈائریکٹر کے پی ایس اسماعیل صاحب کو بتایا میرا نام آصف محمود ہے، مجھے ڈائریکٹر صاحب نے بلایا ہے۔ مجھے شدید حیرت ہوئی جب اسماعیل کے سپاٹ چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور کہنے لگے جایئے وہ آپ کے منتظر ہیں۔ لیکن اندر داخل ہوا تو حیرتوں کے جہان میرے منتظر تھے۔ ملک صاحب اکیلے بیٹھے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا: سر میں آصف، آپ نے بلایا تھا؟

آپ ہی نے کالم لکھا تھا؟

جی سر میں نے لکھا تھا۔

تشریف رکھیے مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔ اور میں جل تو جلال تو کا ورد کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔

کافی دیر یونہی گزر گئی۔

ملک صاحب ولز کی ڈبیا گھماتے رہے۔ ایک ایک لمحہ اعصاب پر بھاری تھا۔ پھر ملک صاحب نے خاموشی کو توڑا اور کہا: کالم تو آپ نے اچھا لکھا لیکن آپ کی معلومات ناقص تھیں۔ میں صرف دودھ فروش نہیں تھا۔ میرے ساتھ ایک اور معاملہ بھی تھا۔ میں نے اسی لیے آپ کو بلایا ہے کہ آپ کی معلومات درست کر دوں۔ میں صرف دودھ نہیں بیچتا تھا۔ میرے ساتھ یہ مسئلہ بھی تھا کہ جوتے نہیں تھے۔ میں دودھ بیچ کر سکول پہنچتا اور سائیکل وہیں کھڑی کر دیتا۔ گھر میں جوتوں کا ایک ہی جوڑا تھا جو والد صاحب کے زیر استعمال تھا۔ اس کا حل میں اور میرے ابا جی نے مل کر نکالا۔ ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ صبح میں یہ جوتے پہن کر جایا کروں اور جب میں واپس آ جاؤں تو یہی جوتے پہن کر ابا جی چوپال میں جا کر بیٹھا کریں۔ اب ڈر تھا کہ سائیکل چلانے سے جوتا ٹوٹ نہ جائے۔ اس

لیے میں انہیں سائیکل کے ساتھ لٹکالیتا تھا۔ جب دودھ گھروں میں پہنچا کر کالج کے گیٹ کے پاس پہنچتا تو جوتا پہن لیتا۔ واپسی پر پھر سائیکل کے ساتھ لٹکالیتا اور ننگے پاؤں سائیکل چلا کر گھر پہنچتا۔

ملک صاحب پھر خاموش ہو گئے۔ یہ دورانیہ خاصا طویل رہا۔ پھر مسکرائے اور کہنے لگے: سریے والی بات تم نے ٹھیک کہی۔ واقعی، اللہ نے دودھ فروش کو نوازا تو اس کی گردن میں سریا آ گیا۔ بار بار دہراتے رہے۔ اللہ نے دودھ فروش کو نوازا لیکن اس کی گردن میں سریا آ گیا۔

پھر اسماعیل کو بلایا اور پوچھا کہ کیا قواعد وضوابط کے مطابق میں فیس میں کیا گیا یہ اضافہ واپس لے سکتا ہوں۔ اسماعیل نے کہا سر ڈائریکٹر کے اختیار میں نہیں ہے۔ کہنے لگے اختیار میں تو نہیں ہے لیکن اگر میں نوٹیفکیشن جاری کر دوں تو پھر؟ اسماعیل کہنے لگے: سر آپ نوٹی فیکیشن جاری کر دیں تو ظاہر ہے اس پر عمل ہو گا۔ ملک صاحب نے کہا جلدی سے نوٹیفکیشن بنالاؤ، فیسوں میں اضافہ نہیں ہو گا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو اس حکم نامے کی کاپی میرے ساتھ تھی، دل البتہ وہیں چھوڑ آیا تھا۔

ڈیپارٹمنٹ پہنچا تو ایس ایم اے رؤوف صاحب نے پوچھا، ہاں کیا ہوا؟ میں نے نوٹی فیکیشن آگے رکھ دیا، سر یہ ہوا۔ رؤوف صاحب کی آنکھوں میں جو حیرت تھی، مجھے آج بھی یاد ہے۔ آج اگر کوئی مجھ سے پوچھے: وائس چانسلر کیسا ہونا چاہیے؟ تو میں کہوں گا اسے ملک معراج خالد مرحوم جیسا ہونا چاہیے۔ آپ ملک کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز رہے جب انتقال ہوا ایک کرایہ کے مکان میں رہتے تھے اللہ تعالیٰ انکو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

کیا مندرجہ ذیل نکات درست ہیں؟

بشکریہ علی ظفر راجپر

کچھ ایسا ہی بیان گلیلیو نے بھی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر جج کو دیا تھا، "میرے ماننے یا نہ ماننے سے کیا زمین ساکن ہو جائے گی؟؟؟ "

آئیں کچھ ایسی مزیدار تحقیقات کو دیکھتے ہیں جو سچ ہیں، چاہیں ہم مانیں یا نہ مانیں۔۔۔

1۔ بار بار شیو کرنے سے، یا الٹی سیدھی شیو کرنے سے بال موٹے گھنے یا خراب نہیں ہوتے۔

2۔ زکام سردی لگنے سے یا کھٹی چیزیں کھانے سے نہیں ہوتا۔

3۔ کھانے پینے کی اشیاء ٹھنڈی، گرم، نہیں ہوتی۔

4۔ کھٹا زیادہ کھانے سے نسوانی حسن میں اضافے ہوتا ہے نہ مردانہ کمزوری۔

5۔ احتلام مرد عورت دونوں کو ہوتا ہے۔ اسکا بہت زیادہ مثلاً ایک رات میں کئی بار ہونا، یا ہر رات ہونا، یا ہفتے میں دو تین بار، یا مہینے میں دو تین بار ہونا، یا سال میں کبھی کبھار ہونا، یا سالوں بعد ہونا، یا تمام عمر نہ ہونا، سب کچھ نارمل ہے۔ اس کا انسان کی ذہنی، جسمانی یا جنسی صحت سے کچھ لینا دینا نہیں۔

6۔ ایک صحت مند مرد ایک دفعہ میں اتنے سپرمز خارج کرتا ہے کہ آدھی دنیا کی خواتین حاملہ ہو سکتی ہیں۔

7۔ انسان کے ڈھانچے میں دم کی ہڈیاں موجود ہوتی ہے۔

8۔ مادر شکم میں 280 دن، ہر انسان اربوں سالوں میں ہوئے اپنے ارتقاء کو دہراتا ہے۔

9۔ زمین، جس پر آپ کھڑے ہیں، یہ کسی موٹروے پر تیز چلتی گاڑی کی رفتار سے بھی تقریباً 500 گنا تیزی سے سورج کے گرد بھاگے جا رہی ہے۔

10۔ زمین پر کھینچی ہوئی کوئی بھی سیدھی لائن اصل میں کروی ہوتی۔ یعنی گول ہوتی ہے۔

11۔ وہ اشیاء جو ایسٹرونوٹس (جو لوگ چاند پر گئے) نے چاند پر پھینک دی تھیں جیسے جوتے، کیمرا یا کوئی گاڑی وغیرہ انہیں طاقتور دوربینوں کی مدد سے دیکھا جا سکتا ہے۔

فوج نہیں تھی اور پاکستان بن گیا

فوج تھی اور قبائل نے لڑ کر کشمیر کو آزاد کرا لیا۔

فوج تھی اور ملک ٹوٹ گیا(1971)۔

فوج تھی اور کارگل بھارت لے گیا۔

فوج تھی اور سیاچن بھی بھارت لے گیا۔

فوج تھی اور مودی نے مقبوضہ کشمیر کو بھارت میں ضم کر لیا اور جرنیل یہاں سینٹ چیئرمین کے الیکشن کا انتظام کرتے رہے۔

فوج تھی اور امریکی فوجی گھس کے اسامہ بن لادن کو مار کر اٹھا لے گیا اور یہ سوتے رہ گئے۔

فوج تھی اور ریمنڈ ڈیوس امریکا بھجوا دیا گیا جس نے پاکستانی عوام قتل کئے تھے۔

فوج تھی اور کرنل جوزف نکل گیا۔

فوج تھی اور عافیہ صدیقی کو امریکا بیچا گیا۔

فوج تھی اور دہشتگری میں ایک لاکھ سے زیادہ عوام شہید ہوئے۔

فوج تھی اور راؤ انور نے 444 پختونوں کو جعلی پولیس مقابلے میں مار دیا۔

فوج تھی اور پرویز مشرف نے 4000 ہزار پاکستانیوں کو باہر کی دنیا کو بیچ دیا۔

فوج تھی اور APS سکول پر ان کی سخت سیکورٹی تھی مگر 150 بچے ان کی موجودگی میں مارے گئے۔

اور امریکہ بین الاقوامی حدود کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے قبائل پر ڈرون سے میزائل برساتا رہا۔

فوج نے ڈالروں کے عوض غیرت مند قبائل کو دربدر کر کے ان کے گھروں اور مارکیٹوں کو ملیامیٹ کر دیا۔

فوج نے دہشتگرد بنائے اور ان کی ملک دشمن پالیسیوں کی وجہ سے پاکستانی معیشت کو ناقابل تلافی نقصان ہوا لیکن جرنیل اربوں پتی ہو گئے اور تاحال ڈونلڈ ٹرمپ امریکہ کی طرف سے صرف گزشتہ دھائی میں دی گئی 33 ارب ڈالر زیا قریباً ساٹھ کھرب روپے کی فوجی امداد کا حساب مانگ رہا ہے۔

فوج کی دہشت گرد نواز پالیسیوں کی وجہ سے سارے ہمسایہ ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات خراب ہیں۔

فوج اور ان کے ماتحت اداروں کی وجہ سے بلوچستان اور کے پی اور فاٹا کے ہر گھر کو لاشیں ملیں یا ان کے گھر کا کوئی بندہ لاپتہ ہے۔

فوج کی مداخلت کی وجہ سے ملک کی عدلیہ، پارلیمنٹ اور دوسرے ادارے صرف نام کے رہ گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اب اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ فوج نہ رہی تو پاکستان بھی نہیں رہے گا تو اس کی چھترول زیتون کے تیل میں چھترول زیتون کے تیل میں لتر بھگو کر کیجیئے تا کہ شریف سے بوٹ پالشی کا کیڑا باہر آ جائے۔

نوٹ: اس وقت ملک کے وزیر اعظم کی تنخواہ 2 لاکھ

اور اس کے اسسٹنٹ عاصم باجوہ کی تنخواہ 45 لاکھ

جبکہ عاصم باجوہ کے مشیر کی تنخواہ 15 لاکھ ہے۔

جرنیلوں کو نوازنے کے لیے نئے نئے عہدے تخلیق کئے جا رہے ہیں۔ آپ نے آج تک ڈی جی ریلوے کا عہدہ نہیں دیکھا ہو گا لیکن آج وہ بھی بنا دیا گیا اور ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر کو تعینات بھی کر دیا گیا یقیناً اسکی تنخواہ شیخ رشید سے زیادہ ہو گی۔ آج تقریباً ہر بڑی اور اتھارٹی والی سول تحریر پر کوئی فوجی افسر براجمان ہے۔ یہ جرنیل سارا بجٹ ہڑپ کر کے آڈٹ کروانا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ کیوں؟

لیکن یہاں 70 سال سے قوم کو جھوٹ یہ پڑھایا گیا کہ سیاستدان ملک کھا گئے۔ مرحومہ عاصمہ جہانگیر نے درست کہا تھا کہ جس دن جرنیلوں کی کرپشن بے نقاب ہو گئی یہ بے اختیار سیاستدان بیچارے آپ کو فرشتے لگیں گے ویسے کوئی ان جرنیلوں سے پوچھے بھلا یہ تمغے کشمیر آزاد کرانے کے ہیں یا پاکستان کو فتح کرنے کے؟

منقول

اس کا آپکو پتہ تو ہو گا پھر بھی یاداشت تازہ کرنے کے لیے۔۔۔۔

پڑھتا جا شرماتا جا۔۔۔۔

1955ء میں کوٹری بیراج کی تکمیل کے بعد گورنر جنرل غلام محمد نے آبپاشی سکیم شروع کی۔4لاکھ مقامی افراد میں تقسیم کی بجائے یہ افراد زمین کے حقدار پائے:

1۔جنرل ایوب خان۔۔500ایکڑ

2۔کرنل ضیااللہ۔۔500ایکڑ

3۔کرنل نورالٰہی۔۔500ایکڑ

4۔کرنل اختر حفیظ۔۔500ایکڑ

5۔کیپٹن فیروز خان۔۔243ایکڑ

6۔میجر عامر۔۔243ایکڑ

7۔میجر ایوب احمد۔۔500ایکڑ

8۔صبح صادق۔۔400ایکڑ

صبح صادق چیف سیکرٹری بھی رہے۔

1962ء میں دریائے سندھ پر کشمور کے قریب گدو بیراج کی تعمیر مکمل ہوئی۔

اس سے سیراب ہونے والی زمینیں جن کا ریٹ اسوقت 5000-10000 روپے ایکڑ تھا۔عسکری حکام نے صرف 500 روپے ایکڑ کے حساب سے خریدا۔گدو بیراج کی زمین اس طرح بٹی:

1۔جنرل ایوب خان۔۔247ایکڑ

2۔جنرل موسی خان۔۔250ایکڑ

3۔جنرل امراؤخان۔۔246ایکڑ

4۔بریگیڈئر سید انور۔۔246ایکڑ

دیگر کئی افسران کو بھی نوازا گیا۔

ایوب خان کے عہد میں ہی مختلف شخصیات کو مختلف بیراجوں پر زمین الاٹ کی گئی۔انکی تفصیل یوں ہے:

1۔ملک خدا بخش بچہ

وزیر زراعت۔158ایکڑ

2۔خان غلام سرور خان،

وزیر مال۔240ایکڑ

3۔جنرل حبیب اللہ

وزیر داخلہ۔240ایکڑ

4۔این-ایم-عقیلی

وزیر خزانہ۔249ایکڑ

5۔ بیگم عقیلی۔251ایکڑ

6۔اختر حسین

گورنر مغربی پاکستان۔150ایکڑ

7ایم-ایم-احمد

مشیر اقتصادیات۔150ایکڑ

8۔سید حسن

ڈپٹی چیرمین پلاننگ۔150ایکڑ

9۔نوراللہ ریلوے انجینئر۔۔150ایکڑ

10۔این-اے-قریشی

چیرمین ریلوے بورڈ۔150ایکڑ

11۔امیر محمد خان

سیکرٹری صحت۔238ایکڑ

12۔ایس-ایم-شریف

سیکرٹری تعلیم۔239ایکڑ

جن جنرلوں کو زمین الاٹ ہوئی۔ انکی تفصیل یوں ہے:

1۔ جنرل کے-ایم-شیخ۔۔150 ایکڑ

2۔ میجر جنرل اکبر خان۔۔240 ایکڑ

3۔ برگیڈیر ایف-آر-کلو۔۔240 ایکڑ

4۔ جنرل گل حسن خان۔۔150 ایکڑ

گوہر ایوب کے سسر جنرل حبیب اللہ کو ہر بیراج پر وسیع قطعہ اراضی الاٹ ہوا۔

جنرل حبیب اللہ گندھارا کرپشن سکینڈل کے اہم کردار تھے۔

جنرل ایوب نے جن ججز کو زمین الاٹ کی:

1۔ جسٹس ایس-اے-رحمان 150 ایکڑ

2۔ جسٹس انعام اللہ خان۔۔240 ایکڑ

3۔ جسٹس محمد داؤد۔۔240 ایکڑ

4۔ جسٹس فیض اللہ خان۔۔240 ایکڑ

5۔ جسٹس محمد منیر۔۔150 ایکڑ

جسٹس منیر کو اٹھارہ ہزاری بیراج پر بھی زمین الاٹ کی گئی۔ اسکے علاوہ ان پر نوازشات رہیں۔

ایوب خان نے جن پولیس افسران میں زمینیں تقسیم کیں:

1۔ ملک عطا محمد خان ڈی-آئی-جی 150 ایکڑ

2۔ نجف خان ڈی-آئی-جی۔۔240 ایکڑ

3۔ اللہ نواز ترین۔۔240 ایکڑ

نجف خان لیاقت علی قتل کیس کے کردار تھے۔ قاتل سید اکبر کو گولی انہوں نے ماری تھی۔

اللہ نواز فاطمہ جناح قتل کیس کی تفتیش کرتے رہے۔

1982 میں حکومت پاکستان نے کیٹل فارمنگ سکیم شروع کی۔ اسکا مقصد چھوٹے کاشتکاروں کو بھیڑ بکریاں پالنے کیلئے زمین الاٹ کرنی تھی۔ مگر اس سکیم میں گورنر سندھ جنرل صادق عباسی نے سندھ کے جنگلات کی قیمتی زمین 240 روپے ایکڑ کے حساب سے مفت بانٹی۔

اس عرصے میں فوج نے کوٹری، سیھون، ٹھٹھہ، مکلی میں 25 لاکھ ایکڑ زمین خریدی۔

1993 میں حکومت نے بہاولپور میں 33866 ایکڑ زمین فوج کے حوالے کی۔

جون 2015 میں حکومت سندھ نے جنگلات کی 9600 ایکڑ قیمتی زمین فوج کے حوالے کی۔ 24 جون 2009 کو ریونیو بورڈ پنجاب کی رپورٹ کے مطابق 62 فیصد لیز کی زمین صرف 56 اعلیٰ عسکری افسران میں بانٹی گئی۔ جبکہ انکا حصہ صرف 10 فیصد تھا۔ شاید یہ خبر کہیں شائع نہیں ہوئی۔

2003 میں تحصیل صادق آباد کے علاقے نواز آباد کی 2500 ایکڑ زمین فوج کے حوالے کی گئی۔ یہ زمین مقامی مالکان کی مرضی کے بغیر دی گئی۔ جس پر سپریم کورٹ میں مقدمہ بھی ہوا۔

اسی طرح پاک نیوی نے کیماڑی ٹاؤن میں واقع مبارک گاؤں کی زمین پر ٹریننگ کیمپ کے نام پر حاصل کی۔ اس کا کیس چلتا رہا۔ اب یہ نیول کینٹ کا حصہ ہے۔

2003 میں اوکاڑہ فارم کیس شروع ہوا۔

اوکاڑہ فارم کی 16627 ایکڑ زمین حکومت پنجاب کی ملکیت تھی۔ یہ لیز کی جگہ تھی۔ 1947 میں لیز ختم ہوئی۔ حکومت پنجاب نے اسے کاشتکاروں میں زرعی مقاصد سے تقسیم کیا۔ 2003 میں اس پر فوج نے اپنا حق ظاہر کیا۔

اس وقت کے ڈی۔ جی آئی ایس پی آر شوکت سلطان کے بقول فوج اپنی ضروریات کیلئے جگہ لے سکتی ہے۔

2003 میں سینیٹ میں رپورٹ پیش کی گئی۔ جسکے مطابق فوج ملک 27 ہاؤسنگ سکیمز چلا رہی ہے۔

اسی عرصے میں 16 ایکڑ کے 130 پلاٹ افسران میں تقسیم کئے گئے۔

فوج کے پاس موجود زمین کی تفصیل:

لاہور۔ 12 ہزار ایکڑ

کراچی۔ 12 ہزار ایکڑ

اٹک۔ 3000 ایکڑ

ٹیکسلا۔2500ایکڑ

پشاور۔4000ایکڑ

کوئٹہ۔2500ایکڑ

اسکی قیمت300بلین روپے ہے۔

2009میں قومی اسمبلی میں یہ انکشاف ہوا۔

بہاولپور میں سرحدی علاقے کی زمین380روپے ایکڑ کے حساب سے جنرلز میں تقسیم کی گئی۔جنرل سے لیکر کرنل صاحبان تک کل100افسران تھے۔

چند نام یہ ہیں:

پرویز مشرف،جنرل زبیر،جنرل ارشاد حسین،جنرل ضرار،جنرل زوالفقار علی،جنرل سلیم حیدر،جنرل خالد مقبول،ایڈمرل منصورالحق۔

مختلف اعداد و شمار کے مطابق فوج کے پاس ایک کروڑ بیس لاکھ ایکڑ زمین ہے۔جو ملک کے کل رقبے کا12فیصد ہے۔

ستر لاکھ ایکڑ کی قیمت700ارب روپے ہے۔

ایک لاکھ ایکڑ کمرشل مقاصد کیلئے استعمال ہو رہی ہے۔جس کو کئی ادارے جن میں فوجی فاؤنڈیشن،بحریہ فاؤنڈیشن،آرمی ویلفیئر ٹرسٹ استعمال کر رہے ہیں۔

نیز بے نظیر بھٹو نے بیک جنبشِ قلم جنرل وحید کاکڑ کو انعام کے طور پر 100 مربع زمین الاٹ کی تھی۔

اس کے علاوہ بریگیڈیئر و جرنیل سمیت سبھی آرمی آفیسرز ریٹائرمنٹ کے قریب کچھ زمینیں اور پلاٹ اپنا حق سمجھ کر الاٹ کرا لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ماضی قریب میں ریٹائر ہونے والے جنرل راحیل شریف نے آرمی چیف بننے کے بعد لاہور کینٹ میں 868 کنال کا نہایت قیمتی قطعہ زمین الاٹ کرانے کے علاوہ بیدیاں روڈ لاھور پر بارڈر کے ساتھ 90 ایکڑ اراضی اور چند دیگر پلاٹ بھی (شاید کشمیر آزاد کرانے کے صلہ میں یا پھر دھرنے کرانے کے عوض) الاٹ کروائے جن کی مالیت اربوں میں بنتی ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں عام آدمی چند مرلے کے پلاٹ کے لئے ساری زندگی ترستا رہتا ہے کیا یہ نوازشات و مراعات یا قانونی اور حلال کرپشن ہے یا اس جرنیلی مافیا کی بے پناہ لالچ و حرص و ہوس؟ کیا عوام کو اس کے خلاف آواز اٹھا کر اس حلال کرپشن کو روکنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے؟

از ڈاکٹر سلطان محمود

لاہور، 22 اکتوبر کو 20

مرتد کو دیا گیا جواب

SOME REVERTED PERSON HAS IMPOSED CONDITION TO REJOIN ISLAM IF QURAN IS PROVED A GOD'S REVELATION.

ایک مرتد شخص نے شرط لگائی ہے کہ اگر قرآن خدا کی وحی ثابت ہو تو دوبارہ اسلام میں شامل ہو جائے۔

MY RESPONSE

I advise you not to revert to Islam because it's not the religion to be adopted by shaky and immature persons. There are already so many muslims in the world that if all like you leave it there will be very fine impact on the strength of this or any other religion. Strength comes by joining strong people so weaker believers are always dangerous for every religion. Even I believe that people like you can never be honest to any religion because they are paid

and hailed by the enemies so why you waste your energy to justify any religion fake?

Second thing to note is that religions never need the followers, this is the man who needs pschological refuge in some faith. If you are psychologically fit and well strong without any belief then why to die for a discussion on religion and non-religion. Your discussion on religion means by itself that either you are psychologically very weak and utterly wants to find a safe corner to hide all those acts defined as sins by the religions OR you are planted by someone through a fake identity to defame Islam.

میرا جواب

میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اسلام کی طرف واپس نہ جائیں کیونکہ یہ وہ مذہب نہیں ہے جسے متزلزل اور نادان لوگ اپنالیں۔ دنیا میں پہلے ہی اتنے مسلمان ہیں کہ اگر آپ جیسے سب اسے چھوڑ دیں تو اس یا کسی اور مذہب کی طاقت پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ طاقت مضبوط لوگوں میں شامل ہونے سے آتی ہے اس لیے کمزور مومن ہر مذہب کے لیے ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ آپ جیسے لوگ کبھی بھی کسی مذہب کے ساتھ ایماندار نہیں ہو سکتے کیونکہ انہیں دشمنوں کی طرف سے قیمت اور پذیرائی ملتی ہے تو آپ کسی بھی مذہب کو جعلی ثابت کرنے کے لیے اپنی توانائی کیوں ضائع کرتے ہیں؟

دوسری بات قابل غور ہے کہ مذاہب کو کبھی پیروکاروں کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ وہ آدمی ہے جسے کسی نہ کسی عقیدے میں نفسیاتی پناہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ بغیر کسی عقیدے کے نفسیاتی طور پر تندرست اور مضبوط ہیں تو پھر مذہب اور غیر مذہب پر بحث کے لیے مرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مذہب کے بارے میں آپ کی گفتگو کا مطلب خود یہ ہے کہ یا تو آپ نفسیاتی طور پر بہت کمزور ہیں اور ان تمام اعمال کو چھپانے کے لیے مکمل طور پر کوئی محفوظ گوشہ تلاش کرنا چاہتے ہیں جن کو مذاہب نے گناہ قرار دیا ہے یا پھر آپ کو کسی نے جعلی شناخت کے ذریعے اسلام کو بدنام کرنے کے لیے پلانٹ کیا ہے۔

Smog: an environmental pollutant

With thanks from Leena Maqbool.

Share with Friends to Aware them about smog as an environmental pollutants:

Smog= Fog + Smoke (SOx, NOx,Dust, Chemical vapours, etc)

Smoggy conditions can cause eye irritation,Coughing and throat or chest irritation or shortness of breath and severe breathing issues..

SMOG Advisory:

1- Limit your outdoor activities and Avoid being outside around high-traffic areas/hours and during rush hour to reduce exposure to smog (try to stay indoor).

2- If you are outside, take lots of rest breaks in the shade and drink plenty of fluids.

3- Avoid outside work or exercise until the heavy smog is over.

4- Use full Sleeves Cloths to avoid allergies.

5- Use Glasses to avoid Eye Irritation. (Sprinkle fresh water into eyes).

6- Use Mask to to avoid inhalation of particles. (Dust mask can't help it completely)

What you can do to reduce SMOG?

You can help reduce smog by not idling your car, taking public transit, instead of using your car. It's also important to use less electricity in the home and at work.

Who are more affected by SMOG?

Those who are more vulnerable to the negative health effects of smog include people engaged in heavy labour or exercise, children, seniors and those with heart disease or lung conditions such as asthma, emphysema or chronic bronchitis.

If you feel wheezing, coughing and shortness of breath, you may need medical advice. Check with neighbours and family members

who are older or have respiratory conditions, to make sure they're coping.

About Smog Phenomena:

These sources may b Local or Transboundry. When Fog is absorbed or adsorbed in Particulate Matters (Smoke), then these particles become heavy and do not disperse with the heat / sun rise and the City remains enveloped for days & even weeks.

The term "smog" describes a mixture of emissions under specific climate conditions. These emissions include:

industrial pollutants

car and other vehicle pollutants

open burning

This smog (Wet Dust) may carry Chemicals or Pathogens (Virus, Bacteria) causing aerosol & Eye diseases.

The size of Particles of this Suspension is 1 to 5 microns. It does not settle down. The dust with particle size more than 10 microns settles down (Fugitive Dust).

Example London Smog 1952 can be searched on Google.

اسموگ: ایک ماحولیاتی آلودگی

بشکریہ لینا مقبول۔

دوستوں کے ساتھ شیئر کریں تاکہ انہیں اسموگ کے بارے میں آگاہ کیا جاسکے جو کہ ایک ماحولیاتی آلودگی ہے۔

اسموگ=(دھند + دھواں ,SOx, NOx) گرد و غبار، کیمیائی بخارات وغیرہ

اسموگی حالات آنکھوں میں جلن، کھانسی اور گلے یا سینے میں جلن یا سانس کی تکلیف اور شدید سانس لینے کے مسائل پیدا کر سکتے ہیں۔

اسموگ ایڈوائزری :

1- اپنی بیرونی سرگرمیاں محدود کریں اور زیادہ ٹریفک والے علاقوں / گھنٹوں اور رش کے وقت باہر جانے سے گریز کریں تاکہ اسموگ کے اثرات سے بچا جاسکے (گھر کے اندر رہنے کی کوشش کریں)۔

2- اگر آپ باہر ہیں تو سایہ دار جگہوں پر زیادہ سے زیادہ آرام کریں اور کثرت سے پانی پئیں۔

3- جب تک شدید اسموگ ختم نہ ہو، باہر کام کرنے یا ورزش کرنے سے گریز کریں۔

4- الرجی سے بچنے کے لیے مکمل آستین والے کپڑے پہنیں۔

5- آنکھوں میں جلن سے بچنے کے لیے چشمہ پہنیں (آنکھوں میں تازہ پانی کا چھڑکاؤ کریں)۔

6-ذرات کے سانس میں جانے سے بچنے کے لیے ماسک کا استعمال کریں (ڈسٹ ماسک مکمل طور پر مدد گار نہیں ہو سکتا)۔

آپ اسموگ کو کم کرنے کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟

آپ اسموگ کو کم کرنے میں مدد کر سکتے ہیں جیسے کہ گاڑی کو غیر ضروری اسٹارٹ نہ چھوڑیں، گاڑی کے بجائے پبلک ٹرانسپورٹ کا استعمال کریں۔ گھر اور کام کی جگہ پر بجلی کم استعمال کرنا بھی ضروری ہے۔

کن لوگوں کو اسموگ زیادہ متاثر کرتا ہے؟

اسموگ کے مضر صحت اثرات کا زیادہ شکار ہونے والے افراد میں بھاری محنت یا ورزش کرنے والے، بچے، بزرگ اور دل کے مریض یا پھیپھڑوں کے مسائل جیسے دمہ، ایمفیسیما یا دائمی برونکائٹس کے مریض شامل ہیں۔

اگر آپ کو سانس لینے میں دشواری، کھانسی یا سانس لینے میں رکاوٹ محسوس ہو رہی ہو تو طبی مشورہ کی ضرورت ہو سکتی ہے۔

اپنے پڑوسیوں اور خاندان کے افراد کی خیریت معلوم کریں، خاص طور پر وہ جو بڑے ہیں یا جنہیں سانس کی تکلیف ہو تا کہ وہ سنبھال سکیں

اسموگ کے بارے میں:

یہ ذرائع مقامی یا سرحد پار سے ہو سکتے ہیں۔ جب دھند جذب یا جمع ہو کر ذرّاتی مادوں (دھواں) میں مل جاتی ہے تو یہ ذرّات بھاری ہو جاتے ہیں اور گرمی یا سورج کی روشنی سے منتشر نہیں ہوتے اور شہر دنوں یا ہفتوں تک اسموگ میں لپٹا رہتا ہے۔

اصطلاح "اسموگ" مخصوص موسمی حالات میں اخراج کے مرکب کو بیان کرتی ہے۔ ان اخراجات میں شامل ہیں :

- صنعتی آلودگی

- گاڑیوں اور دیگر ٹرانسپورٹ کی آلودگی

- کھلی جگہوں پر جلانے کا دھواں

یہ اسموگ (گیلی گرد) کیمیکلز یا جراثیم (وائرس، بیکٹیریا) لے جا سکتی ہے جو ایروسول اور آنکھوں کی بیماریوں کا سبب بن سکتے ہیں۔

اس معطلی کے ذرات کا سائز 1 سے 5 مائکرون ہوتا ہے۔ یہ نیچے نہیں بیٹھتا۔ 10 مائکرون سے بڑے ذرات والی گرد بیٹھ جاتی ہے (بھاری گرد)۔

مثال کے طور پر، لندن اسموگ 1952 کو گوگل پر تلاش کیا جا سکتا ہے۔

مقابلہ خیرات

کالم میٹھا سچ 000 از ڈاکٹر سلطان محمود

31 اگست 2022ء

سر حیرت ہے کہ بعض عمرانی میں بعض لوگ ذلت کے کسی گہرے گھڑے میں گر کر اب "مقابلہ خیرات" کرنے پر اتر آئے ہیں۔ یعنی دشمن کا سرخ منہ دیکھ کر اپنا چنڈ مار کر لال کر رہے ہیں۔ اب نسلی بھکاری یہ ثابت کر رہے ہیں کہ خان نے دو گھنٹے میں سوا پانچ ارب کی بھیک اکٹھی کی ہے تو کیا ہوا ہمارے بلاول نے محض ایک گھنٹے میں ڈیڑھ کھرب روپے اکٹھے کر لئے ہیں۔ یعنی ہر صورت میں اپنا بابا اوپر رکھنا چاہتے ہیں چاہے بات بے عزتی اور بے شرمی ہی کی کیوں نہ ہو۔ ویسے اگر قرضوں، خیرات وزکوۃ اور سمگلنگ کی رقم پر ہی اترانا ہے تو اس سے حاصل شدہ ساری بھیک جوڑ کر خیرات و صدقات کو "قومی صنعت" کا درجہ دے دینا چاہئے اور پھر خوامخواہ بیکار میں تعلیم، کاروبار اور برآمدات وغیرہ پر جان ہلکان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

برج قوس کا ضدی مشیر

کالم میٹھا سچ 000۔ از ڈاکٹر سلطان محمود

۔برج قوس کا ضدی مشیر"

کالم میٹھا سچ 000 از ڈاکٹر سلطان محمود

9 جنوری 2023ء

یا

"بے چین بوٹی"

کالم میٹھا سچ 000 از ڈاکٹر سلطان محمود

27 اگست 2022ء

برج قوس کے بارے میں کیا یہ محض بڑ ہی ہانکی گئی ہے کہ اس سے تعلق رکھنے والے لوگ بہت

۔۔۔۔۔۔

نائیجیریا سے میرے دوست آدامو نے اپنے ملک کا وزیر زراعت بننے پر اپنی خوشیوں میں ہمیں بھی یاد رکھا اور کہا کہ اگر آپ تیس برس قبل میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ نہ لکھتے تو نہ مجھے ڈگری ملتی اور نہ آج کی وزارت۔

نینانامہ

کالم میٹھا سچ 000 از ڈاکٹر سلطان محمود

27 اگست 2022ء

ہماری اک قاریہ کچھ سوالات میں الجھ کر ہماری جانب مندرجہ ذیل الجھنیں لے کر پلٹتی ہے:

1۔ عرفان کسے کہتے ہیں؟ اور اگر کسی انسان کو عرفان مل جاتا ہے تو وہ گوشہ نشین کیوں ہو جاتا ہے جبکہ ترک دنیا کیلیے تو انسان کو پیدا نہیں کیا گیا؟ کیا عورت کو عرفان مل سکتا ہے؟

2۔۔ اگر اللہ کسی کو اپنی عبادت کی طرف بلانا چاہتا ہے تو کیوں؟ جبکہ وہ کہتا ہے کہ عبادت کیلیے مجھے فرشتوں کی کمی نہیں؟

3۔ گندے خون کے لوتھڑے کی پیدائش کیوں کہا گیا ہے انسان کو؟ انسان کو کھنکتی مٹی اور ناپاک پانی کی پیدائش کیوں کہا گیا ہے؟

4۔ عورت کو کم درجہ کیوں دیا گیا ہے مرد سے؟ اور پھر اللہ عورتوں سے دوزخ بھی بھرے گا۔

5۔ کہتے ہیں دنیا میں کوئی بھی انسان بے مقصد نہیں آیا جو لوگ غربت کی لکیر سے بھی نیچے زندگی گزار رہے ہیں انکی پیدائش کا کیا مقصد ہے؟

6۔ دنیا میں بھی چند مٹھی بھر لوگوں کی حکمرانی ہے اور آخرت میں بھی کم ہی لوگ پسندیدہ ہونگے, تو باقی انسان کس لیے پیدا ہوئے دوزخ بھرنے کے لئے؟

7۔ بہت الجھن ہے بہت کشمکش ہے ڈاکٹر صاحب

اب شروع ہو گیا ہمارا فلسفہ اور ہم نے عالم آن لائن بننے کی اداکاری کرتے ہوئے لکھا کہ محترمہ ہم اپنی سمجھ کے مطابق سب سوالوں کا مشترکہ جواب دینے کی سعی کرتے ہیں، جس سے ہمیں یقین ہے کہ وہ ادھ موئی ہو چکی ہو گی:

- عرفان دماغ کا روحانی بلندی پر پہنچنے کو کہتے ہیں۔ جو گوشہ نشین ہو جائے تو اس کا مطلب ہے کہ اسے عرفان حاصل ہی نہیں ہوا بلکہ وہ اس کی تلاش میں ہے اور گوشہ نشین ہو کر وہ محض عرفان کی تلاش میں ہے۔
- اللہ کو تو عبادت کرانے کی حاجت ہی نہیں۔ وہ الصمد ہے۔ ہمیں اس لئے اپنی جانب بلاتا ہے کہ ہم اپنے اندر یعنی روح میں اسے بسا کر دوسرے انسانوں سے ایسے پیش آئیں کہ جیسا اس کی مرضی ہے۔
- اللہ کے فرمان کے مطابق پہلی مخلوق نور سے بنی پھر اس میں سے ایک کو نافرمانی پر آگ کی طرہ دے دی گئی۔ پھر اس کے خمیر سے جنات کو آگ سے بنایا۔ ایک مکمل خیر اور دوسرا مکمل شر۔ پھر نے اللہ دونوں کے مابین انسان کو مٹی سے بنا کر خیر و شر والی دونوں خصوصیات دے کر دماغ عطا کر دیا تا کہ وہ اچھے برے کی تمیز کر سکے۔

ڈاکٹر سلطان محمود: کھنکتی مٹی سے مراد نمایاں قسم کی پاک مٹی ہے جو انسان کی اچھائیوں کی جانب اشارہ ہے جبکہ ناپاک پانی کا اشارہ اس کے سفلی جذبات کی جانب ہے۔ یعنی وہ اچھے کام کر کے جنت لیکن برے کر کے دوزخ میں جائے گا۔ اور اللہ نے اسی لئے انسان کو پسند کیا کیونکہ وہ خدا سے انکار کی طاقت رکھ کر پھر ثابت نہ کر پائے گا اور آخر کار شکست کھا کر اپنے رب کی رحمتوں کا طالب ہو جائے گا۔

عورت کو کمزور کہا گیا ہے کمتر نہیں۔ چونکہ وہ مرد کی ٹیڑھی پسلی کی پیداوار ہے اسلئے دنیا میں خرابات پیدا کر کے جہنم کو بھرے گی۔ اور جاتے جاتے بہکاوے میں آنے والے مرد کو بھی ساتھ لے جائے گی۔

تقویٰ میں مرد عورت کو برابری کا درجہ حاصل ہے یعنی عورت بھی مرد کی طرح عرفان پا سکتی ہے لیکن تعداد میں نظر اندازی کی حد تک کم۔ کیونکہ اس کا کام ہی مرد کو بہکاوے میں مبتلا کرنا ہے بھلے سے رشتہ کوئی بھی ہو۔ چونکہ وسوسے میں عورت مرد سے کافی آگے ہے اس لئے عرفان بھی کم حاصل کر پاتی ہے۔

یہ مقصدیت والی اصطلاح ہماری گھڑی ہوئی ہے۔ اصل مقصدیت انسان کی پیدائش کے پیچھے ہے باری باری ہر آدمی کی پیدائش کے پیچھے نہیں۔ بیشمار انسان بے مقصد ہی پیدا ہو کر مر جاتے ہیں کیونکہ ان کی جدوجہد اصل توقع کے مطابق ایک مچھر کے برابر ہوتی ہے۔

درحقیقت مقصدیت کا کہنا انسان کا حوصلہ بڑھانے کی نفسیاتی کوشش ہے ورنہ مایوسی کے باعث لوگ خودکشی کرنے لگ جائیں۔

بقول مغربی فلاسفرز غریب پیدا ہونا بری بات نہیں لیکن غریب مر جانا بہت بڑی حماقت ہے۔ مشرقی معیشت دانوں کے نزدیک غربت ایک جرم ہے لہٰذا جو غریب اپنے حالات نہ بدل سکے اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ کیونکہ وہ اپنی غربت کے خلاف جدوجہد نہیں کرتا۔

اسی غربت میں ایک اور نکتہ پنہاں ہے یعنی شرح پیدائش کا وسائل انسانی سے بڑھ کر ہونا یا اپنے وسائل کو چھین کر حاصل کرنے کی جرأت نہ رکھنا۔

دنیا کے امیر ممالک کی طرح ایک عام سا امیر خاندان بھی دو سے زائد بچے پیدا نہیں کرتا جبکہ غریب سیکس کو واحد مفت کی عیاشی سمجھ کر اوسطاً سات بچے فی خاندان پیدا کرتا ہے لہٰذا کبھی بھی غربت کے شیطانی چکر سے باہر نہیں نکلتا۔

سوچو اگر تمہارے یا میرے والدین نے صرف دو بڑے بچے ہی پیدا کئے ہوتے تو آج تم اور میں اس دنیا میں نہ ہوتے کیونکہ تم شاید چوتھی اولاد ہو اور میں تیسری۔ اس طرح دنیا سے شکایتی لب کتنے کم ہو چکے ہوتے۔

اور جس سن میں ہم کالے اور سانولے پیدا ہوئے اسوقت بھی گورے اور پیلے کا ایک ہی بچہ ہوا کرتا تھا۔ اس طرح یہ غلطی ہمارے والدین سے ان کی عدم تعلیم کے باعث سرزد ہوئی اور آج ہم دونوں تڑپ رہے ہیں۔

میرے ہاں بھی جب بغیر پلاننگ کے دوسرا اور تیسرا بچہ آیا تو میں نے فوراً نس بندی کرالی ورنہ میرے بھی سات آٹھ بچے ہوتے۔

اگر ہمارے بڑوں نے بھی ہر دوسرے بچے کے بعد نس بندی کرالی ہوتی تو نا صرف ان کی جنسی لذت بھی برقرار رہتی بلکہ اس وقت پاکستان کی آبادی محض دو کروڑ ہوتی اور ہماری مائیں فضول بچے جن جن کر ادھ موئی ہو کر نہ مرتیں اور انجیلا جولی کی طرح دوڑتی پھرتیں۔ ذرا تصور کرو کہ پاکستان تب کتنا امیر اور وسائل یافتہ ہوتا۔

آج چین کی ترقی ان کی آبادی میں کمی سے منسلک ہے اور ہمارے تنزلی آبادی میں بے محابہ زیادتی سے منسلک ہے۔ واحد بھارت ہے جس نے اپنی آبادی کو اپنا معاشی ہتھیار بنالیا ہے۔

غربت کی لکیر سے نیچے والی آبادی بہت جلد مہنگائی، قدرتی آفات اور ملکی دولت سے حصہ نہ ملنے کے باعث مٹ جائے گی کیونکہ دولت کے ذرائع پر ان کا قبضہ ہے جنہیں معلوم ہے کہ فالتو لوگ کیسے مارنے ہیں۔

جی بالکل۔ ان کے لئے دنیا بھی جہنم اور آخرت بھی جہنم۔

برا نہ منانا میں نے فالتو بچہ ہونے کے باوجود دنیا کو شکست دے دی ہے۔ شاید اس لئے کہ میں مرد پیدا ہوا تھا۔ عورت کارآمد بھی ہو تو پھر بھی پیدائشی شکست خوردہ ہوتی ہے اور اگر خدانخواستہ ہو ہی بلاضرورت تو خود سوچو بیچاری کا کیا حال ہو گا

یہ تو ہوئے مذہبی و دنیاوی عقائد والے جوابات۔ اب سنو اصل حقیقت والے جوابات۔

تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ دنیا کے تمام مذاہب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ اگر الہامی عقائد کو تھوڑی دیر کے لئے بالائے طاق رکھ کر سوچا جائے تو انسان کی آنکھ بند ہوتے ہی تمام جہان تمام شد۔

ہم چونکہ مرنا نہیں چاہتے اس لئے ہم نے اگلے جہان پر تکیہ کر رکھا ہے۔ اور اپنی کمی بیشی کے حصول کی خاطر خواب گھڑ رکھے ہیں کہ ہم جنت میں وہ سب کچھ پالیں گے جو یہاں حاصل نہیں کر پائے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟ اور اگر کسی اللہ سے ملاقات نہ ہو پائی تو؟

لیکن تم ایسا نہ سوچنا کیونکہ اللہ کا تصور ہی ہماری زندگی کا بھروسہ ہے۔ وہ بھی جاتا رہا تو پھر ہم سب جلد ہی خودکشی کر لیں گے۔

نیناہاشمی: میری جوانی ختم ہو گئی ہے، میرے سوال کا جواب نہیں دیا آپ نے؟

جوانی جسم چھونے سے نہیں آتی، محبت بھری نظر پڑنے سے آتی ہے، میرے اندر جذبات جاگ جائیں اگر کوئی مجھے تحفظ دے۔

ڈاکٹر سلطان محمود؛ نکاح والے تحفظ کے علاوہ میری خدمات حاضر ہیں۔

نیناہاشمی: نکاح کے علاوَہ کونسا تحفظ ہوتا ہے؟

سلطان محمود: ہوتا تو ہے لیکن تمہیں شاید علم نہیں۔

نیناہاشمی: تو میرے علم میں اضافہ فرمایئے۔

سلطان محمود: دبئی کے قانون سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے بغیر نکاح کے اکٹھے رہنے والا۔

نیناہاشمی: کیا قانون ہے انکا؟

ڈاکٹر سلطان محمود: بتایا تو ہے کہ دو دوست رہتے رہیں اکٹھے نکاح کریں یا نہ کریں۔ نہ سٹیٹ پوچھے گی اور نہ کسی کو ذاتی سطح پر پوچھنے کا اختیار ہے۔

نیناہاشمی: صحیح، اور اپنے ضمیر کا کیا؟

ڈاکٹر سلطان محمود: ضمیر تو ہمارا ان تعلیمات کی بنیاد پر بنا ہوا ہے جو ان پڑھ والدین، نیم پختہ استاد اور جاہل ملاں نے مل کر پوری قوم کا بنا دیا ہوا ہے۔ کسے یقین ہے کہ اس نے مذہب اور رواجات سے جو کچھ سیکھا وہ درست بھی ہے کہ نہیں۔ اتھارٹی کون سی ہے؟

نیناہاشمی: یعنی آپ نکاح کی اہمیت کو رد کرتے ہیں؟ کبھی آپ بڑے پکے ٹھکے مذہبی بن جاتے ہیں کبھی اس طرح کی باتیں۔

ڈاکٹر سلطان محمود: میں کبھی بھی مذہبی نہیں رہا اور نہ بننے کی امید ہے۔ کوئی ایسی مثال دے سکتی ہو جب میں نے مذہب پناد کھایا ہو؟

نیناہاشمی: کافی بار جذباتی بھی ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر سلطان محمود: کیا میں مذہبی طور پہ جذباتی ہوا؟

نیناہاشمی: میں ملحد ہو رہی تھی تو آپ کے اندر کا مولوی جاگا اور مجھے سخت ڈانٹ دیا تھا۔ اس کے بعد میں گریز کرنے لگی مذہبی سوالات سے

ڈاکٹر سلطان محمود: اس کا مطلب ہے کہ تمہیں الحاد یعنی کفر یعنی atheism اور سیکولرازم یعنی مذہبی میانہ روی کے درمیان فرق بھی بتانا پڑے گا؟

اللہ سے انکار الحاد ہے اور ہر مذہب کو احترام سے ماننا اور آزادی سے عمل کرتے رہنے کا حق دینا سیکولرازم ہے۔ ویسے پہلے بھی متعدد مرتبہ بتا چکا ہوں لیکن کسی کی بات پر توجہ نہ دینا اور ذہن میں نہ رکھنا تمہاری عادت ہے۔

ڈاکٹر سلطان محمود: اس موضوع پہ کبھی بات نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر سلطان محمود: مجھے تو پہلے سے یقین ہے تمہاری یادداشت کمزور ہے۔ اسی موضوع پر تمہارے ساتھ ہونے والی بحث تو اب میری کتاب کا حصہ بھی بن چکی ہے۔ کہو تو کھنگال لاؤں۔ محفوظ ہے میرے کمپیوٹر میں۔

نیناہاشمی: ایک اور سوال مردوں کو عورت کے جھوٹ بھی نہیں پسند اور سچ بولتی عورت بھی نہیں پسند، ماتحت بھی نہیں پسند خود مختار بھی نہیں پسند، پھر کیا پسند ہے؟

ڈاکٹر سلطان محمود: صرف ان کا جسم۔ مجھے تو خیر اپنا آپ بھی پسند نہیں اگر اللہ اختیار دے دے تو درجنوں تبدیلیاں کر گزروں۔

نیناہاشمی: اپنا آپ پسند نہیں؟ کیا تبدیلیاں کریں گے؟

ڈاکٹر سلطان محمود: مثلاً پہلے شکل وصورت میں جاذبیت بھروں گا، پھر سراپے میں درویشی، لہجے میں نرمی، کلام میں مزید منطق، آواز میں متانت، غصے اور طیش پر قابو، تمسخر سے بچاؤ اور ایسی ہی بیشمار تبدیلیاں لاؤں گا کہ تم بھی میرے ساتھ بغیر نکاح کے رہنے پر راضی ہو جاؤ۔

نیناہاشمی: بغیر نکاح کے تو مجھے میرا اپنا ہی ساتھ بہتر ہے۔ میرا فیملی بیک گراؤنڈ مضبوط ہوتا تو پھر آپ میرے لیے ایسا سوچتے بھی نہیں۔ آپ نے سمجھ لیا ہے کہ لاوارث ہے مجبور ہے جیسے چاہو من مانی کرو۔

باقی شکل وصورت اور دیگر تبدیلیاں آپ ابھی بھی کر سکتے ہیں۔ سراپے میں درویشی، لہجے میں نرمی، کلام میں منطق آواز میں متانت غصے پہ قابو، یہ سب سوچ اور اخلاق میں تبدیلی سے ممکن ہے

ڈاکٹر سلطان محمود: پھر ادھوری اور منفی سوچ یہی میں نے کنیز کو بھی کہا جب نہیں مانی تو پینڈو سمجھنے لگ گیا ہوں۔ ثناء اور دوسروں کو بھی یہی کہا لیکن ہمارا کلچر ہی ایسا ہے کہ کوئی مانے گی بھی نہیں۔ اس لئے دبئی اور مغرب کا سیکولر معاشرہ مجھے پسند ہے۔ ابھی حال ہی میں دو بچوں کی سنگل ماں دبئی بسنا چاہ رہی ہے۔ میری تعریفیں تو بہت کرتی ہے دیکھو اس سوال کے جواب میں کیا کہتی ہے۔

نینا ہاشمی: دو بچوں کی ماں رہ لے گی، یا تو آپ نکاح کی اہمیت کو رد کر دیں یا پھر اس دین کا رد کر دیں۔ اگر نکاح کرنا پینڈو پن ہے تو بہت معذرت کیسا تھ، اپنے بچوں کی شادیاں کیوں کروائی ہیں آپ نے۔

ڈاکٹر سلطان محمود: پاکستان میں رہ کر میں بھی پینڈو پنا د کھائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اس لئے۔ اگر ڈاکٹریٹ کے بعد مغرب میں رہ گیا ہوتا تو پرواہ بھی نہ کرتا۔

ڈاکٹر سلطان محمود: کون سا دین؟ دین اسلام؟ یہ تو پاکستان کے کسی بندے کی ذات میں بھی موجود نہیں۔ اجتماع تو ویسے ہی ہندو ہے۔

نمازیں پڑھ کے اور روزے رکھ کر اپنے آپ کو دیندار سمجھ لینا پرلے درجے کی حماقت ہے۔

دین اسلام دو حصوں پر مشتمل ہے عبادات اور معاملات۔ اس ملک میں تو کیا پوری دنیا کے مسلمان ان دونوں حصوں میں چور ہیں۔ ہم سب صرف کلمہ گو مسلمان ہیں ورنہ عبادات میں ہم میں اور یہود و نصاریٰ میں کوئی فرق نہیں۔ رہ گئے معاملات تو اس میں ہم مسلمان دنیا کے تمام ادیان سے بہت پیچھے ہیں۔ یقین کرو عیسائی، یہودی، بدھ اور ہندو معاملات میں ہماری نسبت بے حد آگے ہیں۔

نینا ہاشمی: آپ مغرب ہو آئے ہیں مگر ہم فی الحال اسی معاشرے کا حصہ ہیں، کلمہ گو ہی سہی مگر ہیں تو سہی۔ شادی بچے فیملی یہ معاملات میں ہی شمار ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر سلطان محمود: وہ تو میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ ہم معاملات میں بھی مغرب، ہندو اور بدھوں سے بھی بہت پیچھے ہیں۔

نینا ہاشمی: دیکھیں میں نے آخرت والا جنت دوزخ کا تکیہ بالکل بھی نہیں کیا ہوا۔

ڈاکٹر سلطان محمود: پھر لڑائی جھگڑے کے بعد آخر میں تم نے پھر یہی کہہ دینا ہے۔

نینا ہاشمی: یوں تو بہت سارے سوالات ہیں میرے پاس بھی مذہب اللہ اور قرآن کے حوالے سے، مگر اس لیے نہیں کرتی کہ سامنے والا مولوی فوری جاگ جاتا ہے۔

ڈاکٹر سلطان محمود: تو پھر منافقت سے کام نہ لو تو چلو چلتے ہیں دبئی۔

نینا ہاشمی: منافقت نہیں کرتی میں، مگر اس چیز کے لیے دل مانتا تو بھرپور جوانی میں بے راہ روی کا شکار ہو جاتی۔

ڈاکٹر سلطان محمود: اتم اس ضرورت کو بے راہ روی کے نام سے پکار رہی ہو اس کا مطلب ہے کہ تم کبھی بھی معاشرے کے خوف اور دوزخ کے ڈر سے باہر نہیں نکل سکتی۔ اور دل تو تمہارا اپنا ہے میں تو اسے منا نہیں سکتا۔

نینا ہاشمی: میں نے کہیں بھی دوزخ اور معاشرے کا ذکر نہیں کیا، ہاں میرا دل نہیں مانتا۔ سیلف ریسپیکٹ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سلطان محمود: کیوں اپنے آپ کو بھی دھوکہ دیتی رہتی ہو یہ ڈر ہی تو ہیں۔

نینا ہاشمی: کیا آپ دبئی میں پینٹ کندھے پہ رکھ کے گھوم لیں گے بنا چڈی کے۔

ڈاکٹر سلطان محمود: ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ لہٰذا اسی کو پالتی رہو ہمیشہ۔ ایسا وہاں کے قانون میں اجازت نہیں۔ ورنہ سپین کے برہنہ ساحل پر گھومتا رہا ہوں تریسا کاستر و مدریگال کے ساتھ۔

نینا ہاشمی: چلو دبئی میں کال بوائے بن جائیں عیش ہی عیش۔

ڈاکٹر سلطان محمود: ہر اس مشورے کا شکریہ جس کو میں نے مانگا نہ ہو۔

4۔ہارون پاشا کے لئے

"منافق اعظم ضیاء الحق"

ضیاء الحق کس طرح جناب اس قوم کے محسن ٹھہرے؟

1. کیا آئین توڑ کر ملک میں آمریت نافذ کرنا احسان ہے؟

2۔ کیا امریکن ایجنڈے کو ایک ایجنٹ کی طرح کسی اور ملک کی فوج کے ذریعے پورا کرنا احسان ہے؟

3۔

چلیں اب اگلی سیلابی تباہی کا انتظار کریں

6۔"غیر سنجیدہ جامعات"

آج مورخہ 30 اپریل 23ء

گورے کا قانونی طریقے سے اربوں روپے لوٹ لے جانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں کیونکہ اسی کے ہرکارے نواز، شہباز، زرداری وغیرہ اس سے دسیوں گنا زیادہ پیسہ انہی کے ممالک میں غیر قانونی طریقے سے ہر سال جمع کراتے ہیں جہاں ان سے کبھی یہ سوال نہیں کیا گیا کہ منی ٹریل دیں۔ دہرے ظلم کے طور پر FATF بھی صرف ہمارے جیسے ممالک کے لئے ہے۔ مگر ایک انتہائی اہم نکتے کی جانب شاید ہی کسی کا دھیان گیا ہو۔

اور وہ ہے ہمارے بچوں کا ہمارے پاس رہتے ہوئے اغوا ہو جانا۔ صاحبان دانش تو سمجھ گئے ہونگے لیکن ذرا وضاحت بھی کر دیتا ہوں۔ گورا ہمارے جذبہ جہاد اور اتحاد سے ڈرتا ہے۔ وہ او اور اے لیول کے لاکھوں بچوں کو اس مقصد کے لئے بھی استعمال کرتا ہے کہ وہ کبھی جان ہی نہ پائیں کہ جہاد یا اتحاد کس چڑیا کا نام ہے۔ وہ ہمارے بچوں کو اس عیاشی کا دلدادہ بناتا ہے جس کے شک پر ہی پچھلی نسلوں کے ہمارے بزرگ اپنے ہی بچوں کی جان لے لیا کرتے تھے۔

تھوڑے لکھے کو زیادہ سمجھیں اور اس نکتے پر بھی کبھی غور کریں کہ مغرب پچھلے چالیس برسوں سے اپنے ہاں لے گئے بچوں میں سے ستر فیصد لڑکیوں کو لے جاتا ہے۔ کیونکہ ایک باپ اتنی نسلوں کی تربیت نہیں کر سکتا جتنی ماں کر سکتی ہے۔

اگر سیاسی تعصب کی عینک سے نہ دیکھا جائے تو ہمارے اس موقر گروپ کا کوئی رکن ہمیں بتائے گا کہ بھٹو نے صنعت قومیا کر جو اس قوم پر ظلم ڈھایا وہ تو ڈھایا ہی لیکن ساتھ ہی تعلیم کو کیوں قومیایا۔

ہم آج نصف صدی کے بعد دیکھیں تو، صنعت تو گئی بھاڑ میں، تعلیم میں بھی ہم گراونڈ زیرو پر کیوں ہیں؟ اور اگر ہم تعلیم میں دنیا بھر میں بھٹو جیسے لوگوں کی وجہ سے پیچھے نہ رہے ہوتے تو کم از کم یہ تحریر شئیر کر کے کمنٹس نہ مانگے جاتے۔

ڈاکٹر سلطان محمود

یونیورسٹی کوئی سنجیدہ اور جینیین کام کر رہی ہو تو ایسی احمقانہ نوٹیفکیشنز کی جانب دھیان ہی نہیں جاتا۔ لاہور کی کسی بھی یونیورسٹی میں داخل ہو کر دیکھیں تو لان، برآمدے، سیڑھیوں، کیفے حتیٰ کہ خالی کلاس رومز میں بھی لڑکیاں لڑکوں کو لفٹ دیتی نظر آتی ہیں کھلے عام۔ بلکہ ان یونیورسٹیوں کے باہر ارد گرد کے تمام ہوٹل، ریستوران، وغیرہ میں یہی کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ معاف کیجئے کہ یوں لگتا ہے کہ جیسے نئی نسل کو شادی سے قبل ہی جنسی تسکین کے ڈھب سکھائے جا رہے ہوں۔ ایسا لگتا ہے والدین نے بچیوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ جاؤ اچھا سا لڑکا ڈھونڈ لو اور گولی مارو پڑھائی کو۔ سب سے زیادہ گندگی ان گرلز ہوسٹلز نے پھیلا رکھی ہے جو اب لاہور کے سبھی علاقوں میں قائم ہو چکے ہیں۔ سہ پہر چار بجے سے گاڑیوں کی لائینیں لگی ہوتی ہیں اور ایک ایک دو لڑکیاں سوار ہو رہی ہوتی ہیں۔ بعض بچیاں تو اس قدر شہوت ابھارنے والے ڈریسز پہنے نکلتی ہیں کہ ارد گرد کی تمام فوڈ شاپس میں مشٹنڈے آنکھیں مٹکاتے لڑکیوں کے جسم پر پلک جھپکے بغیر نظریں پیوست رکھتے ہیں۔ لگتا تو یوں ہے کہ دوسرے شہروں سے آئی بچیوں کے نہ تو باپ ہیں اور نہ بھائی ورنہ اتنی بے حیائی عام نہ ہو پاتی۔ معاف کیجئے کہ میں لڑکیوں ہی کو مکمل طور پر قصوروار سمجھتا ہوں کیونکہ جب تک لڑکی اجازت نہ دے لڑکا قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔ لڑکی محض اچھے موبائل اور اچھی جگہ کھانا کھانے کو اپنی عزت سے زیادہ عزیز سمجھنے لگ گئی ہے۔ استغفر اللہ۔

سیدہ

آخر کی چند سطور سے اتفاق نہیں سر جی، ہم نے ہمیشہ ایسا ہی سُنا ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس،، جیسا ماحول لڑکیوں کو ملے گا لڑکیاں ویسے ہی خود کو بدلیں گی،، معذرت کے ساتھ مگر لاہور کی لڑکیاں کراچی والیوں سے زیادہ بلکہ انتہائی غیر ضروری طور پر بولڈ ہیں. یہ میرا اپنا ذاتی مشاہدہ ہے۔

اب دوسرے شہروں سے آنے والی لڑکیاں پوری یونیورسٹی کے ماحول پر کیسے اثر انداز ہو سکتی ہیں؟؟ یہ بھی تو سوچیے سر جی۔

7۔"نئی ای کیپ"

کالم میٹھا سچ 000 از ڈاکٹر سلطان محمود

5 دسمبر 2022ء

پچھلی کابینہ کی کارکردگی

۔1

8 میری زندگی کے کچھ اہم نمبر

۔میری زندگی کے کچھ اہم نمبر جو مجھے آج بھی یاد ہیں:

732, 546, 24269, 809, 890, 728, 4138, 2586, 31, 33,109, 502, 4647,

9۔"دن کا سونا تجھے برباد کریگا"

کالم میٹھا سچ 000 از ڈاکٹر سلطان محمود

؟؟؟؟؟

10۔"دبئی چلو دبئی چلو"

کالم میٹھا سچ از ڈاکٹر سلطان محمود

تیس لاکھ آبادی والی ریاست دبئی میں مقامی عرب محض بارہ فیصد ہیں اور باقی میں نمایاں بھارت، سری لنکا، نیپال، بنگلہ دیش اور پاکستان ہیں۔

11۔"وی سی سے ڈبلیو سی تک"

کالم میٹھا سچ از ڈاکٹر سلطان محمود

یکم اپریل 2023ء

پیر مہر علی شاہ بارانی یونیورسٹی کو ہم اس لحاظ سے منفرد سمجھتے تھے کہ یہاں اسلام آباد و راولپنڈی کے پر فضا موسموں کی سی معصومیت، چاشنی و دلکشی ہو گی۔ اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس میں سبھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہمارا دل ادھر اتنا کھنچنا شروع ہوا کہ ہم اکثر

12۔غلام بنانے کے دو طریقے

ڈاکٹر مورخہ 30 اپریل

غالباً ابراہام لنکن سے یہ بات مشہور ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں اس نے اپنے تھنک ٹینکس سے پوچھا کہ امریکہ کیسے دنیا پر چھا سکتا ہے؟

انہوں نے بتایا کہ محض دو ہی طریقے ہیں۔ اول نبیوں والا روحانی طاقت کا طریقہ یعنی اخلاقی طاقت سے انسان کے دل و دماغ کو جکڑ لیا جائے جس میں لوگ اپنی مرضی سے غلامی اختیار کر لیتے ہیں اور دوم بدمعاشی والا پر تشدد طریقہ جس میں جسم و روح پر تشدد کر کے انسان کو اس کی مرضی کے خلاف غلام بنایا جا سکے مگر آپ کی طاقت کم ہوتے ہی غلام آزادی کے لئے آپ سے ہی لڑے گا۔

پہلے طریقے میں وقت بہت لگتا ہے لیکن بے حد دیرپا ثابت ہوتا ہے اور دوسرے طریقے سے آپ چٹکیوں میں چھا سکتے ہیں بس آپ کے پاس محض دوسرے کو جسمانی طور پر تباہ کرنے کی صلاحیت ہونی چاہئے۔

پھر گورے نے "جس کی لاٹھی اس کی بھینس "یعنی "might is right" والا محاورہ گھڑا اور اس پر پوری طرح سے عمل کیا۔

13۔ میاں بیوی میں بے رغبتی

1. Why husband and wife get bored from each other after some years?

There could be numerous reasons why husbands and wives can get bored with each other after some years, including:

1. Lack of novelty and excitement: After being together for some time, couples often fall into a routine, which can become monotonous and lead to boredom.

2. Lack of communication and intimacy: If couples stop sharing their thoughts and feelings, they may begin to feel disconnected and, as a result, lose interest in one another.

3. Unrealistic expectations: Some couples may have unrealistic expectations of their partner and the relationship, and when those expectations are not met, it can lead to frustration, dissatisfaction, and boredom.

4. Changes in priorities or personal interests: Over time, people's interests and priorities may shift, and couples may find that they no longer share the same passions or goals.

5. Physical changes and declining health: Physical changes that come with age, such as reduced libido or mobility, can also impact intimacy and passion in the relationship.

Overall, it's essential for couples to continue to nurture their relationship, communicate openly and honestly, and prioritize their connection to avoid the onset of boredom or disinterest.

SHAKO

It is not uncommon for couples to experience a decline in their romantic interest in each other after a period of time. There can be many factors that contribute to this, including changes in daily routines, stress, children, and differences in interests and goals. However, it is important to remember that every couple and relationship is unique, and what may be true for some couples may not be true for others. It is also important to remember that a decline in romantic interest does not necessarily mean the end of a

relationship, and many couples are able to work through these challenges and maintain a happy and fulfilling partnership.

2. Why physical sexual performance and libido don't match?

It is important to note that physical sexual performance and libido can be influenced by various factors such as hormones, stress, lifestyle, and medication. A person may have a high libido but experience physical performance issues, such as erectile dysfunction or premature ejaculation, due to physical or psychological factors. Alternatively, a person may have good physical performance but low libido due to hormonal imbalances or psychological factors such as stress or depression. Ultimately, the factors affecting sexual performance and libido can vary greatly between individuals and should be addressed on a case-by-case basis.

1۔ میاں بیوی کچھ سالوں بعد ایک دوسرے سے بور کیوں ہو جاتے ہیں؟

شوہر اور بیوی کچھ سالوں کے بعد ایک دوسرے سے بور ہونے کی متعدد وجوہات ہو سکتی ہیں، بشمول

1۔ نیاپن اور جوش کا فقدان: کچھ عرصے تک اکٹھے رہنے کے بعد، جوڑے اکثر ایک روٹین میں پڑ جاتے ہیں، جو نیرس ہو جاتا ہے اور بوریت کا باعث بنتا ہے۔

2۔ بات چیت اور قربت کا فقدان: اگر جوڑے اپنے خیالات اور احساسات کا اشتراک کرنا چھوڑ دیں، تو وہ منقطع محسوس کرنے لگتے ہیں اور اس کے نتیجے میں، ایک دوسرے میں دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔

3۔ غیر حقیقی توقعات: کچھ جوڑے اپنے ساتھی اور رشتے سے غیر حقیقی توقعات رکھتے ہیں، اور جب وہ توقعات پوری نہیں ہوتی ہیں، تو یہ مایوسی، عدم اطمینان اور بوریت کا باعث بن سکتی ہے۔

4۔ ترجیحات یا ذاتی مفادات میں تبدیلیاں: وقت گزرنے کے ساتھ، لوگوں کی دلچسپیاں اور ترجیحات بدل سکتی ہیں، اور جوڑوں کو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ اب ایک جیسے جذبوں یا مقاصد میں شریک نہیں ہیں۔

5۔ جسمانی تبدیلیاں اور زوال پذیر صحت: جسمانی تبدیلیاں جو عمر کے ساتھ آتی ہیں، جیسے کام کرنے یا نقل و حرکت میں کمی، تعلقات میں قربت اور جذبے کو بھی متاثر کر سکتی ہے۔

مجموعی طور پر، جوڑوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تعلقات کو پروان چڑھاتے رہیں، کھلے عام اور ایمانداری سے بات چیت کریں، اور بوریت یا عدم دلچسپی کے آغاز سے بچنے کے لیے اپنے تعلق کو ترجیح دیں۔

شاکو:

یہ غیر معمولی بات نہیں ہے کہ جوڑوں کے لیے کچھ عرصے کے بعد ایک دوسرے میں رومانوی دلچسپی میں کمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے عوامل ہو سکتے ہیں جو اس میں حصہ ڈالتے ہیں، بشمول روزمرہ کے معمولات میں تبدیلی، تناؤ، بچے، اور دلچسپیوں اور اہداف میں فرق۔ تاہم، یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہر جوڑا اور رشتہ منفرد ہوتا ہے، اور جو کچھ جوڑوں کے لیے صحیح ہو سکتا ہے وہ دوسروں کے لیے درست نہ ہو۔ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ رومانوی دلچسپی میں کمی کا مطلب لازمی طور پر کسی رشتے کا خاتمہ نہیں ہے، اور بہت سے جوڑے ان چیلنجوں سے نمٹنے اور خوشگوار اور مکمل شراکت داری کو برقرار رکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

2۔ جسمانی جنسی کارکردگی اور لبیڈو کیوں مماثل نہیں ہیں؟

یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ جسمانی جنسی کارکردگی اور لبیڈو مختلف عوامل جیسے ہارمونز، تناؤ، طرز زندگی اور ادویات سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ کسی شخص کو بہت زیادہ لیبیڈو ہو سکتا ہے لیکن جسمانی یا نفسیاتی عوامل کی وجہ سے اسے جسمانی کارکردگی کے مسائل، جیسے عضو تناسل یا قبل از وقت انزال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ متبادل طور پر، ایک شخص کی جسمانی کارکردگی اچھی ہو سکتی ہے لیکن ہارمونل عدم توازن یا نفسیاتی عوامل جیسے تناؤ یا ڈپریشن کی وجہ سے اس کی لبیڈو کم ہو سکتی ہے۔ بالآخر، جنسی کارکردگی اور لبیڈو کو متاثر کرنے والے عوامل افراد کے درمیان بہت زیادہ مختلف ہو سکتے ہیں اور ان پر ہر معاملے کی بنیاد پر توجہ دی جانی چاہیے۔

اکثر لوگوں میں جنسی کارکردگی وقت کے ساتھ زوال پذیر ہو جاتی ہے لیکن جنسی خواہش موجود رہتی ہے۔ اس کی چار وجوہات ہیں۔ ہارمونز کا اتار چڑھاؤ، سٹریس، انداز زندگی اور ادویات کا استعمال۔ ایسے لوگوں میں پہلی نشانی طبعی مسئلے کی شکل میں سامنے آتی ہے مثلاً مردانہ جنسی کج روی

یا زنانہ جوابی محبت میں کمی۔ اس کی وجوہات زیادہ تر نفسیاتی ہوتی ہیں اور ان کے پیدا ہونے کا انحصار محبت میں تسلسل کا ٹوٹنا، غلط غذائیں لینا اور ورزش کا نہ ہونا ہے۔ دوسری نشانی مردوں میں غیر ضروری احتلام اور عورتوں میں لیکوریا کا مرض ہے۔ جو کیلشیم کی شدید کمی سے سامنے آتا ہے۔ یہی نفسیاتی مسائل اگر ذہنی دباؤ کے ساتھ بھی مل جائیں تو اس صورت میں طبعی جنسی کارکردگی تو درست رہتی ہے لیکن جنسی دلچسپی خاصی کم ہو جاتی ہے۔ دونوں معاملات نارمل رکھنے کے لئے اعلیٰ پروٹین سے بھرپور لیکن کم کولیسٹرول والی غذا اور تھکاوٹ کی حد تک ورزش بے حد ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جنسی عمل میں لمبا وقفہ بھی نہیں آنا چاہئے۔

اکثر کامیاب شادی شدہ جوڑے بھی پچیس تیس برس مسلسل ساتھ رہنے کے بعد ایک دوسرے میں بے رغبتی اور بوریت کا شکار ہو جاتے ہیں لہٰذا ان دونوں کی طبیعتوں میں عدم مطابقت عود کر آتی ہے جس کے باعث متلون مزاج جوڑوں کے مزاج میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے اور علیحدگی تک کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ اس کی پانچ وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یعنی جوش ولذت میں کمی، بغیر وقفے کے مسلسل ساتھ، غیر حقیقی توقعات، ترجیحات کا فرق اور گرتی صحت کے باعث جسمانی کارکردگی میں کمی۔ مگر ان سب سے اوپر جو عوامل ہیں ان میں غالب علم جنسیات کی کمی ہے۔

مثال کے طور پر مردانہ جرثومہ شروع سے مرنے تک چوہتر دن لیتا ہے نیز جب تک کم از کم چار کروڑ جرثومے بیک وقت رحم زوجہ میں داخل نہ ہوں حمل نہیں ٹھہرتا۔ لیکن مرد چونکہ مسلسل لاکھوں جرثوموں کو پیدا کرتا چلا جاتا ہے جس کے زیر اثر پراسٹیٹ چکنا مادہ بھی پیدا کرتی ہے اس لئے معیار کو مدنظر رکھا جائے تو ایک اٹھارہ تا پچیس سالہ لڑکے کو مہینے میں بارہ دفعہ سے زیادہ اجماع نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے بعد کی عمر میں وہی جرثومہ بننے میں لیتا تو چوہتر دن ہی ہے لیکن مادہ تولید

کے حجم میں کمی ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے جب مرد ورزش نہیں کرتا نیز دیگر مسائل کے باعث ذہنی تناؤ کا شکار بھی رہنا شروع ہو جاتا ہے۔ چالیس برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اسے ازدواجی وظیفہ چھ سے آٹھ بار ماہانہ تک لے آنا چاہئے بمعہ اچھی خوراک اور ورزش کے لیکن ان عوامل میں سستی اس کی جنسی کارکردگی کو تیزی سے روبہ زوال کر دیتی ہے۔

اب آتے ہیں ان پانچ وجوہات کی جانب۔ اول وجہ پرجوش عیش میں کمی آجاتی ہے جس کے باعث جب جوڑے مسلسل ساتھ رہتے ہیں تو ان کی روٹین میں پہلے جیسا جوش اور ولولہ نہیں رہتا۔ اس کی وجہ جنسی عمل میں حیاتیاتی بناوٹ کی لاعلمی کا دخل ہے جس کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے۔ مثلاً وہ صرف لذت پوری کرنے کے چکر میں صحت کے دیگر مسائل کا حل نہیں سوچتے اور جوڑوں میں بوریت اور اکتاہٹ عود کر آتی ہے۔

دوم بغیر وقفے کے مسلسل ساتھ سے بھی جوڑے بوریت بلکہ جھگڑوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ محاورہ ہے کہ "قدر کھو دیتا ہے روز کا آنا جانا"۔ کامیاب محبت میں پرجوشی قائم رکھنے کا ایک فارمولا تو یہ ہے کہ جوڑے ہفتے میں ایک رات الگ رہیں یا مہینے میں تین دن مسلسل۔ سال میں ایک ماہ اور ہر دس سال میں ایک سال ایک دوسرے سے علیحدہ رہیں۔ لیکن یہ مشکل امر ہر کسی کے لئے مناسب نہیں ہے۔

سوم غیر حقیقی توقعات۔

چہارم ترجیحات کا فرق اور پنجم گرتی صحت کے باعث جسمانی کارکردگی میں کمی۔

14۔"نکھٹو کے کمالات"

کالم میٹھا سچ 000 از ڈاکٹر سلطان محمود

23 اپریل 2023ء

ہم تو بچپن سے سنتے آئے تھے کہ گھر بیٹھے بیٹھے اپنی ملکہ مکھی کو تنگ کرنے والا سست الوجود شہد کی نر مکھی والا نکھٹو ڈرون تو شہد بھی نہیں بناتا۔ مگر صد قے سائنس کی ترقی کے بغیر پائلٹ کا آج کا کمپیوٹرائزڈ ڈرون کیسے کیسے کارنامے سرانجام دے رہا ہے۔ اب شہد کی ملکہ مکھی جو پہلے بھی چھتے میں بیٹھی آرام فرماتی رہتی تھی اور شہد بناتی رہتی تھی اب اس جیسی میٹھی ماداؤں نے دفتروں میں بیٹھ کر روایتی قسم کے نروں کو کام پر لگا دیا ہے۔

Male honeybees, also known as drones, do not have stingers and their main function is to mate with the queen bee. They are born from unfertilized eggs and have a shorter lifespan than worker bees and queen bees.

During the mating season, which typically occurs in the late summer or fall, male honeybees will leave the hive in search of a queen bee. Once they find a queen bee, they will fly around her in a coordinated dance to signal to other male honeybees the location and status of the queen.

Once a male honeybee has successfully mated with a queen bee, he will die. The queen bee, on the other hand, will store the sperm from the male honeybees in her ovaries and use it to fertilize her eggs in the future.

While male honeybees do not have many responsibilities within the hive, they are still important for the survival and reproduction of the colony. Without male honeybees to mate with the queen, the colony would not be able to produce new queen bees or maintain its population.

Female honeybees, also known as workers, are responsible for a variety of tasks within the hive. They collect nectar and pollen from flowers, produce honey, take care of the young, defend the hive, and maintain the hive's structure. Worker bees are all female and are born from fertilized eggs.

During the spring and summer months, when the hive is actively producing honey, worker bees will work together to gather nectar from flowers and bring it back to the hive. They will then transfer

the nectar to other worker bees who will remove the nectar's water content and store it in honeycomb cells.

In the fall and winter months, when there is less available food, worker bees will use the honey they have stored to survive. They will also cluster together to keep warm and conserve energy.

Queen bees and worker bees both play important roles in the hive, but their functions are very different.

The queen bee is the only fertilized egg in the hive and is responsible for producing all of the eggs that will become worker bees. She will lay up to 2,000 eggs per day and can live for several years.

Worker bees are all female and are born from unfertilized eggs. Their primary function is to take care of the hive and the young. They collect nectar and pollen from flowers, produce honey, take care of the young, defend the hive, and maintain the hive's structure.

During the spring and summer months, when the hive is actively producing honey, worker bees will work together to gather nectar from flowers and bring it back to the hive. They will then transfer the nectar to other worker bees who will remove the nectar's water content and store it in honeycomb cells.

In the fall and winter months, when there is less available food, worker bees will use the honey they have stored to survive. They will also cluster together to keep warm and conserve energy.

Overall, the queen bee and worker bees both play important roles in the hive, but their functions are very different. The queen bee is responsible for reproduction, while worker bees take care of the hive and the young.

Overall, honeybees are an essential part of the ecosystem, and their roles within the hive are crucial for the survival and reproduction of the colony.

Honeybees make honey by collecting nectar from flowers. Nectar is a sugary liquid that flowers produce to attract pollinators. The bees suck up the nectar using their long tongues and store it in

their honey stomachs. The bees then return to the hive and pass the nectar to other bees through their mouths until it eventually becomes partially digested. The partially digested nectar is then deposited into honeycomb cells, where it is further processed by the bees. The bees fan their wings to evaporate some of the moisture from the nectar, thickening it into honey. Once the honey reaches a certain consistency, the bees cap the cell with beeswax to seal it. The honey can be stored for long periods of time and used as a food source for the bees during winter or harvested by beekeepers for human consumption.

نر شہد کی مکھیوں، جسے ڈرون بھی کہا جاتا ہے، میں ڈنک نہیں ہوتے اور ان کا بنیادی کام ملکہ مکھی کے ساتھ ملنا ہے۔ وہ غیر زرخیز انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں اور ان کی عمر ورکر مکھیوں اور ملکہ مکھیوں سے کم ہوتی ہے۔

ملن کے موسم کے دوران، جو عام طور پر موسم گرما کے آخر یا موسم خزاں میں ہوتا ہے، نر شہد کی مکھیاں ملکہ مکھی کی تلاش میں چھتے سے نکل جاتی ہیں۔ ایک بار جب انہیں ملکہ کی مکھی مل جاتی ہے، تو وہ دوسرے نر شہد کی مکھیوں کو ملکہ کے مقام اور حیثیت کا اشارہ دینے کے لیے ایک مربوط رقص میں اس کے ارد گرد اڑیں گے۔

ایک بار جب ایک نر شہد کی مکھی ملکہ مکھی کے ساتھ کامیابی کے ساتھ ملاپ کر لیتی ہے تو وہ مر جائے گی۔ دوسری طرف، ملکہ کی مکھی نر شہد کی مکھیوں کے نطفہ کو اپنے بیضہ دانی میں ذخیرہ کرے گی اور مستقبل میں اپنے انڈوں کو فرٹیلائز کرنے کے لیے استعمال کرے گی۔

اگرچہ نر شہد کی مکھیوں پر چھتے کے اندر زیادہ ذمہ داریاں نہیں ہوتی ہیں، لیکن وہ کالونی کی بقا اور تولید کے لیے اب بھی اہم ہیں۔ نر شہد کی مکھیاں ملکہ کے ساتھ مل جانے کے بغیر، کالونی نئی رانی مکھیاں پیدا کرنے یا اپنی آبادی کو برقرار رکھنے کے قابل نہیں ہو گی۔

مادہ شہد کی مکھیاں، جنہیں کارکن بھی کہا جاتا ہے، چھتے کے اندر مختلف کاموں کے لیے ذمہ دار ہوتی ہیں۔ وہ پھولوں سے امرت اور جرگ جمع کرتے ہیں، شہد پیدا کرتے ہیں، بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، چھتے کا دفاع کرتے ہیں، اور چھتے کی ساخت کو برقرار رکھتے ہیں۔ ورکر مکھیاں تمام مادہ ہیں اور فرٹیلائزڈ انڈوں سے پیدا ہوتی ہیں۔

موسم بہار اور گرمیوں کے مہینوں کے دوران، جب چھتہ فعال طور پر شہد پیدا کر رہا ہوتا ہے، کارکن شہد کی مکھیاں مل کر پھولوں سے امرت اکٹھا کر کے چھتے میں واپس لائیں گی۔ اس کے بعد وہ امرت کو دیگر کارکن شہد کی مکھیوں کو منتقل کریں گے جو امرت کے پانی کے مواد کو نکال کر شہد کے چھتے کے خلیوں میں محفوظ کر لیں گی۔

موسم خزاں اور سردیوں کے مہینوں میں، جب خوراک کم دستیاب ہوتی ہے، مزدور مکھیاں زندہ رہنے کے لیے اپنے ذخیرہ کردہ شہد کا استعمال کرتی ہیں۔ وہ گرم رکھنے اور توانائی کے تحفظ کے لیے ایک ساتھ جمع ہوں گے۔

ملکہ کی مکھیاں اور کارکن شہد کی مکھیاں دونوں ہی چھتے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، لیکن ان کے افعال بہت مختلف ہیں۔

ملکہ کی مکھی چھتے میں واحد فرٹیلائزڈ انڈا ہے اور وہ تمام انڈے تیار کرنے کی ذمہ دار ہے جو کارکن مکھی بن جائیں گے۔ وہ روزانہ 2000 انڈے دیتی ہے اور کئی سال تک زندہ رہ سکتی ہے۔

کارکن شہد کی مکھیاں تمام مادہ ہیں اور غیر زرخیز انڈوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا بنیادی کام چھتے اور جوانوں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ وہ پھولوں سے امرت اور جرگ جمع کرتے ہیں، شہد پیدا کرتے ہیں، بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، چھتے کا دفاع کرتے ہیں، اور چھتے کی ساخت کو برقرار رکھتے ہیں۔

موسم بہار اور گرمیوں کے مہینوں کے دوران، جب چھتہ فعال طور پر شہد پیدا کر رہا ہوتا ہے، کارکن شہد کی مکھیاں مل کر پھولوں سے امرت اکٹھا کر کے چھتے میں واپس لائیں گی۔ اس کے بعد وہ امرت کو دیگر کارکن شہد کی مکھیوں کو منتقل کریں گے جو امرت کے پانی کے مواد کو نکال کر شہد کے چھتے کے خلیوں میں محفوظ کر لیں گی۔

موسم خزاں اور سردیوں کے مہینوں میں، جب خوراک کم دستیاب ہوتی ہے، مزدور مکھیاں زندہ رہنے کے لیے اپنے ذخیرہ کردہ شہد کا استعمال کرتی ہیں۔ وہ گرم رکھنے اور توانائی کے تحفظ کے لیے ایک ساتھ جمع ہوں گے۔

مجموعی طور پر، ملکہ کی مکھی اور کارکن شہد کی مکھیاں دونوں ہی چھتے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، لیکن ان کے افعال بہت مختلف ہیں۔ ملکہ کی مکھی پنروتپادن کی ذمہ دار ہے، جبکہ کارکن شہد کی مکھیاں چھتے اور بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔

مجموعی طور پر، شہد کی مکھیاں ماحولیاتی نظام کا ایک لازمی حصہ ہیں، اور چھتے کے اندر ان کے کردار کالونی کی بقا اور تولید کے لیے اہم ہیں۔ شہد کی مکھیاں پھولوں سے امرت اکٹھا کر کے شہد بناتی ہیں۔ امرت ایک میٹھا مائع ہے جو پھول جرگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ شہد کی مکھیاں اپنی لمبی زبانوں کا استعمال کرتے ہوئے امرت کو چوس کر اپنے شہد کے پیٹ میں محفوظ کرتی ہیں۔ شہد کی مکھیاں پھر چھتے میں واپس آتی ہیں اور امرت کو اپنے منہ سے دوسری مکھیوں تک پہنچاتی ہیں جب تک کہ یہ جزوی طور پر ہضم نہ ہو جائے۔ جزوی طور پر ہضم ہونے والے امرت کو پھر شہد کے چھتے کے خلیوں میں جمع کیا جاتا ہے، جہاں شہد کی مکھیاں اس پر مزید کارروائی کرتی ہیں۔ شہد کی مکھیاں امرت سے نمی کو بخارات بنانے کے لیے اپنے پروں سے پنکھا لگاتی ہیں اور اسے شہد میں گاڑھا کرتی ہیں۔ ایک بار جب شہد ایک خاص مستقل مزاجی تک پہنچ جاتا ہے، شہد کی مکھیاں اسے سیل کرنے کے لیے موم کے ساتھ سیل کو ڈھک دیتی ہیں۔ شہد کو لمبے عرصے تک ذخیرہ کیا جا سکتا ہے اور سردیوں میں شہد کی مکھیوں کے کھانے کے ذریعہ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے یا شہد کی مکھیوں کے پالنے والے اسے انسانی استعمال کے لیے کاٹ سکتے ہیں۔

شہد مکھی دراصل مکھیوں کے خاندان کا ذیلی مجموعہ ہیں، جو شہد کی پیداوار اور ذخیرہ کرنے، سالانہ موم کے گھونسلا بنانے کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ یہ "اپینی" قبیلہ کی غیر تباہ شدہ باقی رکن بچی ہیں۔ ان کی سات نوع ہیں اور 44 ذیلی نوع ہیں۔ "شہد مکھی" مکھیوں کی بیس ہزار قسموں میں سے صرف چند ہیں۔

"اپیس" نوع کی شہد مکھی پھولوں پر جاتی ہیں اور پودوں کی وسیع اقسام کی زیر گی کرتی ہیں۔ کچھ اقسام کو تجارتی بنیادوں پر زیر گی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تجارت اربوں ڈالر کی سالانہ مالیت بنتی ہے۔

شہد کی مکھی پھولوں اور پھلوں سے شہد بنانے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ یہ مکھی پھول یا پھل پر بیٹھ کر نیک نیک نینگتی اور نیکھرے چوسکر بناتی ہے۔ نینگتے وقت یہ مثبت الیکٹران برقی شارج کو منتقل کرتی ہے جس سے برقی میدان پیدا ہوتا ہے۔ اس برقی میدان سے ایک الیکٹران پھول یا پھل سے چھتے میں منتقل ہوتا ہے جو پھر مکھی کی بدولت دیگر پھولوں یا پھلوں میں منتقل ہوتا ہے۔ یہ پروسیس مکھی کی اصطلاح "پالن" کہلاتی ہے۔ جبکہ نینگرے کے وقت مکھی کے ٹانگے اس کے سوار مکانے میں فضا میں کھلے ہوتے ہیں جس سے الیکٹران جذب کرنے کے لئے فضائی ہوا صاف ہوتی ہے۔ یک سمتی حرکت۔۔۔۔

جینیاتی طور پر تبدیل شدہ حیاتیات بمقابلہ نامیاتی

کون سا بہتر کھانا ہے، جی ایم او اگایا گیا یا نامیاتی طور پر اگایا گیا؟

GMO vs Organic Debate

Which is better food, GMO grown or organically grown?

The question of whether genetically modified organisms (GMOs) or organically grown foods are better is a complex and debated topic. There are varying opinions and perspectives on this issue, and it ultimately depends on your priorities and how you define "better."

GMOs refer to organisms whose genetic material has been modified through genetic engineering techniques. These modifications are often aimed at improving traits such as pest resistance, crop yield, or nutritional content. Proponents of GMOs argue that they can contribute to increased agricultural productivity, reduced pesticide use, enhanced nutritional value, and improved food security.

On the other hand, organic farming practices emphasize the use of natural fertilizers, biological pest control, and the exclusion of synthetic chemicals. Organic proponents believe that these methods are better for the environment, promote biodiversity, and result in healthier soil and crops. Some people also prefer organic

food due to concerns about potential health risks associated with pesticide residues or the long-term effects of genetic engineering.

It's important to note that the safety of GMOs for human consumption has been extensively studied, and major scientific organizations, such as the World Health Organization and the National Academy of Sciences, have concluded that GMOs currently on the market are safe to eat. However, the long-term effects of consuming GMOs or pesticides are still areas of ongoing research.

Ultimately, the decision between GMO-grown and organically grown food is a personal one, influenced by factors such as personal beliefs, environmental concerns, health considerations, and availability. It's essential to consider the scientific evidence, assess the potential benefits and risks, and make an informed decision based on your own values and priorities.

یہ سوال کہ آیا جینیاتی طور پر تبدیل شدہ حیاتیات (GMOs) یا نامیاتی طور پر اگائی جانے والی غذائیں بہتر ہیں ایک پیچیدہ اور زیر بحث موضوع ہے۔ اس مسئلے پر مختلف آراء اور نقطہ نظر ہیں، اور یہ بالآخر آپ کی ترجیحات پر منحصر ہے اور آپ کس طرح "بہتر" کی وضاحت کرتے ہیں۔

جی ایم اوز ایسے جانداروں کا حوالہ دیتے ہیں جن کے جینیاتی مواد کو جینیاتی انجینئرنگ تکنیک کے ذریعے تبدیل کیا گیا ہے۔ ان ترامیم کا مقصد اکثر خصوصیات جیسے کیڑوں کے خلاف مزاحمت، فصل کی پیداوار، یا غذائی مواد کو بہتر بنانا ہوتا ہے۔ GMOs کے حامیوں کا استدلال ہے کہ وہ زرعی پیداوار میں اضافہ، کیڑے مار ادویات کے استعمال میں کمی، غذائیت کی قیمت میں اضافہ، اور غذائی تحفظ کو بہتر بنانے میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔

دوسری طرف، نامیاتی کاشتکاری کے طریقے قدرتی کھادوں کے استعمال، حیاتیاتی کیڑوں پر قابو پانے، اور مصنوعی کیمیکلز کے اخراج پر زور دیتے ہیں۔ نامیاتی حامیوں کا خیال ہے کہ یہ طریقے ماحول کے لیے بہتر ہیں، حیاتیاتی تنوع کو فروغ دیتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں مٹی اور فصلیں صحت مند ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ کیڑے مار ادویات کی باقیات یا جینیاتی انجینئرنگ کے طویل مدتی اثرات سے منسلک ممکنہ صحت کے خطرات کے بارے میں خدشات کی وجہ سے بھی نامیاتی خوراک کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ انسانی استعمال کے لیے GMOs کی حفاظت کا بڑے پیمانے پر مطالعہ کیا گیا ہے، اور عالمی ادارہ صحت اور نیشنل اکیڈمی آف سائنسز جیسی بڑی سائنسی تنظیموں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس وقت مارکیٹ میں موجود GMOs کھانے کے لیے محفوظ ہیں۔ تاہم، GMOs یا کیڑے مار ادویات کے استعمال کے طویل مدتی اثرات ابھی بھی جاری تحقیق کے شعبے ہیں۔

بالآخر، GMO سے اگائے جانے والے اور نامیاتی طور پر اگائے جانے والے کھانے کے درمیان فیصلہ ذاتی ہے، جو ذاتی عقائد، ماحولیاتی خدشات، صحت کے تحفظات، اور دستیابی جیسے عوامل سے

متاثر ہوتا ہے۔ سائنسی شواہد پر غور کرنا، ممکنہ فوائد اور خطرات کا اندازہ لگانا، اور اپنی اقدار اور ترجیحات کی بنیاد پر باخبر فیصلہ کرنا ضروری ہے۔

اعشاریہ میں الجھے لوگ

19 جون 2023

ڈاکٹر قیوم

قبل از ظہور پاکستان اور بعد از ظہور۔

سوموار، پیر

منگلوار، منگل

بدھوار، بدھ

شریوار، جمعرات

شکروار، جمعہ

سنیچروار، ہفتہ

ایتوار، اتوار

تبدیلی کیسے، کیونکر اور کتنے عرصہ بعد از تقسیم ظہور پذیر ہوئی۔ پتہ نہیں۔

سلطان محمود

یہ یکم جنوری 1961ء کے بعد بتدریج تبدیلی آئی ہے جب ملک میں اعشاری سسٹم لاگو کیا گیا تھا کیونکہ ایوب خان نے بھارت سے متحارب پالیسی اپنالی تھی۔

سیریز ہشتم: طنز و مزاح

ڈاکٹر عبدالقیوم شیخ

اعشاری سسٹم کا دنوں سے کیا واسطہ ؟

سلطان محمود

براہ راست تو کوئی تعلق نہیں لیکن دیسی اور برطانوی نظام کی بجائے بتدریج امریکی نظام میں شمولیت سے یہ تبدیلی آئی کیونکہ نظام تعلیم، نظام زر اور نظام سیاست بھی امریکی نظام کے زیر اثر آتا رہا۔ ہمارے اپنے ملک میں صدارتی نظام بھی ایک مثال بنا۔ روپیہ بھی سولہ آنے سے سو پیسے میں بدلا۔ نظام اوزان تو البتہ مکمل تبدیل کر دیا گیا۔ دفاتر میں برطانوی انگریزی سے امریکی انگریزی کی تبدیلی کا آغاز بھی ہوا۔ ایسے ہی مجھے یاد ہے کہ سن پچھتر یا اسی تک کیلنڈروں اور ڈائریوں میں انگریزی تاریخوں کے ساتھ جو دیسی و اسلامی تاریخیں بھی دی جاتی تھیں وہ رواج بھی جاتا رہا بلکہ اور تو اور لوگوں نے بچوں کے نام رکھنے میں بھی امریکی نقل شروع کر دی۔ مثلاً آسانی کی خاطر نواب یا چیف آف فلاں فلاں کی بجائے یا باپ کے لئے بن وغیرہ کا رواج ختم ہو گیا۔ حتیٰ کہ اسلام کا استعمال جو پہلے ہمارے ناموں میں آدھے مردوں میں عبدل، محمد، احمد، علی یا رمضان کی شکل میں آتا تھا یا دیسی نام بوٹا، اللہ ڈوایا وغیرہ کی شکل میں آتا تھا گھس پٹ کر براہ راست ہم اب عربی، یورپی اور امریکی طرز کے ہو گئے ہوئے ہیں۔ یعنی ایوب، عیسیٰ اور مریم نام اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ التان، زعیم اور مشام ہو گئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

میرا تو خیال تھا کہ آپ جیسے جہاں دیدہ شخص کے لئے اشارہ ہی کافی ہو گا لیکن آپ تو اعشاریہ میں جا الجھے۔

---

595 سیاست کے کا

سر کسی کالم کا نمبر ہے؟595

انگور کھٹے،،یورپ 595۔۔۔یہ کالم الگ۔۔

آپکی یاداشت کیلئے بتا رہی۔انعم

24-25 May 2023

شفق نذیر

جب آپ سیاستدانوں کو مقدس مانتے ہوئے ان کی حمایت اور مخالفت کی بیس پر لوگوں پہ حلالی اور حرامی ہونے کا ٹھپا لگاتے تھے، انہیں درست مانتے تھے یہ تب بھی اِسی طرح ہی غلط تھے جیسے آج ہیں۔۔

جو بھی ہو رہا تھا یا ہو رہا ہے یہ انتہائی غلط ہے، ہم تب بھی یہی کہتے تھے کہ اِنہیں صرف وُہی کرنا چاہیے جس کیلیے یہ ہیں، اب بھی یہی کہیں گے۔

ڈاکٹر

خیر محترمہ میں حلالی حرامی کی حد تک کبھی نہیں جاتا اپنی تعلیم کا اتنا خیال تو رکھتا ہوں کیونکہ یہ نعمت میرے پاس موجود ہے۔ہاں عمران کو ایک ایماندار سیاسی گرو ضرور سمجھتا ہوں کیونکہ میں عمران اور نواز وزرداری کو ان کے سیاسی فلسفوں کے مطابق پسند ناپسند کا فیصلہ کرتا ہوں۔

معاف کیجئے گا میں اب کیا کہوں اپنے ان دوستوں کو جو عمران کا نام آتے ہی کبھی اس کی ٹانگ اور کبھی کارٹون بنا بنا کر اچھالتے ہوئے اس درجے پر جا گرتے ہیں کہ یوں لگنے لگ جاتا ہے جیسے عمران

نے کوئی غیر اخلاقی واردات ان کے گھر والوں پر بھی ڈال رکھی ہو اور وہ اس سے ذاتی بدلے لے رہے ہوں۔ میرا ماننا تو یہ ہوتا ہے کہ ان سیاستدانوں کی پالیسی پر ہی بات کریں اور اسی کی بنیاد پر اچھا برا گردانیں نہ کہ شکلوں پر طنز کریں یا الٹے سیدھے نام رکھیں۔

خیر Eleanor Roosevelt کا یہ قول میں درجنوں بار دہرا چکا ہوں اور ایک بار پھر پیش خدمت ہے کہ:

Great minds discuss ideas. Average minds discuss events. Small minds discuss people.

اور اس میں مزید اضافہ اپنی جانب سے یہ لکھ کر کرتا ہوں کہ:

Lowest minds make caricatures but genius keep in silence.

اب پڑھے لکھے اور ان پڑھ کا ذکر ہو ہی گیا ہے تو میں گالیاں بگاڑ کر تحریک انصاف کے حامیوں کو پکارنے پر بھی اپنا خیال پیش کر دوں چونکہ آپ پڑھی لکھی خاتون ہیں تو شاید برا نہ مانیں اور مقصد کی تہہ تک پہنچ جائیں۔

عموماً پنجابی کی دو گالیوں (۔۔۔وتیا اور ۔۔۔انڈو) کے حروف بدل کر عمران کے حامیوں کو یوتھیا اور عمرانڈو کہا اور لکھا جاتا ہے۔ اس طرح مخالفین کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا پاکستان بھر میں دو ہی گروہ رہ گئے ہیں، ایک یوتھیا اور عمرانڈو والا اور دوسرا اصل گالیوں والا؟

آپ کے شاید علم میں نہ ہو کہ پاکستان کی تمام کی تمام سیاسی، مذہبی و علاقائی پارٹیوں اور تنظیموں کو ہماری اسٹیبلشمنٹ ہی نے بنا رکھا ہے۔ لہٰذا وہی پہلے دن سے دونوں ٹاپ کی مخالف لیڈر شپ کے

نام بھی خود ہی تجویز کر کے پھیلا دیتے ہیں۔ اور ہم تو ٹھہرے جاہلین مطلق۔ آپس میں بھڑ کر یہ بھول ہی جاتے ہیں کہ محض سیاسی لوگوں کو گندا کیا جا رہا ہے تا کہ وہ آپس ہی میں اتنے گندے ہو جائیں کہ کسی کی نظر اسٹیبلشمنٹ تک نہ پہنچے۔

اے کے

ایک رائے یہ بھی ہے کہ جس طرح 2011 کے بعد خان نے اسٹیبلشمنٹ کا فرنٹ فیس بن کر ملک میں سیاسی و جمہوری اقدار و ادارے تباہ کئے اس بناء پر خان اب کسی جمہوری، و انسانی حقوق و ہمدردی کا مستحق نہیں۔

ڈاکٹر

یہ رائے تو سرے سے ہی غلط ہے

اے کے

کیسے غلط ہے؟

ڈاکٹر سلطان محمود

یہ اس طرح کہ 2011ء تا 2018ء خان کی حکومت ہی نہیں تھی تو ادارے کمزور کرنے کا الزام اسٹیبلشمنٹ کی بجائے ایک اپوزیشن لیڈر پر کیسے لگ سکتا ہے۔ دوم، اپنے دور حکومت میں خان کی حکومت کے کسی کارندے نے، سوائے لوٹوں اور اتحادیوں کے، اداروں سے رشوت یا کمیشن طلب نہیں کی لہٰذا اس الزام کے ذریعے بندر کی بلا طبیلے کے سر نہیں رکھی جا سکتی۔ سوم، ادارے تو بھٹو

کے وقت سے دھیرے دھیرے کمزوری اور تباہی کی جانب دھکیلے جا رہے تھے کیونکہ امریکہ نے پاکستان بننے میں مدد اس لئے فراہم نہیں کی تھی کہ یہ ترقی کر کے کل کلاں اسے ہی آنکھیں دکھائے بلکہ یہ ہمیشہ اس کے لئے کرائے کا ملک بنا رہے لہٰذا اسے اسی حال میں رکھنے کے لئے بحیثیت سی آئی اے ایجنٹ بھٹو نے صنعت و تعلیم قومیالی جس کے باعث ہم آج تک ان دونوں شعبوں میں گراؤنڈ زیرو پر ہی کھڑے ہیں۔ چہارم، ادارے حقیقت میں اسٹیبلشمنٹ کی ہدایت پر چلتے ہیں اور وزیر اعظم یا سیاسی سانچے کی ہدایت کو درجہ دوم حاصل ہے، لہٰذا اگر یہ الزام بھی عمران کو دینا ہے تو پھر کوئی وزیر اعظم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ٹھہرے گا۔ پنجم، اگر ادارے تباہ کرنے پر قرار واقعی سزا دی جانے کا رواج پڑا ہوتا تو زرداری، نواز شریف اور مشرف کسی صورت بچ نہیں سکتے تھے اور ششم، اگر ملک کمزور کرنے کے جرم کی سزا انسانی حقوق چھین لینے میں ہے تو یہ شاید مہذب دنیا میں انتہائی احمقانہ خیال تصور ہو گا۔

اے کے صدر

دوئم: اپنے دور حکومت میں خان نے آزادی اظہار رائے کو سلب کیا، کالے قانون بنائے، جھاٹے مقدمے بنائے، لوگوں کو جھوٹے مقدمات میں مہینوں تک اندر رکھا، فون ٹیپ کرنے کے فضائل بتائے، ہر شاخ پر فوجی خود بٹھایا اور اپنے دوام کے لیے چیف کو ایکسٹینشن دینے کا قانون بنوا کر رول آف لاء کا جنازہ نکالا۔

سوئم: مشرف کے مارشل لاء میں ہونے والے چارٹر آف ڈیموکریسی کے بعد کے پاکستان کی بات ہو رہی ہے، پوری پاکستان ہسٹری کی نہیں۔

چہارم: یہی دو خان کی مخالفت کی بنیادی وجہ ہے کہ جو خود مسئلہ ہے خان نے اُسی کا سہارا لے کر قوم کو جعلی تبدیلی کے پیچھے لگایا۔

پنجم: نواز زرداری کے مقابلے میں خان نے ایک فیصد بھی ابھی سزا نہیں بھگتی، رواج پہلے سے موجود ہے۔

ششم: انسانی حقوق کی اس بدترین پامالی کا ذمہ دار بھی خان ہے کیونکہ جو شخص مسلسل یہ کہتا رہا کہ میں ان سے بات بھی نہیں کرتا صرف فوجی سربراہ سے بات کروں گا، جو شخص صبح میں کی گئی بات پر رات کو یوٹرن لے لے، جو شخص اپوزیشن کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتا ہو، اُس کے لیے انسانی حقوق کی آواز بلند کرنے کا مطلب اُسے آنے والے وقت میں مزید توانا فاشسٹ بنانا ہے۔ اس وقت انسانی حقوق کی پامالی کرنے والوں کے دماغ میں غالباً یہی سوچ کارفرما ہے کہ جب تک خان پر خود نہیں گزرتی اسے تب تک کسی کا احساس بھی نہیں ہونا، خان کی شخصیت اور ماضی کو دیکھا جائے تو راقم کو یہ سوچ درست دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر سلطان محمود

اگر سب کو چھوڑ کر خالی خان ہی کو فوکس کر کے اس کی غلطیاں چننی ہوں تو آپ کا لکھا سبھی کچھ درست ہے لیکن اسے متوازن اور غیر جانبدارانہ سوچ نہیں سمجھا جائے گا۔ نیز 2011ء کے بعد کی سبھی وارداتیں گزشتہ سے پیوستہ نہ سمجھ کر تنقید کے ہدف پر رکھ لی جائیں تو ایسے تو پھر اسٹیبلشمنٹ کی سوچ کو بھی سلام ہی کر لینا چاہئے اور ایوب کی سیاستدانوں بارے سوچ ہی کو مان کر جیسے ہم آج تک چل رہے ہیں چلتے رہیں۔

گورباچوف نے سخت گیر کمیونسٹ نظام کے اندر رہ کر ہی اپنا رستہ بنایا اور سی آئی اے کو ہر قدم ساتھ رکھا۔ اردگان، کاسترو اور جمال ناصر نے روس، مہاتیر اور ہوچی منہ نے چین، لی کوان نے امریکہ وغیرہ سے مدد حاصل کر کے کامیابیاں سمیٹیں سوائے ماؤزے تنگ کے جس نے اپنجی قوم پر براہ راست اپنا ڈنڈا چلایا اور لینن نے فوج کو ساتھ ملا کر روس میں انقلاب کی داغ بیل ڈالی ورنہ میری معلومات کے مطابق کہیں بھی اسٹیبلشمنٹ اور نظام بد کے شکار عوام کے ذریعے کوئی اکیلا رہنما انقلاب برپا نہیں کر سکا اگر نبیوں سے صرف نظر کر لیا جائے تو۔

پاکستان میں بھٹو نے فوج کو انگوٹھے کے نیچے رکھا لیکن امریکی ضرورت جاگتے ہی فوج ہی کے ہاتھوں انجام کو پہنچا، پھر کچھ عرصے بعد بینظیر اسٹیبلشمنٹ سے پنگا لے کر بیچ چوراہے ماری گئی۔ بعد ازاں نواز شریف اسٹیبلشمنٹ کو خرید کر جنرلز سے لڑنے کی ہمت کر تو گیا مگر عوامی و ملکی خزانے پر ہاتھ صاف کرنے کی وجہ سے سیاسی رہنماء کی تعریف پر پورا نہ اتر سکا اور حال ہی میں عمران اسٹیبلشمنٹ سے مل کر "گوربی اپروچ" کے تحت آگے بڑھا لیکن جلد ہی اسے بھی کچل دیا گیا۔

یاد رکھیں سیاستدان چاہے زرداری جیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن ہم جب ان کی مخالفت کرتے ہیں تو درحقیقت ہم اسٹیبلشمنٹ کے مہرے ہی سمجھے جائیں گے یا پھر احمق گردانے جائیں گے کہ جن کو شدھ بدھ نہیں کہ پارلیمنٹ کی بالادستی کے فوائد کیا ہیں۔

595 مئی ؟ -

دیس پردیس

ایک پاکستانی بچی نے یورپ میں بسنے والے اپنے ایک کزن کو قید خانے جیسی زندگی بسر کرنے سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہاں نہ کوئی اپنا، نہ سری پائے۔ بس بوریت ہی بوریت۔

جی بالکل قید خانہ ہے۔ نہ اپنی مرضی سے کہیں تھوک سکتے ہیں نہ سرعام سڑک پر پیشاب کر سکتے ہیں اور نہ ہی چھینکنے کے بعد قمیض سے ناک صاف کر سکتے ہیں۔ عجب غلامی ہے۔

بلکہ اس سے بڑی قید کیا ہو گی کہ گاڑی کا ہارن بلاوجہ نہیں بجا سکتے، گاڑی میں اونچی آواز میں میوزک نہیں سن سکتے، شادی بیاہ پر رستہ بند نہیں کر سکتے، مساجد کے لاؤڈ سپیکر کو سوائے اذان کے کھول نہیں سکتے، سڑک پر لین کی پابندی، غلط پارکنگ پر ہزاروں روپے جرمانہ، رشوت ستانی پر پابندی، ملاوٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، گھر کے اندر یا باہر کسی کو ہاتھ لگانا تو دور کی بات ڈانٹ تک نہیں سکتے، آپے سے باہر ہوئے بچے کی جی بھر کر مرمت نہیں کر سکتے، جھوٹ بولنے والے کا سوشل بائیکاٹ کر دیتے ہیں یہ یورپ والے، رات دس کے بعد گھروں میں بھی شور نہیں کر سکتے، جو جو کچھ بچوں سے کروانا چاہتے ہیں پہلے اس پر خود عمل کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں تو الحمدللہ اتنی آزادی ہے کہ خود سوڈا، کافی، سگریٹ، شیشہ یا شراب پی کر یا پان گٹکا، فاسٹ فوڈ وغیرہ کھابوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ داستان لمبی کرنے کی بجائے صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے شاید کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے کہ دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے وہ شاید یورپ امریکہ ہی کے لئے فرمایا تھا؟

595؟مئی -

بے خواب مچھندر

آمنہ پہلے آپ بھی خیالات شئیر کرتی رہیں لیکن بولی ہیں تو بڑی دیر بعد بولی ہیں آپ۔ خیر دیر آید درست آید۔

میرے کالم لکھنے کے دوران 102 بار نوٹیفکیشن کے الرٹ آئے میں سمجھا کہ شاید خاندان میں پھر کوئی اہم شخصیت اللہ کو پیاری ہو گئی ہے تبھی شاید اتنی تیزی سے افسوس کے پیغام آرہے ہیں۔ خاندان کے سارے بزرگ ذہن میں آتے گئے۔ تمام بیماروں کے لئے دعا کرتا رہا۔ جوانوں کی خیر مانگتا رہا، کچھ تو ایسے تھے کہ دل چاہتا تھا کہ اللہ کرے وہی ہوں۔ یقین کریں بے حد کوفت ہوئی۔ میں بھی ڈھیٹوں کی طرح لگا رہا اپنے کام۔ کالم مکمل کرتے ہی کچھ لمحے بھی توقف نہیں کیا لیکن یہاں کیا؟ کھودہ پہاڑ نکلا چوہا۔

آخر میں آپ نے اچھا حل بتایا ہے تو پلیز جلدی کروان کاٹھے سیاستدانوں کے لئے ایک نیا سیاسی گروہ بنا ہی دو تا کہ سنجیدہ لوگوں کی جان چھوٹی رہے۔

برائے مہربانی اس نئے گروپ میں کسی سمجھدار بندے کو رکن نہ بنانا۔ کوئی اچھا سا نام رکھ دینا اس سیاسی گروہ کا۔ کچھ نام میں تجویز کئے دیتا ہوں مدد کے لئے حاضر ہیں۔ مثلاً

1۔ دیہی انجمن خواجگان

2۔ وہ جن کی کوئی نہیں سنتا

3۔ سیاست کے کاٹھے وحشی

4۔ ہمارا بابا اوپر

5۔ تیز سیاست کی قبض کشائی

6۔ نائی کی دوکان کے دانشور

7۔ دھواں اگلتی ٹھنڈی توپیں

8۔ بے خواب مچھندر

9۔ شوقیہ فنکار

10۔ لڑاکے تیتر

اگر انگریزی نام رکھنے ہوں تو مندرجہ ذیل سے کوئی ایک چن لینا:

1. Goof Part of Khawajgan

2. Constipation Broken Down

3. Short Statured Politicians

4. Unenlightened Folk

5. Closed Minds

6. Average Public

7. Night Warriors

8. Hot Chillers

9. Sick Politics

10. Out of Fire into Pan

لگتا ہے یہ بھی کالم بن گیا ہے بہر حال سب اچھے ہیں اس لئے ہمارے طنز کا برا نہ منائیں۔

596

عمران کی گرفتاری

9 مئی 2023ء

کسی سیاسی شخصیت کے لئے ایسی عوامی پذیرائی دنیا بھر میں اردگان کے بعد عمران کے حصے میں آئی ہے اور دوسری مشابہت فوج کو گالیوں کی ہے لیکن دونوں ممالک میں نتائج مختلف ہیں۔

ایسے ہی ایک ٹرینڈ میں چند سال پہلے ترکی اور اردگان اسلئے بچ گئے کہ عوام اور رہنما دونوں امریکہ کے مخالف تھے اور فوج صرف بیرکوں تک محدود تھی۔ امریکہ کی مخالف تو یہاں بھی ہے لیکن پاکستان کے لئے فوج مخالف ٹرینڈ اندرونی اور بیرونی محاذوں پر خاصے نقصان کا باعث بن سکتا ہے کیونکہ اندرونی طور پر ساری طاقت فوج کے ہاتھ میں ہے لیکن بیرونی طور پر دشمن چاہ رہا ہے کہ پاک افواج کو گالی پڑے اور اسے زیادہ سے زیادہ ذلیل کر کے کمزور کیا جاسکے۔ ان حالات میں ہماری درخواست ہے کہ گالی صرف سیاسی مخالف کو دی جائے اور مسلح افواج کو نہ رگیدا جائے۔ ورنہ بھارت اور امریکہ پورا فائدہ اٹھا کر ہمارا حال خدانخواستہ لیبیا اور شام جیسا کر سکتے ہیں۔

اگرچہ یہ ہماری اس وقت بدقسمتی ہے کہ ہر معاملہ الٹا ہے یعنی پارلیمنٹ کی رٹ کا نام و نشان نہیں، اور فوج، عدلیہ، انتظامیہ اور سیاسی پارٹیوں کا روپ دھار چکی ہیں۔ اللہ ملک کی حفاظت کرے یہاں امریکی سے مخالفت لے کر بچنا انتہائی مشکل ہے۔ اگر ہم نے پچھلے پچھتر برس میں خود ہر ادارے پر امریکہ کا قبضہ نہ کرایا ہوتا تو پھر پوری امید تھی کہ ہمارا عوامی احتجاج ترکی والی شکل اختیار کر لیتا۔

ڈاکٹر سلطان محمود

گوشت خور

20 - 597 مئی

پینسٹھ والے اگر گوشت ضرورت سے زیادہ رگڑیں گے تو بوٹیاں لڑانا تو دور کی بات اپنی نچلی بوٹی کا بھی چھچھڑا بنالیں گے نیز اگر ان کی ٹانگوں میں سختی آگئی تو انہیں جلد اگلے جہان کی سیر بھی کرنی پڑ سکتی ہے کیونکہ لٹریچر اور تجربے نے ثابت کیا ہے کہ موت ٹانگوں کے راستے جسم کے اوپری حصے کی جانب سفر کرتی ہے۔ روزانہ جتنے کلو میٹر تسلسل سے تیز چل لیں گے اتنا ہی قبر سے اوسطاً فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔

ڈاکٹر افضل والا علاج ہر پینسٹھ والا نہیں کر سکتا ماسوائے کہ کسی ایسی لڑکی کے جو انگلی گیلی کر کے اپنی دونوں آنکھوں کی پیاس بجھانے کے لئے صبح شام سرمے کی طرح لگائے یا پھر میری طرح چین سے نینو ٹیکنالوجی والے کیپسول کھا کر ایک تیس سالہ کنواری مہیلا کو گرل فرینڈ بنالے، مثال کے طور پر، اور ساتھ ہی اپنی پنشن سے بھی اسے باقاعدگی سے حصہ دیتا رہے یا عمر بھر کی کمائی سے جو چند گھر ہم نے بنالئے ہیں ان میں سے ایک نئی دوست کو وصیت میں لکھ کر مرے ورنہ ہمارے جمع کردہ کنال اور ایکڑوں کے اندر بچوں اور بیواؤں نے قبر بھی نہیں بنانے دینی۔

598

"امریکہ کی لنگوٹی"

کالم میٹھا سچ 594 از ڈاکٹر سلطان محمود

3 مئی 2023ء

امریکہ کے صحافیوں کی جیب سے بھی ڈالر والے لفافے بر آمد ہوتے ہیں وہ الگ بات کہ اس لفافے سے مدح سرائی کرنے والے ذہنی غلاموں کی ڈالروں میں تنخواہ والا چیک بر آمد ہوتا ہے جو ان غلاموں کو اس ملازمت سے ملتا ہے جس کے وہ اہل نہیں ہوتے۔

دوم، جب مذہب بیزار کی روایک جانب بہکتی ہے تو اسے امریکی قوانین تو سامنے لکھے صاف صاف نظر آجاتے ہیں لیکن قرآن، مدینہ کی ریاست اور چار خلفائے راشدین کے بعد کے زمانے کا مطالعہ کرنے سے ان کی آنکھیں ساتھ نہیں دیتیں۔ نیز امریکہ کے مدح سرا نے کمال ہوشیاری سے غلام اور مزدور کو ہم معنی بنا کر پیش کر دیا ہے۔

سوم، میں خود ملائیت کے وضع کردہ مذہب اسلام سے بیزار ہوں لیکن اسلام کو بحیثیت دین ذرا تھوڑی دیر کے لئے پرے رکھیں اور اسلام کو بحیثیت عملی ریاست تاریخ کی اس روشنی کو دیکھ کر جواب دیں جسے ڈاکٹر زرین شاید دیکھنے کے قابل نہیں رہے کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ امریکہ میں پیدا ہوئے تھے جنہوں نے 632ء میں خلیفہ بنتے ہی اپنی تنخواہ مزدور (غلام نہیں) کے برابر مقرر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر مزدور اس میں گزارہ کر لیتا ہے تو میں بھی کر لوں گا اور اگر گزارہ نہ کر سکا تو مزدور کی اجرت بڑھا دوں گا۔

چہارم، اگر مزدور کو دنیا میں امریکہ بہادر ہی نے حقوق دیئے تھے تو 1865ء میں غلامی ختم کرنے کے قانون کو نافذ کرنے کے باوجود 1960ء تک کالے غلاموں کو آزادی دینے پر قادر کیوں نہ ہو سکا؟ صرف اس لئے نہیں کہ وہ "اسلام کی نام نہاد خاموشی" کا فائدہ اٹھا رہا تھا بلکہ اس لئے کہ اس نے روس کی توسیع پسندی کو بدنام کرنے کی پیش بندی کے طور پر مزدور کو حقوق دے کر روسی کمیونزم کے آگے بند باندھنے کی ناکام کوشش کی تھی کیونکہ وہ 1937ء میں سخت گیر سٹالن سے ڈر گیا تھا لہٰذا جلدی جلدی 1938ء میں مزدوروں کے حقوق کا بل لے آیا۔ اور پھر تاریخ گواہ ہے کہ روسی صدر خروشچیف نے اسی موضوع پر اقوام متحدہ کے اجلاس منعقدہ 1960ء میں جنرل اسمبلی کے اجلاس میں روسٹرم پر اپنا جوتا برسانا شروع کر دیا تھا۔ تب امریکہ کی بھی آنکھ مزید کھلی اور اس نے نا صرف اپنے مزدوروں کو عیاشی کی حد تک سہولتیں دینے کے بعد روسی کمیونزم کے اندر اس کے مزدوروں کی اجرت پر واویلا کرنا شروع کر دیا۔

اتنا لکھ کر صبح کے چار بجے نیند کے ہلکورے نے ہمیں بستر پر گرا دیا لیکن سرہانے رکھی کارل مارکس کی کتاب "داس کیپیٹل" سے مصنف چھلانگ لگا کر ہماری گردن پر آن سوار ہوا۔ اس نے ہمیں موضوع کی مناسبت سے اپنی موجودگی کا احساس دلا کر لوری دے کر سلا تو دیا لیکن پھر اگلے تین گھنٹے خواب میں ہم سے ڈھیروں باتیں کر ڈالیں۔ کہتا ہے کہ مزدوروں کا خون پینے والا امریکہ میٹھی چھری ہے۔

20 - 599 مئی

کتب بینی؛ناپید؟

20 - 600 مئی

برائے صبا ممتاز

لوگوں نے کتاب پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ اس ٹرینڈ کو کم کرنے میں گوگل اور چیٹ جی پی ٹی فور پلس کا بڑا ہاتھ ہے جس نے رہے سہے قارئین بھی ختم کر دیئے ہیں اور جو رہ گئے ہیں وہ بھی غائب سمجھیں۔ اب دنیا بھر میں ہارڈ کاپی کی طرف تو کوئی نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا بلکہ یہ قصہ تو ایک جانب رہا بلکہ سافٹ کتب بھی غیر ضروری مواد کے سبب اپنی کتب بینی ختم کرتی جا رہی ہیں۔ براہ راست گوگل اور مصنوعی ذہانت وہ سب کچھ ہر کسی کو چٹکیوں میں بتا دیتے ہیں جس کے لئے ماضی کے مصنفین بلکہ مستقبل سے ناآشنا حال کے مصنفین بھی اپنی قیمتی زندگی کے سالوں ضائع کر دیتے ہیں۔ ہمارا اندازہ ہے کہ پبلشر نام کی مخلوق محض اگلے دس برس ہی میں ناپید ہو جائے گی۔ ہاں ہمارے جیسے غیر ترقی یافتہ ممالک میں مصنف اور قاری شاید چند برس اور جی لیں تو جی لیں ورنہ ان دونوں کو اب دیوانہ سمجھا جانے لگ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سب کچھ غلط ہی ہو رہا ہو لیکن ہو یہی کچھ رہا ہے۔

امیزون جیسا دیو قسم کا ادارہ جو بنیادی طور پر کتابیں بیچنے والا فورم تھا اب اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے آہستہ آہستہ کتابوں سے نکل کر جوتے اور پالش تک جا پہنچا ہے۔ آپ کی بات درست ہے کہ ابھی بھی لوگ کتابیں خریدتے ہیں لیکن دنیا جب قیامت کی چال چل چکی ہے تو ہمیں اس کے بھی دس سال بعد پتا چلتا ہے کہ یہ تو ہو چکا ہوا ہے پہلے ہی۔

صرف کتابی دنیا سے مثال دوں گا کہ اب کاتب کی اہمیت ختم ہونے کے باعث ان کی نسل بھی معدوم ہو گئی ہے، شارٹ ہینڈ غائب، ٹائپ رائیٹر مفقود، پرنٹنگ پریس کتاب سے اشتہار اور لیبل کی جانب نکل گئی ہے، چھوٹے پبلشر گاؤں کی جانب چل نکلے اور بڑے آن لائن آ گئے ہیں، جمیل بسمل جیسے مصنفین تو پچاس برس قبل "ادرک کے چھکے" جیسے چوری کے ڈرامے لکھتے پکڑے گئے تھے اور شباب کیرانوی بیچارے بھارتی فلموں کی چوری کرتے کرتے اپنے سٹوڈیوز تک گنوا بیٹھے۔

اس دور جدید میں آپ جہاں سے بھی نقل کریں گے ادبی سرقے (plagierism) کا سوفٹویئر جھٹ سے کھوج لگا لے گا۔ بلکہ جن میں صبح شام شاعری کا کیڑا اکلبلا تا رہتا ہے یا ادب جھاڑنے کو من تڑپتا رہتا ہے انہیں بھی چیٹ جی پی ٹی پوری پوری غزل اور نظم لکھ دیتی ہے اور ادبی مواد تیار کر دیتی ہے۔ ہماری ایک مغرور "مصنفہ" کی کتاب ستتر فیصد چوری کی نکلی کیونکہ جب انہیں سوشل میڈیا پر غلط اردو لکھتے دیکھا تو انہوں نے نہایت شان سے اپنی جو کتاب ہمیں ایک تقریب میں پیش کی تھی وہ ہمارے بد تمیز ہاتھوں سے اسی سوفٹویئر کا شکار ہو گئی۔

تجریدی آرٹ ویسے ہی کہیں دکھائی نہیں دیتا بلکہ پہلے بھی جو شکل سمجھ نہیں آتی تھی اسے تجریدی آرٹ کہہ دیتے تھے اور جو ساز سمجھ نہیں آتا تھا اسے پکا راگ کہہ لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ یورپ میں ادب و شاعری کی چوری پکڑنے سے بہت سال پہلے سائنسی چوریاں پکڑی جاتی تھیں۔ تبھی پاکستان کے کسی تحقیقی ادارے یا جامعہ کا دنیا میں کوئی مقام ہی نہیں بن سکا۔ جب ساغر صدیقی مرا تو لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ سمجھیں اب قتیل شفائی بھی مر جائے گا۔ ہمارے انتہائی قابل احترام استاد بابا اشفاق پر جب فرانسیسی ادب چوری کا الزام لگا تو انہوں نے چپکے سے ادب لکھنا بند کر کے اصلاحی میدان میں ڈیرے ڈال دیئے۔ فیض، فراز اور امجد نے ابھی کل وفات پائی ہے لیکن اب

میدان خالی پڑا دہائی دے رہا ہے لیکن کوئی ذی شعور قدم نہیں بڑھا پا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بے مغز ادباء اور شعراء نے اپنے چھوٹے چھوٹے مافیاز ملا کر کارٹل بنا لئے ہیں اور "تو مر املا بگو من تر احاجی بگو ئم" کے اصول پر موت کا انتظار کر رہے ہیں۔

کہنے کو بہت کچھ ہے لیکن ابھی پاکستان کا دنیا سے پیچھے رہ جانے کا اتنا نوحہ ہی کافی ہے۔ کیونکہ تین دہائی قبل یورپ امریکہ سے واپسی پر جب ہم یہی کچھ کہتے تھے تو لوگ ہمیں گالیاں بکتے تھے اب بی بی سی نے ایک تحقیق میں جھوٹ کی رینکنگ میں پاکستان کو جب پہلے نمبر پر کھڑا کر دیا ہے تو اب کچھ کہنے کو بچا ہی نہیں۔

کارل مارکس اور غلامی کا خاتمہ

Slavery was not "abandoned" in America, as it was legally abolished in the 13th Amendment to the United States Constitution, which was passed by Congress on January 31, 1865. However, it is true that the labor movement in America did not fully recognize the rights of all workers until the 20th century, with the passage of the Fair Labor Standards Act in 1938, which established minimum wage and maximum hour standards for most employees.

Certainly! Here are some facts about Karl Marx:

1. Year of Birth: Karl Marx was born on May 5, 1818.

2. Year of Death: Karl Marx died on March 14, 1883.

3. Publication of Das Kapital: Karl Marx began writing Das Kapital in 1867 and it was published in three volumes between 1867 and 1883.

4. Exile from Countries: Karl Marx was exiled from various countries throughout his life due to his political views. He was

forced to leave Germany in 1843 due to his involvement in revolutionary activities and lived in Paris for several years before being forced to leave due to his criticism of the French government. In 1862, he was forced to leave Belgium and moved to London where he lived until his death in 1883.

امریکہ میں غلامی کو "چھوڑ" نہیں دیا گیا تھا، کیونکہ اسے ریاستہائے متحدہ کے آئین کی 13 ویں ترمیم میں قانونی طور پر ختم کر دیا گیا تھا، جسے 31 جنوری 1865 کو کانگریس نے منظور کیا تھا۔ 20 ویں صدی تک تمام کارکنوں کے حقوق، 1938 میں فیئر لیبر اسٹینڈرڈز ایکٹ کی منظوری کے ساتھ، جس نے زیادہ تر ملازمین کے لیے کم از کم اجرت اور زیادہ سے زیادہ گھنٹے کا معیار قائم کیا۔

بے شک! کارل مارکس کے بارے میں کچھ حقائق یہ ہیں:

1۔ پیدائش کا سال: کارل مارکس 5 مئی 1818 کو پیدا ہوئے۔

2۔ موت کا سال: کارل مارکس کا انتقال 14 مارچ 1883 کو ہوا۔

3۔ داس کیپیٹل کی اشاعت: کارل مارکس نے 1867 میں داس کیپیٹل لکھنا شروع کیا اور یہ 1867 اور 1883 کے درمیان تین جلدوں میں شائع ہوا۔

4۔ ملکوں سے جلاوطنی: کارل مارکس کو اپنے سیاسی نظریات کی وجہ سے زندگی بھر مختلف ممالک سے جلاوطن کیا گیا۔ انقلابی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے اسے 1843 میں جرمنی چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور فرانسیسی حکومت پر تنقید کی وجہ سے چھوڑنے پر مجبور ہونے سے پہلے کئی

سال پیرس میں مقیم رہے۔1862 میں، وہ بیلجیم چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور لندن چلے گئے جہاں وہ 1883 میں اپنی موت تک رہے۔

وقت کے پر

کالم میٹھا سچ 000 از ڈاکٹر سلطان محمود

22 جون 2023ء

کافی عرصے سے پنجاب یونیورسٹی میں اپنے سابقہ ساتھیوں سے ملنے کا موقع نہیں ملا تھا لہٰذا یوم ماحولیات میں شرکت کے بعد زوالوجی ڈیپارٹمنٹ جا گھسا۔ اٹامک انرجی کمیشن سے ملنے والے پی ایچ ڈی کے لئے پہلے سکالرشپ سے پنجاب یونیورسٹی میں انرول ہوتے ہی جو ایم ایس سی کے طلباء میرے ہمسفر بنے ان میں محترمہ نبیلہ روحی بھی شامل تھیں جو اب خوش قسمتی سے فیکلٹی کے انسٹیٹیوٹ بنتے ہی اب دوسری ڈائریکٹر بھی بن چکی ہیں۔ پہلے ڈائیریکٹر پروفیسر جاوید اقبال بھی میرے ساتھیوں ہی میں سے تھے جو فیکلٹی میں آخری نمبر پر ہے۔

وقت کیسے پر لگا کر اڑتا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ محترم استاد اور دوست پروفیسر عبدالمجید چیمہ صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تو محترمہ کوثر جمال چیمہ کبھی کبھار ڈیپارٹمنٹ تشریف لایا کرتیں تو ہم سے ملاقات بھی ہو جاتی۔ پھر جب ان کے اکلوتے بیٹے کی شادی کا وقت آیا تو میں غالباً ان چند خوش قسمت لوگوں میں سے تھا جن کے گھر خود پروفیسر صاحب کارڈ لے کر پہنچے۔ پھر چیمہ صاحب کوئٹہ کے کالج آف انفارمیشن ٹیکنالوجی میں بعد از ریٹائرمنٹ پروفیسر مقرر ہوئے تو ایف اے او کے پروجیکٹ میں نوکری کے باعث میری ان کی وہاں بھی ملاقاتیں رہیں۔ اور اب ان سے ملاقات تو نہیں ہوتی لیکن لاہور کالج فار وومن یونیورسٹی سے ریٹائرڈ ہماری بھابی محترمہ کوثر جمال سے ہماری بنائی ہوئی تنظیم ECAP (انوائرمنٹ کنسلٹنٹس ایسوسی ایشن پاکستان) میں کافی ملاقاتیں رہتی ہیں۔

معروف ایکالوجسٹ پروفیسر ڈاکٹر ذوالفقار علی گوکہ بعد میں دوست بنے لیکن وہ پاکستان کے انتہائی اہم شعبہ ایکالوجی کے معدودے چند ماہرین میں سے ہیں جو کئی عالمی اداروں میں خدمات سرانجام دینے کے بعد آج کل اسی انسٹیٹیوٹ سے وابستہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ میرے اساتذہ، دوستوں اور ساتھیوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

لاہور، 5 جون 2023ء

جاسوسی ناول فکشن

ہم ابن صفی اور مظہر کلیم کے جاسوسی ناول پڑھتے جوان ہوئے اور ہماری آج بھی اردو زبان سے محبت اور اظہارے کی مہارت میں ان دونوں قد آور شخصیات کا بھرپور ہاتھ ہے۔ اللہ دونوں مرحومین کے درجات میں اضافہ فرمائے۔

دونوں کو کم و بیش مکمل پڑھنے کے بعد جاسوسی ادب کے حوالے سے ایک قدرتی طور تقابل ساذہن میں آتا ہے جس پر میں اپنے احساسات یوں بیان کروں گا کہ ابن صفی نے جتنے دلکش اور دھیمے انداز میں عمران اور فریدی سیریز لکھیں میں نے اسے اس سے دگنا پڑھا یعنی ایک ایک ناول اوسطاً دو دو بار لیکن محترم مظہر کلیم کے انتہا پسندانہ انداز کے باعث ان کے کئی ناول پڑھتے پڑھتے ادھورے ہی چھوڑ دیے۔ گو کہ دونوں ہی نے ناممکنات کے کمالات دکھائے لیکن ابن صفی کے ناممکنات کی چاشنی کو ذہن پھر بھی تسلیم کر لیتا تھا لیکن مظہر کلیم کے ناممکنات کو ذہن یکسر مسترد کر دیتا تھا۔

جو کوئی فکشن، رومانوی و تاریخی ناول و افسانہ نگار ہو وہ بنیادی طور پر جھوٹ ہی کی ترویج کرتا ہے اور جھوٹ یقیناً بے عملی اور منافقت کو جنم دیتا ہے اس لئے ایسے اسلوب نگاروں پر کوئی یونیورسٹی نہ ہی تحقیق کرائے تو بہتر ہے ورنہ تعلیمی ادارے بھی جھوٹ کی پروموشن کے ذمہ دار ٹھہریں گے۔

من تشاء

میرے لیے "زندگی" صرف وہ ہے جو "لمحہ موجود" ہے۔

ڈاکٹر

لمحہء موجود کی صرف اتنی سی اہمیت ہے کہ اس میں ہم وہ فیصلے کرتے ہیں جن پر عمل کرنے سے ہمارا مستقبل آہستہ آہستہ ماضی میں بدلتا رہتا ہے۔ یہ تین سطریں لکھنے میں بھی کئی لمحات حال سے ماضی میں بدل گئے۔

ڈاکٹر سلطان محمود

ڈاکٹر

لیکن اللہ کی رحمت سے دنیا کے کئی معاشروں میں لوگ مجھے قابل ذکر حد تک جو بھی اہمیت دیتے ہیں تو اس کی وجہ میرے لئے تو میرا شاندار ماضی ہے۔ یہی لمحہ موجود میں قابل گرفت بھی ہے اور قابل فخر بھی ہے جسے کوئی مجھ سے چھین بھی نہیں سکتا۔ لیکن اگر لمحہ موجود میں کوئی چیز انتہائی ناقابل گرفت ہے تو وہ نا صرف خود لمحہ موجود ہے بلکہ میرا مستقبل بھی اس میں شامل ہے۔ ہاں البتہ اس ناقابل گرفت مستقبل ہونے کے باوجود میں پورے یقین کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ میں لمحہ موجود میں جو بھی فیصلے کروں گا وہ میرے مستقبل کو بھی میرے ماضی ہی کی ٹکسال میں ڈھال کر شاندار رکھے گا انشاءاللہ۔ ایک ایسی کامیابی جو دنیا کے محض آدھے فیصد موجود لوگوں کے حصے میں بھی شاید نہ آئی ہو۔ میں جس حیثیت میں بھی ہوں اللہ کا شکر ادا کر کے کہتا ہوں کہ لمحہ موجود میں

لوگ مجھے پرکاہ کی حیثیت نہ دیتے اور لمحہ موجود میں میں بہتر فیصلے نہ کر پاتا اگر مجھے ماضی میں قابل ستائش کامیابیوں کا تجربہ حاصل نہ ہوا ہوتا۔

ڈاکٹر سلطان محمود

"سلطانے ڈاکو والا انصاف"

کالم میٹھا سچ 000 از ڈاکٹر سلطان محمود

22 جون 2023ء

جی بالکل وڑائچ صاحب اگر مندرجہ ذیل اکابرین اپنے قومی گناہوں کی سزا کے طور پر اپنی ذاتی جیب سے وہیں جرمانے ادا کر دیں جہاں جہاں ملک کو نقصان پہنچا تو واقعی ہم آئی ایم ایف کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ مثلاً:

1۔ نواز شریف نے بیشمار ایسے قرضے لئے کہ جن پر اجیکٹس کی ایک اینٹ بھی ملک میں نظر نہیں آتی البتہ لندن، امریکہ اور دبئی میں نظر آتی ہے۔ وہ تمام ایسی رقومات آئی ایم ایف کو واپس کر دیں تو ہمارے قرضے ایک چوتھائی رہ جائیں گے۔

2 ۔ شہباز شریف خاندان نے شپ بریک انڈسٹری کو اپنے فولاد کے کارخانے چلانے کی خاطر جتنا نقصان پہنچایا وہ سزا کے طور پر بیرون ملک سے اپنی دولت واپس لا کر شپ بریکنگ انڈسٹری کو ڈھائی سو بحری جہاز توڑنے کی سطح پر واپس لائیں۔

3۔ اسحاق ڈار دبئی اور لندن میں موجود اپنے پلازے فروخت کر کے آئی ایم ایف کے بقایا قرضے چکائیں۔

4۔ زرداری آئی پی پیز کے ساتھ ملک دشمن معاہدہ کرنے نیز سٹیل مل کو نقصان پہنچانے کے جرم میں ان دونوں اداروں کو جرمانے سمیت رقوم ادا کر کے آئی پی پیز کو پاکستان سے رخصت کر دیں اور سٹیل مل کو دوبارہ منافع بخش بنا دیں۔

5۔ بلور، شیخ رشید اور سعد رفیق مل کر ریلوے کا مجموعی نقصان نا صرف پورا کریں بلکہ اتنی ہی مزید رقم سے ریلوے میں سرمایہ کاری کریں تا کہ اس ریلوے کو کم از کم بھارتی ریلوے کے برابر لایا جا سکے۔

6۔ خاقان عباسی سمیت پی آئی اے کے تمام سابقہ چیئرمین پی آئی اے کو اپنے آخری منافع بخش سال کی سطح پر واپس لانے کے لئے اپنی ذاتی ائیر لائنز اور دیگر ذاتی کاروبار فروخت کر دیں اور قریباً 15 سو ارب روپیہ الگ سے ادا کریں تا کہ اس ادارے کو امارات ائیر لائینز جیسا بنایا جا سکے۔

7۔ عمران خان زلفی بخاری، گوگی اور دیگر خفیہ چہروں سے لیے دو ہزار ارب روپیہ واپس نکلوا کر ملکی خزانے میں ڈالیں تو کہ ملکی معیشت کی بحالی کو ذرا حوصلہ مل جائے۔

"جہنم کو بھر دینگے شاعر ہمارے"

کالم میٹھا سچ 654 از ڈاکٹر سلطان محمود

دبئی، 3 ستمبر 2023ء

تمام شاعر و شاعرات صرف اپنی سوچ اور شاعری کو دیکھ کر ڈاکٹر ثانیہ شاہ کی مندرجہ ذیل تحریر پر اظہار خیال کریں۔ بہتر ہو گا اگر کسی دوسرے شاعر کا حوالہ نہ دیں۔ میرے خیال سے انہوں نے درست لکھا ہے۔

بلکہ کسی شاعر نے خود ہی لکھا ہے کہ "جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے"

ڈاکٹر سلطان محمود

شاعر

از ڈاکٹر ثانیہ شاہ

یہ بیشتر شاعر لوگ شادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی شاید ہی کسی ایک خاتون یا ایک مرد پر ٹکتے ہوں شاید ہی اپنی بیگم یا شوہر کے مخلص پارٹنر بن سکتے ہوں بہت تجزیے کرنے کے بعد پتا چلا یہ شاعر دل پھینک لوگ اپنی بیگم یا شوہر کے ہوں نہ ہوں دوسروں کی بیگمات، بہنوں اور شوہروں کو اپنی خیالی دنیا میں شریک حیات بنا کر ہنی مون مناتے رہنا انکا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ محبت نہیں بلکہ محبتوں کا شوق پالتے ہیں ہر خوبصورت چہرے پر واری جاتے ہیں اسی محبت کی تکلیف میں درد سہتے ہیں بدلتی محبتوں کے درد کا دورانیہ کبھی کچھ ماہ تو کبھی کچھ سالوں تک کیونکہ نہ محبت کو پا لینے کا لالچ

ہو تا ہے کیونکہ ڈرتے ہیں مار کھائیں گے اگلی بیگم رکھ نہیں پائیں گے نہ چھوڑنے کی ہمت رکھتے ہیں انہی فریبی محبتوں سے پیدا ہوئے درد میں شاعری فرماتے ہیں اور بچارے شاعر کہلاتے ہیں شاعر بھٹکنے اور بھٹکانے والی قوم ہے۔ یعنی بیشتر شاعری سوچ کی بد اخلاقی اور بے حیائی بے غیرتی کی وجہ سے تخلیق پاتی ہے جس کے لوازمات میں کافی تعداد میں غیروں کی محبت کا درد بھرا ہو اور درد کو پیدا کرنے کیلئے غیر عورتوں اور غیر مردوں تک اپروچ بھی ضرور ہونی چاہیئے۔

بیکار عبادت

کالم میٹھا سچ 657 از ڈاکٹر سلطان محمود

دبئی، 7 ستمبر 2023ء

تخلیق کائنات کے دلچسپ جرم پر۔۔۔

ہنستا تو ہو گا اب بھی یزداں کبھی کبھی۔۔۔!!

کہتے ہیں استاد شاعر وہ ہوتا ہے جو نہایت مختصر الفاظ میں حقیقت کا نقشہ کھینچ دے۔ا

ایرانی تیل

کالم میٹھا سچ 661 از ڈاکٹر سلطان محمود

دبئی، 16 ستمبر 2023ء

سر گودھا سے لگ بھگ 2700 کلو میٹر دور بلوچستان سے ملحقہ ایران کا بارڈر ہے جہاں سے روزانہ لاکھوں لیٹر پیٹرول بذریعہ سمگلنگ غیر قانونی طور پہ ملک کے مختلف حصوں میں سپلائی کیا جاتا ہے ۔جب ایشیا کی سب سے بڑی پتھر بجری کی مارکیٹ سر گودھا میں پل 111 کے ہزاروں ٹرکس چلتے ہیں تو انہیں پیٹرول چاہیئے ہوتا ہے اور 2700 کلو میٹر دور سے لاکھوں لیٹر پیٹرول روزانہ کی بنیاد پہ یہاں بآسانی پہنچ جاتا ہے۔

آپ میں سے سب نے بلوچستان کی سنگلاخ پہاڑوں پہ وہ نیلے رنگ کی گاڑیوں کی درجنوں ویڈیوز دیکھی ہوں گی جو اونچے نیچے ٹیلوں اور دشوار گزار راستوں سے پیٹرول سمگلنگ کرتی ہیں۔

بلوچستان میں سیکورٹی ایجنسیز کی اجازت کے بنا کچھ بھی ممکن نہیں اور لطف کی بات ہے کہ درجنوں چیک تحریر کے ہوتے یہاں پیٹرول با آسانی پہنچ جاتا ہے اور یہ سمگلنگ عشروں سے جاری ہے اور یہ بات دنیا جانتی ہے لیکن سب کی آنکھیں بند ہیں کیونکہ ہر ایک کو اس کا حصہ با آسانی مل جاتا ہے سمگلنگ کا سب سے بڑا نقصان ملک کو ٹیکس کے نہ ملنے کا ہوتا ہے لیکن پاکستان میں ٹیکس کی بجائے رشوت کے ذریعے قومی خزانے کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔

اب آرمی چیف نے سمگلنگ کے خلاف علم بلند کیا ہے تو جناب من یہ سب تو آپ کی ناک کے نیچے آپ کی ایجنسیز کے ذریعے ہی ہو رہا ہے اسے ہی بطور ٹیسٹ کیس لے لیتے ہیں کہ اگر واقعی آپ

سمگلنگ روکنے میں سنجیدہ ہیں تو پھر پاکستان میں کہیں ایرانی پیٹرول نہیں ملنا چاہیئے ورنہ ہم اسے پھر سے اللہ کا دیا سمجھ کے قبول کر لیں گے۔

جامی

آج کی عورت

کالم میٹھا سچ 662 از ڈاکٹر سلطان محمود

دبئی، 16 ستمبر 2023ء

ایمان لکھتی ہیں کہ

عورت کو طلاق کا حق نہیں کیونکہ وہ جذباتی ہے۔ عورت منصف یا کسی ملک کی حکمران نہیں بن سکتی کیونکہ اس کے کچھ بائیولوجیکل مسائل ہیں جو اس کی نفسیات پہ اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ملکی فیصلے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔

عورت کو وراثت کا حق نصف دیا گیا ہے کیونکہ وہ شادی کے بعد بھی تو شوہر سے لے لیتی ہے۔ غیر شادی شدہ ہو تو بھی آدھا ہی رہے گا کیونکہ اس اکیلی کی آخر ضرورت ہی کتنی ہے۔

عورت کی گواہی آدھی ہے کیونکہ جذباتی ہے ڈگمگا سکتی ہے۔

لو جی یہ ساری باتیں تو ٹھیک ہیں برحق ہیں۔ یہ شیطان نے کس خوشی میں عورت کو ڈیگریڈ کرنے کی کوشش کی ہے وہ چاہتا تو آدم کو بہکا لیتا مگر نہیں جی کیونکہ عورت لالچی ہے فتنہ ہے بہک سکتی ہے۔

شیطان صاحب کا بھی بھلا ہو۔

اور دونیا شاہ لکھتی ہیں کہ

مذہبی حلقوں نے سب سے پہلے خبر بریک کی تھی کہ پاکستان سے کچھ خواتین نے مِس یونیورس کے مقابلے میں حصہ لیا ہے۔ اُن حلقوں کے لیے ہلکی ہلکی بُری خبر یہ ہے کہ کراچی کی ایریکا رابن واقعی 'مِس یونیورس پاکستان' گئی ہیں۔ کراچی نے خوبصورتی میں عالمی لوہا منوالیا ہے۔ اس خبر کا مطلب یہ ہے کہ مِس یونیورس ادارہ نے پاکستان سے سیلیکشن کرلی ہے جو کہ الگ سے ٹائٹل ہوتا ہے۔ عالمی مقابلہ نومبر میں ہوگا جس کے رزلٹ ہمیں اُسی ذریعہ سے پتا چل جائیں گے جہاں سے یہ خبر شروع ہوئی تھی، انشاءاللہ۔

مس یونیورس کی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ کسی ملک سے پہلی بار امیدوار شامل ہوئیں اور وہی ملک فائنل میں بھی پہنچ گیا۔ کیا ہوا جو پاکستان سٹے باز کھیل کرکٹ میں ہار گیا، مس یونیورس پاکستان کا مقابلہ تو جیت سکتا ہے ناں۔

زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، پاکستان میں ہزار دوسرے مسائل ہیں جو نا صرف غیر شرعی ہیں بلکہ اُن کی وجہ سے لوگ عذاب میں ہیں بلکہ خودکشیاں بھی کررہے ہیں۔ کیا ذخیرہ اندوزی، کرپشن، مہنگائی اور آئین کی پامالیاں تمہارے نزدیک جائز ہیں؟ بلکہ مجرموں کا ساتھ دیا۔ ایسے تمام مسائل پر تمہارے ہونٹ کیوں بند رہے؟

چھ ضیائی علتیں

ضیاء الحق کی چھ باقیات میں ایک یہ مہاجرین بھی تھے۔ پہلی پانچ سے بھی آج تک جان نہیں چھوٹی۔ مثلاً نون لیگ، ایم کیو ایم، کلاشنکوف، ہیروئین اور مدرسے۔

"ہم تیس فیصد"

کالم میٹھا سچ 685 از ڈاکٹر سلطان محمود

دبئی، 18 اکتوبر 2023ء

پاکستان میں شرح خواندگی 30 فیصد، سڑکیں 30 فیصد، فصلیں 30 فیصد اور خوشحالی بھی 30 فیصد ہے لہٰذا انسانیت بھی 30 فیصد ہے۔

دودھاری تلوار پروفیسر سیف اللہ خالد

2017-08-31

ہم نے آج تک جتنے بھی فون رات بارہ بجے یا اس کے بعد سُنے ہیں ان میں ایک بھی خیریت کا نہیں تھا۔ اور اکثر کے نتیجے میں تو صبح آٹھ بجے جنازے میں شرکت کرنا پڑتی تھی۔ اللہ بھلا کرے موبائل فون کا کہ سکرین پر نام آنے کے سبب فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ محترم ٹیلی فون کو سُنا جائے یا ملازموں والا بہانہ دھر دیا جائے کہ سائیلنٹ پر تھا پتہ نہیں چل سکا۔ ترسوں آدھی رات کے وقت پروفیسر سیف اللہ صاحب کا فون آیا تو دل دھک سے رہ گیا کیونکہ ان کے گھر والوں کے سرد رویئے سے اندازا ہو چکا تھا کہ وہ ہمیں ان کا دوست سمجھتے ہیں۔ لہٰذا کوئی خبر دینا چاہ رہے ہوں گے۔ ہم نے بھاری دل سے فون آن کرتے کیا مگر خوشی سے اچھل پڑے کہ عزت مآب بقلم خود بول رہے ہیں۔ لہٰذا نہ نہ کرتے بھی کوئی ادھ پون گھنٹہ سخنوری کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ ہماری اردو دانی پر تلوار بھی چلتی رہی۔ وجہ یہ تھی کہ دورِ حاضر کے اس تابناک سپوت پروفیسر سیف اللہ خالد صاحب نے ہمارے حال ہی چھپے مضمون کی پسندیدگی فرماتے فرماتے بین السطور بعض فقروں کی سرجری بھی فرما دی اسم با سمیٰ ہونے کے سبب ہم نے ان کو پروفیسر تلوار کا لقب دے مارا ہے یعنی کہ اردو کی بے نیام تیغ۔

ذرا تصور کی آنکھ سے دیکھیں کہ ہم عہدِ یوسفی میں جینے کے باوجود طنز و مزاح کے معاملے میں قطرہ قطرہ قلزم بننے کی بجائے اکثر حرف حرف ہلکان صرف اس لئے ہوتے رہتے ہیں کہ نہ تو اب زمانۂ طالب علمی کے اردو کے اساتذہ میسر ہیں یعنی سلیم صاحب، معراج گوہر صاحب یا ریاض احمد ریاض صاحب، جو ہماری اردو زبان کی تصحیح کے لئے موجود ہوں اور اگر یہ اساتذہ کہیں حیات بھی ہوں گے

تو غالباً اپنی مصروفیات کے باعث ہم سے کنی ضرور کترائیں گے کہ یار دفع کرو ڈاکٹر سلطان محمود کو۔ کون اس کی اردو درست کرتا پھرے۔ ایسا احمق ہے کہ اچھا بھلا سائنس کی طرف چلا گیا تھا کہ ہم سمجھے چلو اردو کی جان چھوٹی۔ مگر پلٹ پلٹ کر اردو لکھ کر ہمارا معدہ خراب کرتا رہتا ہے۔ لیکن یقین کریں ہمیں اس وقت انتہائی خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ جب ہمیں سیف اللہ خالد صاحب کے فون سے پتہ چلتا ہے کہ نا صرف ہمارا کوئی تازہ مضمون ان کی خیرہ کن شہابی آنکھوں کا طواف کرتا رہا بلکہ ہمارا مضمون قرطاس کی زینت بنے دیگر مضامین کو آنکھ مار کر اس زعم میں مبتلا ہے کہ دیکھو پروفیسر سیف اللہ ماہنامہ "قومی صحت" کے شمارہ کو کھول کر صرف ایک مضمون پڑھ کر رسالہ بند کر دیتے ہیں۔ لگتا ہے کہ جیسے مجلّہ قومی صحت میں ڈاکٹر سلطان محمود کے سوا باقی سب مضامین بھرتی کے مصنفین کے ہوں۔ پروفیسر صاحب کا فون آتے ہی ہمیں احساس ہوتا ہے کہ خالد بن ولید کی تلوار نے حرف بحرف پورا مضمون نا صرف چیر پھاڑ رکھا ہے بلکہ استعمالِ اردو کی اغلاط کی نہایت خوش دلی سے تصحیح بھی فرما رکھی ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ ہم نے ان کی رہنمائی میں "پس" کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ نیز پٹھانوں کی طرز پر مذکر مؤنث کو بھی تہذیب کے دائرے میں لے آئے ہیں۔" سے اور کو" کے استعمال کو بھی سیکھو کے درجے پر لے آئے ہیں۔

مشہور قصہ ہے کہ سردار صاحب جب بچے کو تالاب میں سے زندہ باہر نکال لائے تو مجمع تالیوں سے گونج اٹھا اور باری باری ان کی تعریف کرنے لگا تو سردار صاحب جھپٹ کر پلٹے اور غُصے سے چلائے کہ پہلے یہ بتاؤ مجھے تالاب میں دھکا کس نے دیا تھا؟۔ اسی طرح جب پروفیسر سیف صاحب میرے کسی طنزیہ یا طبی مضمون کی تعریف فرما رہے ہوتے ہیں تو ہم دست بستہ عرض کرتے ہیں کہ سر کالم نویسی کی جھیل سیف الملوک میں مجھے دھکا آپ ہی نے دیا تھا۔

اب اسی مدح و تعریف کے سزاوار بھی آپ خود ہی ہیں۔ دراصل ہوا یوں تھا کہ میں لکھاری بننے کے چاہ میں کسی زمانے میں ایک ماہنامہ "ڈائیٹ کیئر" نکال بیٹھا۔ یونیک اکیڈمی میں کسی روز پرنسپل صاحب کی میز پر کوئی کاپی رکھی رہ گئی۔ اگلے ہی روز ایک رعب دار بھاری آواز والا انتہائی شُستہ اردو لہجہ لئے ہوئے کسی اہل زبان کا فون موصول ہوا کہ صاحب آج اکیڈیمی سے فراغت کے بعد ملتے جایئے گا۔ اگر ہم جان کی امان پائیں اور اگر پروفیسر صاحب ہمارا خیال پڑھ کر اپنی تلوار کو بے نیام کر کے ہماری گردن پر گرانے کی بجائے کسی سیاستدان کی گردن پر گرا دیں تو ہم حوصلہ کرتے ہوئے بیان کرینگے کہ پرنسپل صاحب کے کمرے میں گھستے ہی مفلر میں ملفوف ایک موٹی سی عینک کے عقب میں چمکتی دو آنکھوں نے پہلے تو ہمیں گھور کے دیکھا پھر اُٹھ کر گلے لگایا اور ہم جیسے منحرف طبی ادیب کو یوں محسوس ہوا کہ پروفیسر سیف اللہ خالد صاحب کی زبان سے انتہائی روانی اور اہل زبان والی شستگی سے بہتی اردو کی گنگا جو اُبل رہی ہے تو غالب گمان ہے کہ موصوف ہمارے بارے میں کسی انتہائی غلط فہمی کا شکار ہو کر فرمارہے ہیں کہ ڈاکٹر سلطان محمود کا اسلوب تحریر کسی بڑے مزاح یا طنز نگار سے ملتا جلتا ہے۔ ہم نے دو چار بار ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ پروفیسر صاحب آپ کو شاید خوش فہمی ہو گئی ہے کہ ہم کوئی ادیب اور وہ بھی صاحب طرز ہیں۔ اس پر یکدم ہم نے تحکمانہ آواز سے ایک محبت بھری ڈانٹ سی سُنی جس میں موصوف فرمارہے تھے کہ ہم آپ کی صرف اتنی بات مان لیں گے کہ آپ کا باذوق حلیہ کسی اعلیٰ ادیب سے نہیں ملتا اور پھر ہاتھ میں ہمارا تازہ شمارہ لہراتے ہوئے فرمانے لگے کہ اگر اس اداریئے کو آپ ہی نے لکھا ہے تو ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ آپ باقاعدہ کالم نگاری کی طرف آیئے۔ اور پھر ایک حاشیئے میں بند ہمارے لکھے ہوئے اداریئے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس چھوٹے سے ڈبے سے ایک بڑے لکھاری کو باہر نکلنا ہو گا۔ ساتھ ہی بے نیازانہ انداز میں گھڑی پر یوں نگاہ غلط ڈالی جیسی ایک ناکام خاوند بیوی پر ڈالتا

ہے اور اٹھ کر گاڑی میں بیٹھ کر شوں شاں ہو گئے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ پروفیسر صاحب کا دیا گیا آدھا گھنٹہ ہمارا طرزِ زندگی ہی بدل گیا۔ اس پر مستزاد جب پرنسپل بابر ریحان زیدی صاحب کا اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں پروفیسر صاحب کی عدم موجودگی میں رطب اللسان ہونا اور فرمانا کہ پروفیسر صاحب اپنے دور میں بہت دبنگ جیالے رہے ہیں اور 1977 میں عشق میں وہ منزل بھی پار کر گئے تھے جو مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کو کانے ضیا الحق کے اقتدار سنبھالنے سے قبل تک بھی نصیب نہ ہوئی تھی یعنی چھ ماہ کی جیل۔ پھر ان کے اسلامیہ کالج لاہور کے مجلّہ فاران کی تین چار دہائیوں پر مشتمل دھماچوکڑی اور ریٹائرڈ پروفیسری کا قاہرانہ انداز بیاں۔ تب تک تو ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ اب باقاعدہ کالم لکھا کریں گے۔

پروفیسر سیف اللہ خالد صاحب کی بے نیاز طبیعت کے ایک رنگ سے ہمیں بڑا اختلاف رہا۔ جونہی بات ناگوار گزرتی ہے تو اہل زبان کی طرف فرشی سلام کی بجائے اپنے مخصوص لہجے کی کھنک اور الفاظ کی رعنائی کو تو ساتھ لے لیتے ہیں مگر آنکھوں میں ناشناسائی سی ابھر آتی ہے اور بہانگ دہل اپنے اختلاف رائے کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہم پروفیسر صاحب کی دوستی کے مدنظر ذرا زیادہ ڈھیل لے گئے اور اس زعم میں اپنے شائع شدہ کالمز کی کتاب کی ڈمی بنا کر حضرت صاحب کو اس التجا کے ساتھ پیش کی کہ حضور پریس میں جانے سے قبل ذرا نظر ثانی فرما دیں تو ہم مشکور رہیں گے۔ پروفیسر سیف اللہ خالد صاحب فوراً دودھاری تلوار بن گئے اور نہایت دیدہ دلیری سے منہ دوسری طرف پھیر لیا بلکہ صرف اس پر ہی اکتفا نہیں کیا ایک نہایت روکھے لہجے میں فرمانے لگے جب چھپ جائے گی تو پڑھیں گے ہم بھونچکے رہ گئے۔

اور جان بچا کر پتلی گلی سے نکل بھاگے کہ مبادا پروفیسر صاحب کے منہ سے یہ نہ نکل جائے کہ یہ کتاب اشاعت کے قابل نہیں ہے۔ خیر وہ تو بھلا ہو بک ہوم والوں کا کہ ایک برس بعد انہوں نے اسی ڈمی کو نا قابل اشاعت کہہ کر ہمیں واپس کر دیا۔ اور کہا کہ یہ بولڈ تحریر ہے جو غلام قوم ہضم نہ کر پائے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم نے جارحانہ انداز پر سمجھوتہ کبھی نہیں کیا اور دو اخباروں کے لئے ہم نے کالم صرف اس لئے لکھنے بند کر دیئے کیونکہ ایک کے خود ساختہ دیندار ایڈیٹر نے ہمارے کالم پر سعادت حسن منٹو کی نقل کی تہمت مل دی اور دوسرے نے ہمارے ہی ایک کالم میں اپنے پسندیدہ سیاسی لیڈر کا جب اخلاقی جنازہ نکلتے دیکھا تو اپنے اختیارات کا غیر اخلاقی استعمال کرتے ہوئے ہمارے ہفتہ وار کالم کا ناغہ کر دیا۔ معلوم نہیں ہمارے اندر اس توہین پر پروفیسر سیف اللہ خالد والی روح کہاں سے اتر آئی اور ہم کئی کام چھوڑ کر ادبی لحاظ سے اس منحنی سے ایڈیٹر کو صرف یہ کہنے اس کی دوکان پر تشریف لے گئے کہ بھائی اگر آپ کو اپنے لیڈر کی گائے کا گوبر گاجر کا حلوہ لگتا ہے تو عشق میں کہیں کھا مت لیجئے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم دوسری بار اپنے کالموں کی اشاعت کی چھٹیاں منا رہے ہیں۔ حالانکہ کئی گھٹیا اخبارات مارکیٹ میں چل رہے ہیں۔

محترم پروفیسر سیف اللہ خالد صاحب اگر شہاب کو بے نقاب اور شباب کو با نقاب کر سکتے ہیں تو یہ صلاحیت بھی رکھتے ہیں کہ اردو زبان کو ادب و آداب سے نکال کر تنقید کے نشتر سے چیرے دے سکیں۔ ایک دنیا ان کی معترف ہے اس لئے ہمارے جیسا ناقدرا اگر ان کی مدح سرائی نہ بھی کرے تو موصوف پھر بھی مفلر لپیٹنے سے باز نہ آئیں گے۔ اور جس قوم کو شیشے میں سجے جوتوں کی ضرورت ہے اس کے لئے پھر بھی پھٹی پرانی نایاب کتابیں ڈھونڈتے ہی پا جائیں گی۔ ایک روز تو کمال ہو گیا جب پروفیسر کے گھر کی لائبریری میں ہمارے تایا زاد بھائی پروفیسر ڈاکٹر حسن اختر مرحوم کی ایک کتاب برامد ہو گئی۔ یہ شاید پہلا موقع تھا یا مہمان نوازی کا تقاضہ تھا کہ انہوں نے اپنی تلوار نیام سے

باہر نہیں نکالی۔ اور یوں کھوکھلے سے انداز میں بھائی جان کی تعریف فرمائی کہ شاید دل میں سوچ رہے تھے کہ دونوں واقعی بور قسم کے بھائی ہیں۔ نہ ڈاکٹر حسن اختر کی زمانے نے مانی۔ اور نہ ڈاکٹر سلطان محمود نے زمانے کی مانی۔ نتیجتاً دونوں نا صرف زندگی میں بھی گمنام رہے بلکہ لگتا ہے بعد میں بھی ان کو کوئی نہ جانا چاہے گا۔ بہر حال ہمارا قول زرین ہے کہ کسی لکھاری کو گھر والے صرف اس صورت میں برداشت کر سکتے ہیں کہ یا تو ان کی بیگم بھی لکھاری ہو یا پھر لکھاری خاوند کے پاس بے شمار دولت ہو۔ وگرنہ ساغر صدیقی اور عبیر ابوذری کی طرح بڑھاپا کوڑے کے ڈھیر یا گندے نالے کے کنارے گزرے گا۔ یہ چند صفحات میں پروفیسر صاحب کی نذر تو کر رہا ہوں مگر ڈر ہے وہ قبول نہ کریں گے۔ کیونکہ بقول ہماری بیگم کے آپ دودھ تو دیتے ہیں لیکن آخر میں مینگنیاں بھی ڈال دیتے ہیں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف۔۔۔

گھنٹہ گھر لائلپور کی سیریں" مورخہ 25 اگست 2020 بروز منگل کالم

مسلمانوں کیلئے اکیسویں صدی کیسی رہے گی

جمعرات 23 جولائی 20

ذاتیات، غذائیات، حیوانیات، ماحولیات، سیاسیات، مزاحیات اور ادبیات پر مبنی ایک بے مثال فکری مسافت

فکرِ سلطان

ڈاکٹر سلطان محمود

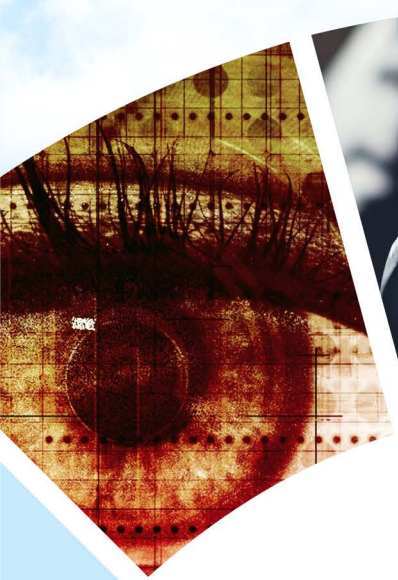

8

سیریز ہشتم: طنز و مزاح

فکرِسلطان

ECOCARE Consultancy Services (Pvt) Ltd.

ECAP

SOCIETY OF ANIMAL SCIENCES

PAFP — PAKISTAN ACADEMY OF FAMILY PHYSICIANS

ڈاکٹر سلطان محمود

مفکر، محقق اور نقاد

"فکرِ سلطان" کی تمام سیریز آفیشل ویب پر موجود ہیں

ڈاکٹر سلطان محمود نے سائنسی انداز میں تحریکی کارکن بن کر غذائی تحفظ کی عالمی خود مختار تحریک کو مقامی رہنما کے طور پر پاکستان میں ایک غیر معمولی موڑ دیا ہے جس کے نتیجے میں ان کے افکار اور عملی جدوجہد نے 'فکر سلطان' جیسی ایک طاقتور دستاویزی سیریز جنم دی ہے۔ اس میں وہ اپنی آدھی صدی کی شبانہ روز کوشش کو شاندار کہانی کے طور پر بیان کرتے ہوئے اہم معلومات سے بھری وہ تاریخ بھی بیان کر رہے ہیں جو ملک عزیز کے غیر مستحکم حالات کے باوجود مقامی اور نچلی سطح کے مسائل کو قومی اور عالمی سطح پر کچھ اس انداز سے اٹھا لے جاتے ہیں کہ جہاں وہ حیاتیاتی تنوع یا بایوڈائیورسٹی کی ہیئت تبدیل کئے بغیر کارپوریٹ تسلط کے ساتھ جنگ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ڈویلپمنٹ مافیا کے خلاف کس طرح نچلی سطح کی لڑائی کو اٹھا کر قومی اور عالمی سطح پر لے جایا جاتا ہے۔ ان کی یہ سوچ بھی قابل داد ہے کہ دنیا بھر میں مقامی سطح کی کمیونٹی ہمیشہ مقدس اور خود مختار ہونی چاہئے تاکہ وہ اپنے علم اور حقوق کو حاصل کر کے مستقبل کی دنیا کی حقیقی کہانی کا نقشہ ترتیب دے سکے۔

ISBN
9 789697 431625

ذاتیات، غذائیات، حیوانیات، ماحولیات، سیاسیات، مزاحیات اور ادبیات پر مبنی ایک بے مثال فکری مسافت

ڈاکٹر سلطان محمود، مینیجنگ ڈائریکٹر، ایکوکیئر کنسلٹنسی سروسز، لاہور۔ بانی انوائرنمنٹ کنسلٹنٹس ایسوسی ایشن پاکستان؛ سوسائٹی آف اینیمل سائنسز اور ایگزیکٹو پاکستان اکیڈیمی آف فیملی فزیشنز

Mobile | +92 321 4302528 | Ecocare | www.ecocare.pk | ECAP | www.ecap.pk | PAFP | www.pafp.com.pk